MAIS412CCT

اسلام جدید عہد میں

(Islam in Modern Age)

ایم۔اے۔(اسلامک اسٹڈیز)

(چوتھا سمسٹر)

نظامت فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

حیدرآباد-32، تلنگانہ-بھارت

© Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad

Course: Islam in Modern Age

ISBN: 978-93-95203-88-3

First Edition: November, 2024

Publisher	:	Registrar, Maulana Azad National Urdu University
Publication	:	2024
Copies	:	800
Price	:	228/-(The price of the book is included in admission fees of distance mode students)
Copy Editing	:	Dr. Mohammad Haziq, DDE, MANUU, Hyderabad
Cover Designing	:	Dr. Mohd Akmal Khan, DDE, MANUU, Hyderabad
Printer	:	Print Time & Business Enterprises, Hyderabad

Masters in Islamic Studies

Islam in Modern Age

4th Semester

On behalf of the Registrar, Published by:

Directorate of Distance Education

Maulana Azad National Urdu University

Gachibowli, Hyderabad-500032 (TS), India

*Director:*dir.dde@manuu.edu.in*Publication:*ddepublication@manuu.edu.in

Phone number: 040-23008314 Website: manuu.edu.in

© *All right reserved. No part of this publication may be reproduced or transmitted in any form or by any means, electronically or mechanically, including photocopying, recording or any information storage or retrieval system, without prior permission in writing form the publisher (registrar@manuu.edu.in)*

Editors

Prof. Syed Alim Ashraf
Head Dept. of Arabic, MANUU, Hyderabad

ایڈیٹرس

پروفیسر سید علیم اشرف
صدر شعبہ عربی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

Language Editors

Dr. Mohammad Haziq
Assistant Professor (Contractual)/ Guest Faculty, Islamic Studies, DDE, MANUU

Dr. Mohd. Akmal Khan
Assistant Professor (Contractual)/ Guest Faculty, Urdu, DDE, MANUU

لینگوتج ایڈیٹرس

ڈاکٹر محمد حاذق
اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹریکچول) / گیسٹ فیکلٹی، اسلامک اسٹڈیز، ڈی ڈی ای، مانو

ڈاکٹر محمد اکمل خان
اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹریکچول) / گیسٹ فیکلٹی، اردو، نظامت فاصلاتی تعلیم، مانو

Editorial Board	مجلس ادارت
Prof. Abdul Ali *Former Head, Dept. of Islamic Studies, AMU, Aligarh*	پروفیسر عبد العلی سابق صدر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
Prof. S. M. Azizuddin Husain *Former Head, Dept. of History & Culture JMI, New Delhi*	پروفیسر ایس۔ ایم۔ عزیزالدین حسین سابق صدر، شعبہ تاریخ و ثقافت، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
Prof. Mohammad Ishaque *Prof. of Islamic Studies, JMI, New Delhi*	پروفیسر محمد اسحاق پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
Prof. Mohd. Fahim Akhter *Dept. of Islamic Studies, MANUU*	پروفیسر محمد فہیم اختر شعبہ اسلامک اسٹڈیز، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد
Prof. Ghazanfar Ali Khan *Prof., of Islamic Studies, Kashmir Campus, MANUU*	پروفیسر غضنفر علی خان پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، کشمیر کیمپس، مانو
Dr. Abdul Majeed Qadeer Khwaja *Asst. Prof., Islamic Studies, DDE, MANUU*	ڈاکٹر عبدالمجید قدیر خواجہ اسسٹنٹ پروفیسر، اسلامک اسٹڈیز، نظامت فاصلاتی تعلیم، مانو
Dr. Mohammad Haziq *Assistant Professor (Contractual)/ Guest Faculty, Islamic Studies, DDE, MANUU*	ڈاکٹر محمد حاذق اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹریکچول) / گیسٹ فیکلٹی، اسلامک اسٹڈیز، نظامت فاصلاتی تعلیم، مانو
Dr. Syyeda Amina *Assistant Professor (Contractual)/ Guest Faculty, Islamic Studies, DDE, MANUU*	ڈاکٹر سیدہ آمنہ اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹریکچول) / گیسٹ فیکلٹی، اسلامک اسٹڈیز، نظامت فاصلاتی تعلیم، مانو

کورس کو آرڈی نیٹر

پروفیسر سید علیم اشرف
صدر شعبہ عربی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

مصنفین	اکائی نمبر
پروفیسر سید احسن، (ریٹائرڈ) شعبہ اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ	1،2
ڈاکٹر غطریف شہباز ندوی،	3،4
ڈاکٹر عاطف عمران، گسیٹ فیکلٹی، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد	5،6،13،14،15،16
محترمہ ذیشان سارہ، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد	7،8
ڈاکٹر محمد ارشد، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی	9،10
ڈاکٹر سیدہ آمنہ، اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹریکچول) / گیسٹ فیکلٹی، اسلامک اسٹڈیز، نظامت فاصلاتی تعلیم، مانو	11،12

نوٹ: زیر نظر کتاب علمی مواد (**Study Material**) مختلف مصنفین نے لکھا ہے اور اس سے کو آرڈی نیٹر و ایڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

پروف ریڈرس:

اول	:	ڈاکٹر محمد حاذق
دوم	:	ڈاکٹر سیدہ آمنہ

فہرست

پیغام	وائس چانسلر	7
پیغام	ڈائرکٹر	8
کورس کا تعارف	کورس کو آرڈی نیٹر	9

بلاک 1 : مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ

اکائی 1	مغربی ایشیاء: اجمالی تعارف	11
اکائی 2	شمالی افریقہ: اجمالی تعارف	26
اکائی 3	مغربی ایشیاء اور شمالی افریقہ پر یورپ کا استعمار	44
اکائی 4	عرب قومیت اور سیاسی آزادی	64

بلاک 2 : ترکی اور ایران

اکائی 5	جدید ترکی اور سیکولر حکومت کا قیام	76
اکائی 6	ترکی میں اسلامی احیاء	76
اکائی 7	جدید ایران (مغربی تہذیب کے اثرات)	91
اکائی 8	جدید ایران (انقلاب 1979)	91

بلاک 3 : جنوب مشرقی ممالک اور وسطی ایشیا

اکائی9	انڈونیشیا: اجمالی تعارف	120
اکائی10	ملیشیا اور برونائی: اجمالی تعارف	134
اکائی11	وسط ایشیاء کے اسلامی ممالک: اجمالی تعارف (حصہ اول)	152
اکائی12	وسط ایشیاء کے اسلامی ممالک: اجمالی تعارف (حصہ دوم)	166

بلاک 4 :مسئلہ فلسطین

اکائی13	مسئلہ فلسطین (حصہ اول)	181
اکائی14	مسئلہ فلسطین (حصہ دوم)	197
اکائی15	عرب اسرائیل جنگیں	214
اکائی16	انتفاضہ اور تنظیمیں	229
	نمونہ امتحانی پرچہ	265

پیغام

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی 1998 میں وطنِ عزیز کی پارلیمنٹ کے ایکٹ کے تحت قائم کی گئی۔ اس کے چار نکاتی مینڈیٹس یہ ہیں۔ (1)اردو زبان کی ترویج و ترقی(2)اردو میڈیم میں پیشہ ورانہ اور تکنیکی تعلیم کی فراہمی(3)روایتی اور فاصلاتی تدریس سے تعلیم کی فراہمی اور(4) تعلیم نسواں پر خصوصی توجہ۔ یہ وہ بنیادی نکات ہیں جو اِس مرکزی یونیورسٹی کو دیگر مرکزی جامعات سے منفرد اور ممتاز بناتے ہیں۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں بھی مادری اور علاقائی زبانوں میں تعلیم کی فراہمی پر کافی زور دیا گیا ہے۔

اُردو کے ذریعے علوم کو فروغ دینے کا واحد مقصد و منشا اُردو داں طبقے تک عصری علوم کو پہنچانا ہے۔ ایک طویل عرصے سے اُردو کا دامن علمی مواد سے لگ بھگ خالی رہا ہے۔ کسی بھی کتب خانے یا کتب فروش کی الماریوں کا سرسری جائزہ اس بات کی تصدیق کر دیتا ہے کہ اُردو زبان سمٹ کر چند ''ادبی'' اصناف تک محدود رہ گئی ہے۔ یہی کیفیت اکثر رسائل و اخبارات میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ اُردو قاری اور اُردو سماج دورِ حاضر کے اہم ترین علمی موضوعات سے نابلد ہیں۔ چاہے یہ خود ان کی صحت و بقا سے متعلق ہوں یا معاشی اور تجارتی نظام سے، یا مشینی آلات ہوں یا ان کے گرد و پیش ماحول کے مسائل ہوں، عوامی سطح پر اِن شعبہ جات سے متعلق اردو میں مواد کی عدم دستیابی نے عصری علوم کے تئیں ایک عدم دلچسپی کی فضا پیدا کر دی ہے۔ یہی وہ چیلنجز ہیں جن سے اُردو یونیورسٹی کو نبرد آزما ہونا ہے۔ نصابی مواد کی صورت حال بھی کچھ مختلف نہیں ہے۔ اِسکولی سطح پر اُردو کتب کی عدم دستیابی کے چرچے ہر تعلیمی سال کے شروع میں زیرِ بحث آتے ہیں۔ چوں کہ اُردو یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم اُردو ہے اور اس میں عصری علوم کے تقریباً سبھی اہم شعبہ جات کے کورسز موجود ہیں لہٰذا اِن تمام علوم کے لیے نصابی کتابوں کی تیاری اِس یونیورسٹی کی اہم ترین ذمہ داری ہے۔

مجھے اِس بات کی بے حد خوشی ہے کہ یونیورسٹی کے ذمہ داران بشمول اساتذہ کرام کی انتھک محنت اور ماہرینِ علم کے بھرپور تعاون کی بنا پر کتب کی اشاعت کا سلسلہ بڑے پیمانے پر شروع ہو چکا ہے۔ ایک ایسے وقت میں جب کہ ہماری یونیورسٹی اپنی تاسیس کی 25ویں سالگرہ منا رہی ہے، مجھے اس بات کا انکشاف کرتے ہوئے بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ یونیورسٹی کا نظامتِ فاصلاتی تعلیم از سرِ نو اپنی کارکردگی کے نئے سنگِ میل کی طرف رواں دواں ہے اور نظامتِ فاصلاتی تعلیم کی جانب سے کتابوں کی اشاعت اور ترویج میں بھی تیزی پیدا ہوئی ہے۔ نیز ملک کے کونے کونے میں موجود تشنگانِ علم فاصلاتی تعلیم کے مختلف پروگراموں سے فیضیاب ہو رہے ہیں۔ گرچہ گزشتہ دو برسوں کے دوران کووڈ کی تباہ کن صورتِ حال کے باعث انتظامی امور اور ترسیل و ابلاغ کے مراحل بھی کافی دشوار کن رہے تاہم یونیورسٹی نے اپنی حتی المقدور کوششوں کو بروئے کار لاتے ہوئے نظامتِ فاصلاتی تعلیم کے پروگراموں کو کامیابی کے ساتھ روبہ عمل کیا ہے۔ میں یونیورسٹی سے وابستہ تمام طلبا کو یونیورسٹی سے جڑنے کے لیے صمیم قلب کے ساتھ مبارکباد پیش کرتے ہوئے اس یقین کا اظہار کرتا ہوں کہ ان کی علمی تشنگی کو پورا کرنے کے لیے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا تعلیمی مشن ہر لحہ ان کے لیے راستے ہموار کرے گا۔

پروفیسر سید عین الحسن

وائس چانسلر

پیغام

موجودہ دور میں فاصلاتی طریقۂ تعلیم کو پوری دنیا میں ایک انتہائی کارگر اور مفید طریقۂ تعلیم کی حیثیت سے تسلیم کیا جاچکا ہے اور اس طریقۂ تعلیم سے بڑی تعداد میں لوگ مستفید ہو رہے ہیں۔ مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی نے بھی اپنے قیام کے ابتدائی دنوں ہی سے اردو آبادی کی تعلیمی ضروریات کے پیش نظر فاصلاتی طرز تعلیم کو متعارف کرایا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا آغاز 1998 میں نظامتِ فاصلاتی تعلیم سے ہوا اور 2004 میں باقاعدہ روایتی طرز تعلیم (Regular Courses) کا آغاز ہوا اور بعد ازاں متعدد روایتی تدریس کے شعبہ جات قائم کیے گئے۔

ملک میں تعلیمی نظام کو بہتر انداز سے جاری رکھنے میں یو جی سی کا مرکزی کردار رہا ہے۔ فاصلاتی تعلیم (ODL) کے تحت جاری مختلف پروگرام UGC-DEB سے منظور شدہ ہیں۔ UGC-DEB اس بات پر زور دیتا رہا ہے کہ فاصلاتی نظامِ تعلیم کے نصابات اور نظامات کو روایتی نظامِ تعلیم کے نصابات اور نظامات سے کماحقہ ہم آہنگ کر کے فاصلاتی تعلیم کے طلبا کے معیار کو بلند کیا جائے۔ چوں کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی فاصلاتی اور روایتی طرزِ تعلیم کی جامعہ (Dual Mode University) ہے، لہٰذا اس مقصد کے حصول کے لیے یو جی سی۔ڈی ای بی کے رہنمایانہ اصولوں کے مطابق Credit Based Credit System (CBCS) نظام متعارف کرایا گیا اور خود اکتسابی مواد (Self Learning Material) از سرِ نو، جس میں یو جی اور پی جی طلبا کے لیے چھ بلاک چوبیس اکائیوں اور چار بلاک سولہ اکائیوں پر مشتمل نئے طرز کی ساخت پر تیار کیا گیا ہے۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم یو جی، پی جی، بی ایڈ، ڈپلوما اور سرٹیفکیٹ کورسز پر مشتمل جملہ سترہ (17) کورسز چلا رہا ہے۔ ساتھ ہی تکنیکی ہنر پر مبنی کورسز بھی شروع کیے جا رہے ہیں۔ متعلمین کی سہولت کے لیے ملک کے مختلف حصوں میں 9 علاقائی مراکز بنگلورو، بھوپال، دربھنگہ، دہلی، کولکاتا، ممبئی، پٹنہ، رانچی اور سری نگر اور 6 ذیلی علاقائی مراکز حیدرآباد، لکھنؤ، جموں، نوح، وارانسی اور امراوتی کا ایک بہت بڑا نیٹ ورک موجود ہے۔ اس کے علاوہ وجے واڑہ میں ایک ایکسٹنشن سنٹر بھی قائم کیا گیا ہے۔ ان مراکز کے تحت سرِ دست 160 سے زیادہ متعلم امدادی مراکز (Learner Support Centres) نیز 20 پروگرام سنٹرس (Programme Centres) کام کر رہے ہیں، جو طلبا کو تعلیمی اور انتظامی مدد فراہم کرتے ہیں۔ نظامت فاصلاتی تعلیم اپنی تعلیمی اور انتظامی سرگرمیوں میں آئی سی ٹی کا بھرپور استعمال کرتا ہے، نیز اپنے تمام پروگراموں میں داخلے صرف آن لائن طریقے ہی سے دے رہا ہے۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم کی ویب سائٹ پر متعلمین کو خود اکتسابی مواد کی سافٹ کاپیاں بھی فراہم کی جارہی ہیں، نیز آڈیو۔ویڈیو ریکارڈنگ کا لنک بھی ویب سائٹ پر فراہم کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ متعلمین کے درمیان رابطے کے لیے ای میل اور وہاٹس ایپ گروپ کی سہولت فراہم کی گئی ہے، جس کے ذریعے متعلمین کو پروگرام کے مختلف پہلوؤں جیسے کورس کے رجسٹریشن، مفوضات، کونسلنگ، امتحانات وغیرہ کے بارے میں مطلع کیا جاتا ہے۔ پچھلے دو سال سے ریگولر کاؤنسلنگ کے علاوہ ایڈیشنل ریمیڈیل آن لائن کاؤنسلنگ مہیا کی جارہی ہے تاکہ طلبا کے تعلیمی معیار کو بلند کیا جاسکے۔

امید ہے کہ ملک کی تعلیمی اور معاشی حیثیت سے پچھڑی اردو آبادی کو عصری تعلیم کے مرکزی دھارے سے جوڑنے میں نظامتِ فاصلاتی تعلیم کا بھی نمایاں رول ہوگا۔ آنے والے دنوں میں تعلیمی ضروریات کے پیش نظر نئی تعلیمی پالیسی (NEP-2020) کے تحت مختلف کورسز میں تبدیلیاں کی جائیں گی اور امید ہے کہ یہ فاصلاتی نظام کو زیادہ مؤثر و کارگر بنانے میں مددگار ثابت ہوگی۔

پروفیسر محمد رضا اللہ خان

ڈائرکٹر، نظامت فاصلاتی تعلیم

کورس کا تعارف

نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد کے لیے یہ بات انتہائی باعث مسرت ہے کہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (یو جی سی)، ڈسٹنس ایجوکیشن بیورو (ڈی ای بی) کے 2017 ضابطوں اور دوسرے ترمیمی ضوابط 2018 کے مطابق اسلامک اسٹڈیز کے موضوع پر اردو زبان میں درسی مواد تیار کیا گیا ہے۔ یو جی سی ہدایت کے تحت یونیورسٹی کے روایتی اور فاصلاتی نظام تعلیم کے لیے ایک ہی نصاب لازمی قرار دیا گیا ہے؛ تاکہ نہ صرف ان دونوں نظام تعلیم کے طلبہ کا معیار یکساں ہو، بلکہ حصول تعلیم کے لیے فراہم کی جانے والی مختلف سہولیات کے اس دور میں ایک نظام تعلیم کے طلبہ کے لیے دوسرے نظام تعلیم کی طرف منتقلی بھی قابل عمل ہو۔

ان ضوابط کے تحت یونیورسٹی میں فراہم کیے جارہے تمام مضامین میں روایتی اور فاصلاتی نظام تعلیم کا ایک ہی نصاب تیار کیا گیا، اور اس کے مطابق درسی مواد کی تیاری کی گئی جو بیک وقت دونوں نظام تعلیم کے طلبہ وطالبات کے لیے ذریعہ استفادہ بن سکے۔ یہ مواد بی اے کے تین سالہ (چھ سمسٹرز) کورس اور ایم اے کے دو سالہ (چار سمسٹرز) کورس کے لیے تیار کروایا گیا ہے۔ اس درسی مواد کی تیاری میں ملک بھر کے ماہرین اسلامک اسٹڈیز، دانشوران اور اسلامی علوم پر گہری نظر رکھنے والے علما کی معیاری خدمات یونیورسٹی کو حاصل رہیں، اور اس میں اسلامک اسٹڈیز کے تقریباً تمام ہی موضوعات اور پہلوؤں کا جامع احاطہ کیا گیا۔ اس طرح یونیورسٹی کے ذریعے تیار ہونے والا یہ درسی مواد ایک معیاری، ہمہ گیر اور اسلامک اسٹڈیز کے پورے کورس پر محیط بن کر تیار ہوا، جس سے نہ صرف یہ کہ اسلامک اسٹڈیز کے طلبہ وطالبات کی ایک بڑی ضرورت کی تکمیل ہوئی بلکہ اسلامی مطالعات کے میدان میں قابل قدر اضافہ ہوا۔

اس نصاب کی تیاری میں قدیم نصاب کی خوبیوں کو باقی رکھتے ہوئے ضروری حذف واضافہ اور جدید تحریر کے ساتھ مضامین کی ایسی ترتیب اختیار کی گئی جو دونوں روایتی اور فاصلاتی تعلیم کے نظام کی ضرورت بیک وقت پوری کر سکے۔

یکساں نصاب کی تیاری کے بعد اسی کے مطابق درسی مواد کی تیاری بھی مطلوب تھی جس میں نئے نصاب کے مطابق پرانے تحریر شدہ مواد میں کہیں کم اور کہیں زیادہ حذف وترمیم اور تبدیلی کی ضرورت تھی۔ کئی مقامات پر کم یا زیادہ اضافہ بھی مطلوب تھا۔ بعض ذیلی عناوین پر بالکل نئی تحریر لکھنے کی ضرورت تھی اور بعض جگہوں پر مکمل اکائی کے اضافہ کی بھی ضرورت پیش آئی۔ ان سب کے علاوہ مواد کی ترتیب کو نئے نصاب کے مطابق بنایا گیا۔ نیز ہر اکائی کے تحت اکتسابی نتائج اور متنوع قسم کے سوالات کے تفصیلی نمونے شامل کیے گئے۔ ان تبدیلیوں کے بعد تیار ہونے والا مواد قدیم وجدید کا مجموعہ بن کر سامنے آیا ہے۔

ہمیں خوشی ہے کہ ہم ایم اے کے کورس کی یہ کتاب آپ کے لیے پیش کر رہے ہیں۔ تیسرے سمسٹر کے اس پرچہ کا عنوان "عہد عثمانی اور چھوٹی خاندانی حکومتیں" ہے۔ یہ روایتی تعلیم کے تحت ایم اےپ سال دوم کے لیے ہے۔ اس پرچہ میں کل سولہ اکائیاں ہیں، جن کو چار بلاک میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان بلاکس میں عثمانی دور، سلجوقی عہد، غزنوی عہد، غوری اور صفوی حکومت کا احاطہ کیا گیا ہے۔ جس میں عثمانی حکومت کا قیام واستحکام، اہم حکمراں، نظم ونسق اور سماجی ومعاشی حالات کے ساتھ زوال کے اسباب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ سلجوقی حکومت کا قیام اور علمی خدمات، غزنوی حکومت کا قیام واستحکام اور ان کی فتوحات وعلمی خدمات، غوری حکومت کا اجمالی خاکہ اور صفوی حکومت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کتاب میں ان سبھی موضوعات سے متعلق مواد شامل ہے۔

پروفیسر سید علیم اشرف

کورس کوآرڈی نیٹر

اسلام جدید عہد میں

Islam in Modern Age

اکائی 1: مغربی ایشیاء ایک تعارف

اکائی کے اجزا:

1.0 تمہید
1.1 مقاصد
1.2 مغربی ایشیاء
1.3 خلیج عرب کے ممالک
1.3.1 سعودی عرب
1.3.2 عمان
1.3.3 متحدہ عرب امارات
1.3.4 قطر
1.3.5 بحرین
1.3.6 کویت
1.4 یمن
1.4.1 تاریخی پس منظر
1.4.2 دور جدید
1.5 شام
1.5.1 سوریا کی تاریخ
1.5.2 فرانسیسی استعمار
1.5.3 سوریا جدید دور میں
1.5.4 اہم شخصیات

1.5.5 شام کی معروف تحریکات اور ادارے

1.6 اردن

1.7 لبنان

1.8 لبنان کی اہم تحریک حزب اللہ

1.9 اکتسابی نتائج

1.10 نمونہ امتحانی سوالات

1.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1.10.2 مختصر جوابی سوالات

1.10.3 طویل جوابی سوالات

1.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1.0 تمہید

مغربی ایشیاء کے ممالک ابتدا سے اسلام کا مرکز رہے ہیں، قرآن کا نزول جزیرۃ العرب میں ہوا، اور حضور ﷺ کی وفات تک تقریباپورا جزیرۃ العرب آپ کے زیر نگیں آگیا تھا، خلافت راشدہ میں فتوحات کی وسعت کے ساتھ ہی یہ ممالک اسلام کے دائرہ میں داخل ہوگئے، اور ایک طویل عرصہ تک اسلامی تہذیب وتمدن کی تشکیل وتعمیر میں نمایاں کردار ادا کیا۔ سلطنت عثمانیہ کے خاتمہ اور یوروپی نو آبادیاتی نظام کے توسع نے پوری دنیا کو عموما اور عالم عرب کو خصوصا متاثر کیا۔ جس کی زد ان ممالک پر سب سے زیادہ پڑی، کیوں کہ عرب قومیت کا پر فریب نعرہ دیکر ان ہی کے ذریعہ سلطنت عثمانیہ کو شکست سے دوچار کیا گیا تھا۔ اور یہ ممالک پہلے سے طئے شدہ پالیسی کے نتیجہ میں برطانیہ اور فرانس میں تقسیم کرلئے گئے۔ طویل جدوجہد کے بعد ان ممالک نے مغربی استبداد سے آزادی حاصل کی اور دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر اپنی ساکھ بحال کی۔ اس اکائی میں ہم ان ممالک کی مختصر تاریخ کے ساتھ ساتھ موجودہ حالت اور نظام کا جائزہ لیں گے۔

1.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ اس اکائی کے مطالعہ سے ہم کو مغربی ایشیاء کے ممالک میں مسلمانوں کی موجودہ حالات سے آگاہی حاصل ہو۔ اس اکائی میں آپ کو مغربی ایشیائی مسلم ممالک کی تاریخ کے بارے میں واقفیت حاصل ہو گی جس میں اسلام کی آمد سے پہلے یہاں کے حالات، اور اسلامی دور میں یہاں کے احوال پر گفتگو ہو گی، نیز ہم اس بات سے بھی روشناس ہوں گے کہ مغربی نو آبادیاتی نظام میں ان

ملکوں کی کیا حیثیت رہی، نو آبادیاتی نظام نے ان کو کس قدر متاثر کیا، اور دور جدید میں ان میں کس طرح کی تبدیلیاں آئیں۔

1.2 مغربی ایشیاء

عربی تاریخ میں مغربی ایشیاء کی اصطلاح نہیں پائی جاتی، یہ جدید دور کی پیداوار ہے، یہاں اس سے مراد جنوب مغربی ایشیاء کے ممالک ہیں، جن میں جزیرہ العرب کے ممالک کے علاوہ ہلال خصیب یعنی زرخیز ہلال کے ممالک شامل ہیں۔ اس اکائی میں ہم خلیج عرب کے چھ ممالک یعنی سعودی عرب، قطر، بحرین، کویت، عمان، متحدہ عرب امارات کے علاوہ ملک یمن، شام، اردن اور لبنان کا جائزہ لیں گے۔ آپ نے پچھلے نصاب میں اسلام کی تاریخ کے ضمن میں پڑھا ہے کہ یہ ممالک ابتدا سے اسلام کا گہوارہ رہے ہیں اور ان ممالک کو مذہبی، سیاسی اور اقتصادی اہمیت ہمیشہ سے حاصل رہی۔

جدید دور میں بھی ان ممالک کی اقتصادی وجغرافیائی اہمیت کے پیش نظر ان کی اہمیت عالمی سیاست میں بے حد بڑھ جاتی ہے، خصوصا تیل کی پیداوار کے بعد یہاں عالمی برادری اور بڑی طاقتوں کی نظریں اس پر مرکوز ہو چکی ہیں۔

1.3 خلیج عرب کے ممالک

خلیج عرب کا علاقہ جسے عام طور پر جزیرہ نمائے عرب کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، کے بارے میں خیال ہے کہ یہ دنیا کا وہ قدیم ترین علاقہ ہے، جس پر انسان آباد ہوا، بعض روایات کے مطابق حضرت آدم وحواؑ کی ملاقات جنت سے نکالے جانے اور زمین پر بھیجے جانے کے بعد یہیں مقام عرفات میں ہوئی تھی۔ خانہ کعبہ پہلا گھر ہے، جو انسانوں نے اللہ کی عبادت کے لئے مکہ مکرمہ میں تعمیر کیا، قدیم زمانہ سے یہ علاقہ مختلف قبیلوں اور تہذیبوں کا مرکز رہا ہے، اسلام کی اشاعت کے بعد سے یہ علاقہ اسلامی تہذیب وثقافت کا گہوارہ ہے۔ حالاں کہ مسلمانوں کے عروج وزوال کے مختلف ادوار میں اس علاقے نے بھی زمانہ کے سرد وگرم دیکھے ہیں، اور امن وقانون کے مسائل سے بھی دوچار ہوا ہے۔ البتہ جدید عرب ریاستوں کے قیام اور تیل سے حاصل ہونے والی آمدنی نے قبائلی بنیادوں پر قائم ان ریاستوں کو امن واستحکام بھی عطا کیا ہے۔ اور انہیں تعمیر وترقی کے راستہ پر گامزن کیا ہے۔ یہاں اس علاقے اور اس میں واقع عرب ریاستوں کی تاریخ وثقافت اور سماج پر تفصیل سے گفتگو کرنے کا موقع نہیں، تاہم ذیل میں خلیج تعاون کونسل کے چھ رکن ملکوں کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے، جو ان کی جدید تاریخ پر مبنی ہے۔

1.3.1 سعودی عرب

اس عرب ملک کا پورا نام ''المملکۃ العربیہ السعودیہ'' ہے، اس کا دار الحکومت نجد کا شہر ریاض ہے، آل سعود کا یہ خاندان یہاں پر حکمراں ہے، جس کی ابتدائی تاریخ پندرہویں صدی عیسوی کے وسط میں وادئ حنیفہ سے شروع ہوتی ہے، اٹھارویں صدی کے وسط میں کہا جاسکتا ہے کہ سعودی ریاست کا ظہور ہونا شروع ہوا، جب محمد بن سعود اور محمد بن عبد الوہاب کے اشتراک سے نجد کے علاقہ میں ایک نئی سیاسی قوت نے جنم لیا۔ البتہ آل سعود کی سیاسی قوت آئندہ تقریبا ڈیڑھ سو برس تک عروج وزوال سے دوچار ہوتی رہی، یہاں تک کہ 1926

میں عبد العزیز بن سعود نے نجد و حجاز اور اطراف کے بڑے علاقوں کو زیر نگیں کر کے ایک مستحکم ریاست کی بنیاد رکھی، جو اس وقت مملکت نجد و حجاز کہلائی، 1932 میں اس ریاست کا نام بدل کر مملکت سعودی عرب رکھ دیا گیا۔ اسی دوران مارچ 1938 میں سعودی عرب میں تیل (پٹرول) دریافت ہوا، اور اس دریافت نے مملکت کو معاشی طور پر مستحکم کرنے میں زبردست رول ادا کیا۔

موجودہ سعودی عرب کی اہمیت یہ ہے کہ اسے مسلم دنیا میں دنیوی اور روحانی دونوں طرح کی سیادت حاصل ہے، مذہب اسلام کے اہم ترین مقامات مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی اس ریاست میں موجودگی، اور ان دونوں کا انتظام وانصرام سعودی عرب کو پوری مسلم دنیا میں ایک منفرد مقام عطا کرتا ہے۔ حالاں کہ سعودی عرب ایک خاندانی بادشاہت ہے، اور آل سعود کو اس میں بنیادی سیاسی ادارے کی حیثیت حاصل ہے، اس کے باوجود عوامی بہبود کے اپنے کاموں کی وجہ سے یہ ایک رفاہی حکومت کا منظر پیش کرتی ہے۔ آئینی طور پر اس ریاست کا حکمراں عبد العزیز بن سعود کی اولاد میں سے ہوتا ہے، البتہ اس کی حکمرانی قرآن و شریعت اسلامی کے دائرہ میں ہوگی، حالیہ دنوں میں سعودی عرب میں آئینی بادشاہت کے ساتھ بنیادی جمہوری اداروں کو بھی متعارف کرانے کی کوششیں شروع ہوئی ہیں، مثال کے طور پر 2005 میں مقامی کونسلوں کے لئے انتخابات ہوئے، مگر ان میں خواتین کو ووٹ ڈالنے کی اجازت نہیں تھی، 2011 میں اس وقت کے بادشاہ شاہ عبد اللہ نے عورتوں کے لئے مقامی کونسلوں میں ووٹ ڈالنے اور انتخابات میں حصہ لینے کا اعلان کیا، جس کی حالیہ بادشاہ شاہ سلمان نے بھی تصدیق کی ہے، مملکت کا عدالتی نظام اسلامی شریعت کا پابند ہے۔ اسی طرح قانون سازی میں بھی شریعت کو بالادستی حاصل ہے۔

سعودی عرب جزیرہ نمائے عرب کا سب سے بڑا ملک ہے، اس کا رقبہ 21 لاکھ مربع کیلو میٹر سے زیادہ ہے، اور آبادی تین کروڑ ہے، انتظامی لحاظ سے مملکت 13 صوبوں میں منقسم ہے۔ جن میں ریاض، مکہ اور مدینہ کے صوبے بہت اہم ہیں۔ اسی طرح مملکت میں بیس بڑے شہر ہیں، ان میں بھی ریاض، مکہ اور مدینہ کے علاوہ جدہ، طائف، اور دمام بڑے اور اہم شہروں میں شمار ہوتے ہیں، مملکت کے زیادہ تر باشندے عرب ہیں، زیادہ تر علاقہ صحراء یا نیم صحراء ہے، صرف دو فیصدی علاقہ ہی قابل کاشت ہے، البتہ تیل کی دولت سے مالامال ہے۔

جدید سعودی عرب کے قیام تک اس علاقہ میں لوگوں کی تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام نہیں تھا، 1932 میں مملکت کے باضابطہ قیام کے ساتھ ہی ابتدائی کوششوں کا آغاز ہوا، اس سے قبل زیادہ تر مساجد سے ملحق مدارس میں روایتی تعلیم ہوتی تھی، البتہ تیل کی دریافت سے حاصل ہونے والی آمدنی نے مملکت کی تعلیم کے فروغ کی کوششوں کو تیز گامی عطا کی، چنانچہ 1945 میں بنیادی تعلیم کے لئے اسکولوں کے قیام کا خاکہ تیار ہوا، اور صرف چھ سال کے اندر دو سو سے زیادہ اسکول قائم کئے گئے۔ جن میں تیس ہزار طلبہ تعلیم حاصل کرتے تھے۔ 1954 میں باضابطہ وزارت تعلیم کا قیام عمل میں آیا، اور 1957 میں سعودی عرب کی پہلی یونیورسٹی شاہ سعود یونی ورسٹی قائم ہوئی، اس کے بعد سے سعودی عرب میں نہ صرف بنیادی تعلیم کے ڈھانچے میں کافی ترقی ہوئی ہے، بلکہ اعلی تعلیمی ادارے بھی بڑی مقدار میں وجود میں آئے ہیں، صرف کالجز اور یونیورسٹیز کی تعداد ہی زیادہ 50 سے زیادہ پہونچ چکی ہے۔

1.3.2 عمان

اس ملک کا پورا نام سلطنت عمان ہے، اوائل اسلام میں یہاں کے باشندے مسلمان ہوگئے تھے، زمانہ قدیم سے یہ سمندری تجارت کا

اہم مرکز رہا ہے، اور ایک طویل عرصہ تک یہاں ایک مضبوط سلطنت قائم تھی۔ البتہ بیسویں صدی تک پہونچتے پہونچتے اسے زوال ہو گیا۔ اور یہ برطانیہ کے زیر اثر آ گئی۔ مسقط اس ملک کا دار الحکومت ہے، اور خطہ کی اہم تجارتی بندر گاہ بھی ہے۔ البتہ خطے کے دوسرے ممالک کی طرح یہاں تیل کی دولت زیادہ نہیں ہے، اور اس کے تیل کے ذخائر نسبتاً کم ہیں، زیادہ تر علاقہ صحرائی ہے، اور آبادی ساحلی علاقوں میں ہے۔

سلطنت پر آل سعید کی حکومت ہے، اور سلطان قابوس بن سعید آل سعید اس خاندان کے چودھویں حکمراں ہیں، اور یہ خلیجی ممالک میں سب سے طویل مدت تک حکومت کرنے کا ریکارڈ رکھتے ہیں، اور 1470 سے حکومت کر رہے ہیں۔ عمان کا رقبہ تین لاکھ کیلو میٹر اور آبادی 32 لاکھ ہے، انتظامی لحاظ سے سلطنت کو 11 صوبوں میں تقسیم کیا گیا ہے، اور دس شہر ہیں۔ زبان عربی ہے، اور مذہب اسلام ہے، بیسویں صدی کے وسط تک تعلیم کا کوئی خاص انتظام نہیں تھا، اور بہت ہی معمولی روایتی تعلیم ہوتی تھی۔ 1970 تک مملکت میں صرف تین اسکول تھے، جن میں ایک ہزار کے قریب بچے تعلیم پاتے تھے، سلطان قابوس نے اقتدار سنبھالنے کے بعد تعلیم پر خاص توجہ دی، اور اب یہاں ایک ہزار سے زائد سرکاری اسکول ہیں جن میں ساڑھے چھ لاکھ طلبہ تعلیم پاتے ہیں۔ 1986 میں عمان کی پہلی یونیورسٹی سلطان قابوس یونیورسٹی قائم ہوئی ہے، اس کے بعد دو دیگر یونیوسٹیاں بھی قائم ہوئی ہیں، مزید بر آں کئی ادارے پیشہ ورانہ تعلیم کے لئے بھی وجود میں آئے ہیں۔

1.3.3 متحدہ عرب امارات

ملک کا پورا نام ''دولۃ الامارات العربیہ المتحدہ'' ہے، اس کا دار الحکومت ''ابو ظبی'' کا شہر ہے، یہ ایک وفاقی ریاست ہے، جس میں علاقہ کی سات چھوٹی چھوٹی خاندانی بادشاہتیں شامل ہیں: (1) ابو ظبی، (2) دبئ، (3) الشارقہ، (4) عجمان، (5) ام القیوین، (6) الفجیرہ، (7) راس الخیمہ۔ پہلے صرف چھ ریاستیں وفاق میں شامل تھیں، راس الخیمہ نے بعد میں وفاق میں شمولیت اختیار کی، 2 دسمبر 1971 کو ان ریاستوں نے وفاق اور ایک مشترکہ نظام حکومت کا اعلان کیا۔ ریاست کا کل رقبہ 91 ہزار مربع کیلو میٹر ہے، اور آبادی تقریباً 50 لاکھ ہے، 1971 سے پہلے ان ریاستوں کو Trucial States (متصالح ریاستیں) کہا جاتا تھا، اور وہ زیادہ تر برطانوی حکومت کے زیر اثر تھیں، عربی سرکاری زبان ہے، اور ریاست کا مذہب اسلام ہے۔

1970 میں تیل کی دریافت کے بعد متحدہ عرب امارات نے تیزی سے ترقی کی ہے، تیل اور گیس کی دولت کے علاوہ امارات نے متبادل ذرائع میں دلچسپی دکھائی ہے، خاص طور سے براہ راست بیرونی سرمایہ کاری کے ایک بڑے مرکز کے طور پر ابھرا ہے، اس کا شمار دنیا کی خوشحال اور امیر ترین ریاستوں میں ہوتا ہے، 1970 سے قبل ریاست کی تعلیمی صورتحال اچھی نہیں تھی، البتہ اس کے بعد سے صورت حال میں ڈرامائی تبدیلی آئی ہے، نہ صرف بنیادی تعلیم پر خاص طور سے توجہ دی گئی ہے، بلکہ اعلی تعلیم بھی بہتر ہوئی ہے، خواندگی کی شرح 90 فیصد سے زیادہ ہے، اور اسے حاصل کرنے کے لئے تقریباً 90 تعلیم بالغان کے مراکز سے مدد لی گئی ہے، بڑی تعداد میں اسکولوں کے علاوہ یونیوسٹیاں بھی قائم ہوئی ہیں، ان میں چار متحدہ عرب امارات یونیورسٹی، خلیفہ یونیورسٹی، امریکن یونیوسٹی، شارجہ اور یونیورسٹی آف شارجہ زیادہ مشہور ہیں۔

1.3.4 قطر

ریاست کا پورانام دولۃ قطر ہے، اور دوحہ اس ملک کا دار الحکومت ہے، سرکاری زبان عربی ہے، اور ریاست کا مذہب اسلام ہے، قطر کا علاقہ کسی زمانہ میں ایک بڑی اور قدیم حکومت کا مرکز رہ چکا ہے، اور مختلف ادوار میں اسے اہمیت حاصل رہی ہے، بیسویں صدی کے اوائل میں یہ ملک برطانیہ کے انتداب میں چلا گیا، اور 1971 تک عملا اس کے زیر اثر رہا، یکم ستمبر 1971 سے ایک آزاد ملک ہے، ملک کا رقبہ تقریبا 12 ہزار کلو میٹر ہے، اور آبادی 22 لاکھ کے قریب ہے۔

قطر بھی بنیادی طور پر ایک خاندانی بادشاہت ہے، جہاں آل ثانی کی حکومت ہے، اور تمیم بن حمد آل ثانی اس کے فرماں روا ہیں، البتہ قطر کی انفرادیت یہ ہے کہ اس ملک نے خطہ کے دیگر ملکوں کے مقابلہ سیاسی اصلاحات زیادہ کی ہیں، ملوکیت کے باوجود یہاں پارلیامنٹ ہے، اور اظہار رائے کی آزادی بھی لوگوں کو کسی قدر حاصل ہے، خاص طور پر اپنے ٹیلی ویزن چینل "الجزیرہ" کے عنوان سے قطر نے عالمی سطح پر اپنی ایک منفرد شناخت قائم کی ہے، اور کہا جاتا ہے کہ عرب دنیا میں سیاسی و سماجی بیداری کے فروغ کے حوالہ سے "الجزیرہ" ٹیلی ویزن چینل کا کردار غیر معلولی ہے۔

قطر بھی تیل اور گیس کی دولت سے مالا مال ہے، خاص طور پر اس کے پاس گیس کا ذخیرہ عالمی سطح پر تیسرے نمبر پر ہے، تعلیم کے معاملہ میں 70 کی دہائی تک قطر بھی پس ماندہ ترین علاقوں میں شمار ہوتا تھا، لیکن اس کے بعد اس نے تعلیم کے میدان میں نہ صرف یہ کہ سرمایہ کاری کی ہے، بلکہ بڑے پیمانہ پر اصلاحات بھی کی گئی ہیں، تازہ ترین اعداد و شمار کے مطابق عرب دنیا میں سب سے زیادہ شرح خواندگی قطر میں ہے، جو 97 فیصد سے زیاد ہے، قطر نے اسکولوں کا نظام قائم کرنے کے علاوہ اعلی تعلیمی ادارے بھی قائم کئے ہیں۔ تعلیم کے فروغ کے لئے اس نے باضابطہ تعلیمی شہر بسایا ہے، جہاں دنیا بھر کی بڑی یونیورسٹیوں کے تعلیمی مراکز موجود ہیں۔ عرب سیاست اور سماج میں قطر کا رول اانتہائی اہمیت کا حامل ہے۔

1.3.5 بحرین

ملک کا پورانام دولۃ بحرین ہے، دارالحکومت منامہ ہے، اور سرکاری زبان عربی ہے، ریاست کا مذہب اسلام ہے، رقبہ 765 مربع کیلو میٹر ہے، اور آبادی 13 لاکھ ہے، 1971 میں آزادی کے اعلان سے قبل تک بحرین بھی برطانیہ کے زیر اثر تھا، اور ترقی برائے نام تھی، البتہ آزادی کے بعد دیگر خلیجی ملوکوں کی طرح بحرین نے بھی ترقی کی ہے، تیل اور گیس کی مصنوعات کے علاوہ جہاز سازی کی صنعت بحرین میں اچھی ہے، سیاحت کو بھی بحرین میں بڑے پیمانے پر فروغ دیا گیا ہے۔

بحرین کا نظام حکومت آئینی بادشاہت ہے، اور آل خلیفہ یہاں پر حکمراں ہیں، موجودہ حکمراں کا نام حمد بن عیسی آل خلیفہ ہے۔

1.3.6 کویت

ملک کا پورانام دولۃ کویت ہے، کویت شہر اس کا دار الحکومت ہے، ملک کی سرکاری زبان عربی اور مذہب اسلام ہے، کویت جدید

ملک ہے، اس کی قدیم تاریخ عراق کے شہر بصرہ سے وابستہ ہے، مغربی استعماری دور میں کویت کا علاقہ برطانیہ کے زیر اثر رہا، یہاں الصباح خاندان ایک طویل عرصہ سے حکمراں ہے، البتہ شیخ احمد الجابر الصباح کو جدید کویت کا بانی و معمار کہا جاتا ہے۔

1936 میں برطانیہ کی نگرانی میں تیل کے کنووں کی دریافت ہوئی، اور پھر تیل کی دولت سے مالا مال یہ ملک خطہ کی سیاست او رمعیشت کا ایک اہم رکن بن گیا، خوش حالی، ترقی اور تعلیم کے اعتبار سے یہ ملک دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ ریاست کا کل رقبہ تقریبا18 کیلو میٹر ہے، اور آبادی 40لاکھ ہے، کویت کے موجودہ امیر صباح الصباح ہیں، کویت اس اعتبار سے بھی خلیج کا اہم ملک ہے کہ اس نے سماجی ترقی اور سیاسی اصلاحات پر خاص توجہ دی ہے، تعلیم اور معیشت کی بہتری کے علاوہ کویت میں لوگوں کا سماجی شعور بھی خاصا بیدار ہے، اور خلیج کے دیگر ملکوں کے مقابلہ کویت میں خواتین کو سیاسی اختیارات بھی دئے گئے ہیں، اسی طرح کویت میں انتخابات بھی ہوتے رہتے ہیں، اور محدود پیمانہ پر پارٹیاں بھی موجود ہیں۔

1.4 یمن

یمن مشرق وسطی کا ایک خوبصورت ملک ہے، جو جنوب اور مغربی جنوب عرب میں واقع ہے، اس کے شمال میں سعودی عربیہ، جنوب میں خلیج عدن اور بحر عرب، مغرب میں بحر احمر، اور مشرق میں عمان واقع ہیں۔ کل رقبہ 203,849 مربع میل پر مشتمل ہے۔ اس کا ساحلی علاقہ 1,184 مربع میل ہے، 2009 کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی تقریبا23,580,000 تھی۔ 99 فیصد سے زیادہ یہاں مسلمان آباد ہیں، جن میں سنی 50 سے 55 فیصد، اور شیعہ 42 سے 47 فیصد ہیں، بہت کم تعداد میں یہاں ہندو، عیسائی، اور یہودی ہیں، دار الحکومت صنعاء ہے، اور سرکاری زبان عربی ہے۔

1.4.1 تاریخی پس منظر

قدیم زمانہ میں یمن میں منائین (Minaen) کی بادشاہت تھی، جو 1200 سے 750 قبل مسیح رہی، پھر، سابئین کی حکومت 750 سے 115 قبل مسیح تک رہی۔ اس کے بعد یہاں پہلی صدی عیسوی میں رومی اور حبشی آئے اور چھٹی صدی عیسوی سے پارسیوں نے یہاں حکومت کی۔

یمن میں سب سے پہلے مسلمان رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں 628 میں آئے، اس وقت کے ایرانی گورنر باذان نے اسلام قبول کرلیا۔ اس کے بعد وہاں بہت تیزی سے اسلام پھیلا، رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد حضرت ابو بکرؓ کے دور میں یمن کے شہر صنعا، الجناد اور حضر موت وغیرہ اسلامی ریاست کے ماتحت آچکے تھے۔ خلافت راشدہ کے بعد امویوں نے یہاں 661 سے 750 تک، عباسیوں نے 750 سے 879 تک، عثمانیوں نے 1538 سے 1635 تک حکومت کی، لیکن اس درمیان کسی کو بھی یمن کے پورے حصہ پر کنٹرول حاصل نہ رہا، خاص طور سے یمن کے شمالی حصہ میں زیدیوں کے علاوہ دوسرے کو حکومت جمانے کا بہت کم موقع ملا۔ وہاں کی مقامی حکومتیں جنہوں نے اپنے قیام کے لئے بہت زور آزمائی کی تھی وہ زیادی (818-1018)، نجاہد (1022-1150)، ایوبی (1174-1229)، رسولی (1228-

1454)، صلحد، طاہری اور زیدی وغیرہ ہیں۔

ان میں سب سے مضبوط زیدی حکومت تھی، جس کی بنیاد 897 میں یحی بن حسین بن قاسم الراسی نے شمال یمن کے پہاڑی علاقے میں رکھی تھی، چوں کہ یہ شیعوں کی حکومت تھی، اس لئے اس کے حکمراں امام ہوا کرتے تھے، اور یہ حکومت 1962 تک رہی۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد عثمانی حکومت یمن سے دست بردار ہوگئی، اس کے بعد جنوبی یمن پر انگریزوں کا قبضہ رہا، اور یمن کے شمالی حصہ پر امام یحی المتوکل کی حکومت رہی۔ لوگ امام کی قدامت پرستی سے اکتا چکے تھے، ساتھ ہی یمن کے لوگوں میں عرب قوم پرستی کا جذبہ پیدا ہونے لگا تھا، لہٰذا یہاں کے لوگوں نے 1958 میں مصر کے صدر ناصر کے ماتحت متحدہ عرب جمہوریہ کے لئے آواز اٹھائی، امام یحی 1961 میں حکومت سے دست بردار ہوئے، 1962 میں وفات پاگئے۔ کچھ مزاحمت کے بعد ان کا لڑکا محمد البدر بھی پہاڑی علاقہ میں جاکر چھپ گیا، اس کے بعد ملک میں خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ 1970 میں ایک معاہدہ ہوا، جس کے تحت شاہی خاندان کے لوگ یمن عرب جمہوریہ (Yamen Arab Republic) کے لئے راضی ہوگئے۔

1.4.2 دور جدید

1918ء میں شمالی یمن نے عثمانی حکومت سے امداد حاصل کی، اسی وقت سے یمن کی جدید تاریخ کی شروعات ہوتی ہے۔ شمالی یمن 1962ء میں ایک جمہوریہ بن چکا تھا لیکن پورے طور سے 1967ء میں انگریزوں کے جانے کے بعد بنا۔ انگریز بھی یمن سے گزرے بغیر ہندوستان تک نہیں پہونچ سکتے تھے لہذا یمن کے جنوبی حصے پر عثمانیوں کے بعد انگریزوں نے قبضہ کر لیا۔ 20ویں صدی کے پہلے عشرے میں شمالی علاقوں میں زیدی قبائل کے سربراہ امام یحیٰ کی حکومت تھی۔ وہ خود کو امام کہلاتے تھے۔ اس نے یہیں سے عثمانوں کے انخلاء کے بعد جنوب کے علاقوں کی طرف پیش قدمی کی اور انگروزوں کے زیر اثر علاقہ تک پہونچ گئے۔ اس دوران اس نے اٹلی سے بھی مدد مانگ لی جو خلافت عثمانیہ کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ اٹلی کی مدد پر انگریز کو بھی فکر لاحق ہوئی اور انہوں نے ابن سعود اور تہامہ کے گورنر سے معاہدہ کر لیا۔

1934ء میں امام یحیٰ نے اپنے تہامی پناہ گزینوں سے بے وفائی کرتے ہوئے انھیں سعودیوں کے حوالے کر دیا اور عدن میں اگلے چالیس سالوں کیلئے انگریزوں کی حکومت تسلیم کر لی۔ 22 مئی 1990ء کو شمالی اور جنوبی یمن ایک ہوگئے اور اسطرح جمہوریہ یمن وجود میں آیا اور سب نے متفقہ طور پر صالح کو اپنا صدر تسلیم کر لیا۔ وہاں کے لوگ شمالی اور جنوبی علاقوں کو ملا کر ایک ملک بنانے میں تو کامیاب ہوگئے، لیکن جلد ہی دونوں علاقوں کی فوجوں میں ٹکراؤ شروع ہوگیا۔ ملک میں بڑی تباہی مچی پھر صدر صالح نے اس پر کنٹرول حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ 1999ء میں یمن میں براہ راست صدارتی انتخابات ہوے جس میں صالح نے 56 فیصد ووٹ لے کر ایک بار پھر اقتدار کی کرسی حاصل کی۔ اس الیکشن میں صالح کا واحد حریف اس کی اپنی سیاسی پارٹی کا ہی ایک ممبر تھا۔ صالح نشہ کی عادت بھی رکھتا تھا، اس لئے اکثر نشہ میں کئے گئے وعدوں اور دستخطوں سے منکر ہو جایا کر تا تھا۔ 2005ء میں اپنی صدارت کی 27ویں سالگرہ کے موقع پر جوش میں آکر صالح نے عوام کو یہ خوشخبری سنائی کہ آئندہ سال ہونے والے انتخاب میں وہ حصہ نہیں لیگا، لیکن آئندہ سال اس نے نہ صرف انتخاب میں حصہ

لیابلکہ حسب معمول جیت بھی گیا۔ بڑی عجیب بات ہے کہ وہ نشہ کا عادی تھا اور اس کے دور میں ملک میں خرابی بھی پھیل گئی تھی لیکن لوگ اس کو کامیاب بناتے رہے۔ اس کے دور حکومت میں یمن کرپشن میں سر فہرست دس ممالک میں آ گیا تھا۔ صالح کے کاموں میں ایک ریپبلیکن گارڈ کا قیام بھی تھا۔

2011ء میں جب عرب بہاریہ کا آغاز ہوا اور عرب ملکوں میں عوام نے بادشاہت کے خاتمہ کے خلاف آواز اٹھائی جس کی باز گشت یمن میں بھی سنی گئی، لیکن صالح نے خود کو منتخبہ جمہوری صدر سمجھتے ہوئے اس آواز کا مخاطب نہ سمجھا، صرف اتنا کیا کہ ایک اعلان جاری کر دیا کہ آئندہ الیکشن میں نہیں آؤں گا۔ لیکن ساتھ ہی اس نے پر امن عوامی مظاہروں پر تشدد جاری رکھا۔ اس کے خلاف پارلیمنٹ کے ارکان اور کئی وزراء نے استعفی دے دیا۔ بالآخر صالح نے اقتدار چھوڑ دیا۔

یمن کی حکومت تعلیم پر اچھا خاصا پیسہ خرچ کرتی ہے۔ حکومت کے خرچ کا 14 سے 20 فیصد حصہ تعلیم کیلئے ہوتا ہے۔ اسکولوں میں 5 سے 15 سال تک کے بچوں کو مفت اور لازمی تعلیم دی جاتی ہے۔ ملک میں سات بڑی یونیورسٹیاں ہیں جو صنعاء، عدن، حدیدہ (hodeida)، تعز (Taiz)، اِب (ibb)، ذمار (Dhamar)، اور حضر موت میں واقع ہیں۔ اس کے علاوہ پرائیویٹ یونیورسٹیاں اور کالج بھی ہیں جہاں میڈیکل، انجینیرنگ اور دوسرے علوم پڑھائے جاتے ہیں۔ 2005ء میں سرکاری جامعات میں تقریباً 174000 اور پرائیویٹ جامعات میں 12000 طالب علم تھے۔

دیہات کے اہم پیداوار میں غلہ، پھل، سبزی اور کافی وغیرہ ہیں۔ 17 ویں اور 18 ویں صدی میں یمن میں کافی کی تجارت کو بہت فروغ ملا اور یہاں کی کافی پوری دنیا میں بر آمد ہوتی تھی۔ زیادہ تر لوگ کسان ہیں صرف ایک چوتھائی لوگ سرکاری نوکری، تعمیرات اور تجارت کے کام سے جڑے ہوئے ہیں۔ قدرتی وسائل: گیس، پٹرول، سنگ مرمر، سونا، کوپر وغیرہ ہیں۔ یمن کے تجارتی تعلقات زیادہ تر تھائی لینڈ، چین، متحدہ عرب امارات، ہندوستان، شمالی کوریا، سویٹزرلینڈ وغیرہ سے ہوتے ہیں۔

1.5 شام

بلاد شام مغربی ایشائی ممالک میں عظیم تاریخ اور شہرت کا حامل ملک رہا ہے، اس کی برکتوں کی خود رسول ﷺ نے تعریف فرمائی، حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ساکنان شام کو خوشخبری ہو، ساکنان شام کو خوشخبری ہو، ساکنان شام کو خوشخبری ہو، صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ کس وجہ سے؟ آپ نے فرمایا: اللہ کے فرشتے اپنے پر شام پر پھیلائے ہوئے ہیں (ترمذی)۔ ایک اور حدیث میں آپ ﷺ نے فتنوں کے دور میں ملک شام کو وطن بنانے کا حکم دیا ہے۔ (ابو داود)۔

ملک شام سے مراد موجودہ سوریا ہے، عصر حاضر سے قبل بلاد شام کا لفظ صرف سوریہ کے لئے نہیں بولا جاتا تھا، بلکہ اس سے مراد بلاد شام کا وسیع علاقہ تھا، جس میں چار ممالک سوریا، اردن، لبنان اور فلسطین بشمول اسرائیل کی کالونی شامل تھے، پہلی جنگ عظیم کے نتیجہ میں جب سلطنت عثمانیہ سے عرب ممالک علیحدہ ہوئے، اور یوروپی استعمار نے عالم عرب کے حصے بخرے کئے تو 1916 میں برطانیہ اور فرانس

نے خفیہ معاہدہ کے تحت جس کو سائکس پیکو معاہدہ کہا جاتا ہے، عالم عرب کو تقسیم کر لیا، اور انہوں نے اس وسیع علاقہ کو چار چھوٹے ملکوں سوریا، لبنان، فلسطین، اور اردن میں تقسیم کر دیا، اور اس طرح قدیم بلاد شام کے صوبے مستقل ملک کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آئے، اور اپنے وجود و بقا کے لئے جدوجہد کرنے لگے۔ ان میں سب سے بڑا رقبہ سوریا کا ہے، پھر لبنان کا اور پھر اردن کا، یہاں ہم ان میں سے ہر ایک ملک کا علیحدہ علیحدہ مطالعہ کریں گے۔

1.5.1 سوریا کی تاریخ

قدیم بلاد شام کے سب سے زیادہ حصہ پر محیط ملک سوریا ہے، جس کی راجدھانی دمشق ہے، سوریا کا لفظ آشور سے نکلا ہے، جو اس ملک پر حکمراں ایک قوم تھی، ابتدا سے یہ علاقہ علم و فن، تہذیب و تمدن اور ادیان و مذاہب کا مرکز رہا ہے، یہودیت، نصرانیت اور اسلام تینوں مذاہب کا تاریخی تقدس اس سرزمین سے وابستہ ہے، قدیم دور میں یہاں سریانی عبرانی، فینقی اور آرامی زبانیں بولی جاتی رہی ہیں، ملک شام کی تاریخ ایک ملین سال قبل مسیح پرانی ہے، اور دمشق کا شہر دنیا کے قدیم ترین آبادیوں میں سے ہے، تاریخ میں اس کا سراغ دو ہزار سال قبل مسیح سے ملتا ہے، اور اسی وقت سے یہ انسانی آبادی کا مرکز رہا ہے، یہاں کی خوشگوار آب و ہوا، قدرتی حسن، اور ملنسار باشندوں نے ہر دور میں دنیا کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی۔ اور کئی قوموں مثلا آرامی آشوری وغیرہ نے اس علاقہ پر حملہ کیا، سکندر یونانی نے 333 قبل مسیح میں ایران کو زیر کرنے کے بعد دمشق پر حملہ کیا، اور اس وقت سے یہاں پر یونانی تہذیب کے اثرات موجود ہیں، 64 قبل مسیح میں رومیوں نے یہاں پر حملہ کیا، اور اس کو اپنی کالونی بنایا، جب رومیوں میں اختلاف ہوا تو یہ علاقہ بیزنطینی سلاطین کے حصہ میں آیا، اسلامی دور میں رسول اللہ ﷺ نے یہاں کے بادشاہ کو اسلام کی دعوت دی، 9 ہجری میں تبوک کا غزوہ پیش آیا، خلافت راشدہ میں یرموک کی فیصلہ کن لڑائی میں شام میں رومیوں کی حکومت کا زور ٹوٹا، خلافت فاروقی میں 14 / 656 میں دمشق پر حملہ ہوا، طویل محاصرہ کے بعد حضرت خالد بن ولید نے مشرقی سمت سے باب شرقی سے حملہ کیا، اور فاتحانہ داخل ہوئے، اسی لمحہ اہل دمشق نے موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے مغربی دروازہ سے جس کا نام بعد میں باب الجابیہ پڑا، ابو عبیدہ بن الجراح سے صلح کی درخواست کی اور وہ دمشق میں صلحا داخل ہوئے، ان کو خالد کے فاتحانہ داخلہ کی خبر نہ تھی، بیچ شہر میں دونوں کی ملاقات ہوائی۔ بہر حال باشندوں کو امان عطا کی گئی۔ خلافت راشدہ کے دور میں حضرت معاویہ شامی مقبوضہ جات کے امیر تھے، جن کی دور اندیشی اور رواداری کی سیاست سے اہل شام ان سے محبت کرنے لگے۔

جب امیر معاویہ نے شہر دمشق کو عالم اسلام کا دار الخلافہ بنایا تو اس کی سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی شناخت زیادہ ابھر کر سامنے آئی، اور عہد اموی میں یہاں شاندار عمارتیں، باغات مساجد و محلات اور مدارس قائم ہوئے۔ 132ھ میں جب اموی دور کا خاتمہ ہوا تو عباسی خلافت نے دمشق کے بجائے بغداد کو دار الخلافہ قرار دیا، اس کے باوجود اس علاقہ کی تہذیبی، علمی اور اقتصادی شناخت باقی رہی۔ علاقائی حکومتوں کے دور میں بھی اس کو اہمیت حاصل رہی، خصوصا نور الدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی نے شام پر حکومت کی، اور دمشق و حلب میں کئی تعمیری اور علمی کام انجام دئے۔ مصر سے قربت کی وجہ سے طولونی، اخشیدی، فاطمی اور مملوکی دور میں یہ علاقہ مصر کے ماتحت رہا، یہاں تک کہ سلطنت عثمانیہ کی ابھرتی ہوئی طاقت نے حلب کے قریب مرج دابق کے میدان میں 1516 میں مملوکوں کو شکست دی، اور شام براہ

راست عثمانی خلافت کے ماتحتی میں آ گیا۔ عثمانی دور میں شام میں حلب، سوریا (دمشق)، بیروت، لبنان اور قدس (فلسطین) پانچ صوبے تھے۔

1.5.2 فرانسیسی استعمار

پہلی جنگ عظیم کے دوران 1916 میں جب عربوں نے سلطنت عثمانیہ کے خلاف بغاوت کی، اور ترکوں کو شکست ہوئی تو یہ ممالک عثمانی خلافت سے علیحدہ ہوئے، اور ملک فیصل بن حسین کی حکومت قائم ہوئی، جلد ہی یوروپی اقوام نے اپنے خفیہ معاہدہ کے تحت بندر بانٹ کے ذریعہ ان علاقوں کو تقسیم کر لیا، 24 دسمبر 1920 کو فرانسیسی دمشق میں داخل ہوئے، اور انہوں نے سائکس بیکو معاہدہ کے تحت بلاد شام کو چار ملکوں میں تقسیم کر دیا، حالاں کہ یہاں کی تہذیب، رسم ورواج، مذہب، زبان اور تاریخ سب کچھ ایک تھا۔ لبنان اور شام پر انتداب کے نام سے فرانس کا قبضہ ہوا، اور فلسطین برطانیہ کے حصہ میں آیا، تا کہ وہ اسے لقمہ تر بنا کر یہودیوں کو پیش کر دے۔ 1920 میں فرانس نے شام کو فرقوں کے اعتبار سے مزید چھ ریاستوں میں تقسیم کر دیا، یعنی، مملکت حلب، مملکت دمشق، مملکت علویہ، مملکت لبنان، مملکت دروز، اور ریاست اسکندرون۔ ان میں سے ہر ایک کی راجدھانی، سکہ، حکومت، پارلیمنٹ، قومی دن، مالی امور اور ڈاک کے ٹکٹ وغیرہ سب علیحدہ کر دئے، لیکن قوم کی شدید مخالفت کی بنا پر 1922 میں ایک مرکزی (فیڈیرل) نظام کے تحت مملکت حلب، مملکت دمشق، مملکت علویہ کو آپس میں جوڑ دیا۔ شامیوں میں آزادی کی لہر اٹھنے لگی، 1925 میں انہوں نے فرانس کو نکال باہر کرنے کے لئے لڑائی لڑی، اس کے بعد فرانسیسی انتداب سے آزادی کی کوششیں تیز ہوتی گئیں، 1930 میں فرانسیسیوں سے بات چیت کر کے شامیوں نے نیا دستور بنایا، جس میں سوریا کو جمہوریہ سوریہ کا نام دیا گیا، نیا علم تیار ہوا، پھر 1936 میں آزادی کے متوالوں نے سوریا کے تمام صوبوں کی مکمل آزادی کا مطالبہ کیا، ایک وفد ہاشم اتاسی کی سرکردگی میں پیرس گیا، جس نے ایک فرانس سے نیا معاہدہ کیا، اس کے تحت دیرہ زور اور لاذقیہ کی مملکتوں کو جمہوریہ سوریہ میں انضمام کی اجازت دی گئی۔ اس کے بعد شام میں موجود تاج الدین حسینی کی قومی حکومت کو ختم کر کے ہاشم اتاسی کی سرکردگی میں نئی حکومت بنی، لیکن جلد ہی فرانس نے اس معاہدہ کی خلاف ورزی کا اعلان کیا۔ 1939 میں فرانس نے اپنے نمائندہ کو دمشق بھیجا، جس نے شام کو دوبارہ انتداب کے معاہدہ کے تحت لانے اور براہ راست پیرس کی ماتحتی میں آنے کا اعلان کیا۔ اور تمام معاہدات کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ قومی حکومت ختم کر دی گئی، لاذقیہ اور جبال عرب کو دوبارہ جمہوریہ سوریہ سے الگ کر دیا گیا، اسی دوران دوسری عالمی جنگ کا آغاز ہوا، 1945 میں فرانس نے اپنے توپ خانہ کے ساتھ شام پر حملہ کر دیا، قتل وغارت گری اور لوٹ مار کا بازار گرم ہوا، سیکڑوں قتل اور ہزاروں زخمی ہوئے، شامیوں نے بے مثال پامردی کا مظاہرہ کیا، جنگ کے بعد عالمی برادری نے شام اور لبنان کے معاملات میں دلچسپی لی، سوریا اور لبنان نے 1946 میں فرانسیسی انتداب کے مسئلہ کو مجلس اقوام میں پیش کیا، سوویت یونین، چین اور امریکہ نے اس کے حق میں ووٹ ڈالا، اور مجلس اقوام کے نمائندوں نے جلد از جلد تمام غیر ملکی طاقتوں کے خروج کا فیصلہ کیا، اور 17 اپریل 1946 کو تمام غیر ملکی افواج کا اخراج عمل میں آیا، اور یہی دن قومی دن قرار پایا۔

1.5.3 سوریا جدید دور میں

فرانس کے اخراج کے بعد یہاں مقامی حکومت قائم ہوئی، 1952 میں فرانس سے تمام تر تعلقات ختم ہو گئے، 1958 کا سال سوریا

کی تاریخ میں بے حد اہم ہے، جب کہ شامی صدر شکری قوتلی اور نے عالم عربی کے اتحاد کے لئے صدارت سے دست کش ہو کر مصر سے شام کا الحاق کیا، اور جمال عبد الناصر جمہوریہ متحدہ عربیہ کے صدر قرار پائے، لیکن سیاسی واقتصادی اسباب ومصالح کی بنیاد پر 1961 میں یہ اتحاد ختم ہو گیا، اور دمشق میں فوجی انقلاب نے جگہ لے لی۔ اور جمہوریہ عربیہ سوریہ کے نام سے نئی فوجی حکومت نے کام کرنا شروع کیا۔

مارچ 1963 سے یہاں پر حزب البعث العربی الاشتراکی کی حکومت ہے، 1970 میں اس کی قیادت حافظ الاسد نے سنبھالی، اور 1971 سے 2000 تک ملک کے صدر کی حیثیت سے حکومت کی، یہ قیادت اشتراکیت کی طرف مائل ہے، اس کا مقصد قومیت عربیہ کی بنیاد پر اشتراکیت کو فروغ دینا، اور اشتراکی حکومتی نظام قائم کرنا ہے، 2000 میں حافظ کی وفات کے بعد اس کے لڑکے بشار الاسد نے حکومت سنبھالی، 5 مارچ 2011 کو بہار عرب کے اثرات سے متاثر ہو کر سوریا میں بھی ظالم و جابر نظام کے خلاف عوامی مخالفت کی شدید لہر اٹھی، جس نے حکومت اور نظام کو مختل کر دیا، عوام نے بشار الاسد کے استعفا کا مطالبہ کیا، لیکن حکومت نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا، اور اس طرح خانہ جنگی شروع ہو گئی، جو ابھی تک جاری ہے۔

موجودہ سوریا کا رقبہ 185,180 مربع کیلو میٹر ہے، یہاں چودہ صوبے ہیں، راجدھانی دمشق ہے، بیس بڑے شہر ہیں، حلب اور اس کے بعد دمشق کی آبادی سب سے زیادہ ہے۔ شمال میں ترکی، مشرق میں عراق، جنوب میں اردن اور مغرب میں فلسطین اور لبنان اور بحر متوسط ہے، ساحل لاذقیہ، طرطوس اور بانیاس میں ہے، آبادی 2,25,30,746 افراد پر مشتمل ہے، جن میں سنی 63 فیصد، علوی شیعہ 12 فیصد، مسیحی 10 فیصد، کردی 9 فیصد، درزی 3 فیصد، اور بقیہ اقلیتیں 3 فیصد ہیں، جن میں اسماعیلی، صابئی وغیرہ ہیں۔ یہاں کے سکہ کو لیرہ کہا جاتا ہے، اور عربی یہاں کی سرکاری زبان ہے، غیر ملکی زبانوں میں فرانسیسی اور انگریزی بڑے پیمانہ پر بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ سوریا میں سات حکومتی یونی ورسٹیاں اور سولہ نجی یونیورسٹیاں ہیں، ابتدائی تعلیم لازمی ہے اور حکومت کی جانب سے مفت فراہم کی جاتی ہے۔

1.5.4 اہم شخصیات

ملک شام ابتدا ہی سے علوم وفنون کا مرکز رہا ہے، اسلامی دور میں یہاں بے شمار باکمال ہستیاں پیدا ہوئیں، جن میں امام اوزاعی، سلطان العلماء عز الدین بن عبد السلام، ابن نفیس، ابن ابی اصیبعہ، ابن صلاح، امام ابن تیمیہ، امام ذہبی، سبکی، ابن جماعہ، ابن قیم الجوزیہ، ابن شامہ، ابن عبد الہادی، ابن خلکان، ابن عساکر، ابن کثیر امام سخاوی، ابن عابدین شامی، وغیرہ عظیم علما گذرے ہیں جن کے نقوش جریدہ عالم پر ثبت ہو چکے ہیں۔

شام میں موجودہ دور میں علمی ترقی، شیخ بدر الدین حسنی، جمال الدین قاسمی، خیر الدین زرکلی، نزار قبانی، عمر رضا کحالہ، محمد کرد علی، محمود شاکر، سراج الدین الحسینی، سعید رمضان، شعیب ارناط، حسن حبنکہ وغیرہ کے ذریعہ ہوئی ہے، محمد کرد علی نے المجمع العلمی العربی دمشق کی بنیاد رکھی، المقتبس نامی پرچہ جاری کیا، خطط الشام کے نام سے شام کی تاریخ پر ایک جامع کتاب تصنیف کی، اس کے علاوہ تاریخ الحضارہ، الاسلام والحضار الغربیہ جیسی اہم کتابیں تصنیف کیں، وہ علمی ترقی کے ستونوں میں سے ہیں۔ علی طنطاوی کا تعلق بھی ملک شام سے ہے، جنہوں نے زندگی کا اکثر حصہ سعودی عرب میں گذارا، وہ مفتی، فقیہ، ادیب اور مفسر قرآن تھے، ان کی کتابوں میں ذکریات، رجال من

التاریخ، تعریف عام بدین الاسلام وغیرہ ہیں۔ خیر الدین زرکلی مشہور مؤرخ اور ادیب وشاعر ہیں، انہونے نے اپنی مشہور موسوعی کتاب الاعلام ترتیب دی، جو عربی واسلامی کتب خانہ میں اہم اضافہ ہے، نزار قبانی دور جدید کے اہم شاعر ہیں۔ شیخ عبد الفتاح ابو غدہ حدیث وتاریخ میں گہری بصیرت رکھتے ہیں، انہوں نے ہندوستان کا سفر بھی کیا، علمائے ہند سے بے حد متاثر تھے اور ہندوستان کے اہل دانش سے محبت کرتے تھے، انہوں مشہور لکھنوی عالم شیخ عبد الحیی حسنی کی کئی کتابوں کو تحقیق وتعلیق کے ساتھ عالم عرب سے شائع کیا ہے، جن میں الاجوبہ الفاضلہ ، الرفع والتکمیل اور دوسری اہم کتابیں شامل ہیں، شیخ عبد الفتاح کی وجہ سے ہندوستان کے علما کا عالم عرب میں تعارف ہوا ہے۔ مصطفی سباعی موجودہ دور کے اہم علما میں ہیں، جو حمص میں پیدا ہوئے، مصر میں اخوان المسلمین سے وابستہ ہوئے، میں المنار نامی جریدہ جاری کیا، ان کی مشہور کتابوں میں شرح قانون الاحوال الشخصیہ، من روائع حضارتنا، المرأۃ بین الفقہ والقانون، السنہ ومکانتہا فی التاریخ الاسلامی، الاستشراق والمستشرقون وغیرہ کتابیں ہیں۔ علامہ جمال الدین قاسمی دمشق میں پیدا ہوئے، ان کی سو سے زائد تصنیفات ہیں، جن میں قرآن مجید کی تفسیر محاسن التاویل کے نام سے، قواعد التحدیث، میزان الجرح والتعدیل، تعطیر الشام وغیرہ ہیں۔ محمود شاکر مشہور مؤرخ اور محقق ہیں، دو سو سے زائد تصنیفات ہیں، جن میں موسوعہ التاریخ الاسلامی 22 جلدوں میں، سلسلہ العالم الاسلامی، سلسلہ مواطن الشعوب الاسلامیہ کے تحت کئی کتابیں ہیں۔ ڈاکٹر وہبہ زحیلی بھی شام کے عظیم عالم ہیں، انہوں نے جن عناوین اور موضوعات کے تحت قلم اٹھایا ہے، ان کی تعداد 500 تک پہونچتی ہے، فقہ، اصول فقہ اور تفسیر تو آپ کا اختصاص ہیں، ڈاکٹر بدیع اللحام نے آپ کی چھوٹی بڑی تصنیفات، کتب ورسائل کی جملہ تعداد ایک سو تیس لکھی ہے، جن میں موسوعۃ الفقہ الاسلامی وادلتہ، التفسیر المنیر، موسوعۃ الفقہ الاسلامی المعاصر جیسی انسائکلوپیڈیائی کتابیں بھی ہیں، اور چھوٹے چھوٹے رسائل بھی، کئی کتابوں کا دیگر زبانوں مثلا اردو، انگریزی، فرانسیسی، ترکی اور ملیشیائی میں ترجمہ ہوا ہے۔

1.5.5 شام کی معروف تحریکات اور ادارے

اخوان المسلمین

مصر میں اخوان المسلمین کی تحریک کے آغاز کے ساتھ ہی اس نے عالم عرب کے تمام ممالک کو متاثر کیا، اور شام میں بھی ان کی شاخ قائم ہوئی، اخوان نے یہاں کے تعلیمی اور دینی معیار کو بلند کیا۔ اور سماجی وعلمی، سیاسی سطح پر پورے شام پر اثر انداز ہوئے؛ لیکن جلد ہی فوجی حکومت نے اس کی سرگرمیوں پر پابندی لگادی، اور اس کے ارکان کو قید وبند میں ڈال دیا، ان میں شیخ مصطفی سباعی، شیخ طنطاوی، عبد الفتاح ابو غدہ اور دیگر اخوان نے مصائب برداشت کئے۔

الجمعیۃ الغرا

شیخ علی دقر اور شیخ بدر الدین حسنی نے 1914 میں اس اکیڈمی کی بنیاد ڈالی، اس کے ابتدائی صدر شیخ محمد ہاشم الخطیب تھے، انہوں نے دمشق میں علمی سرگرمیوں کو عام کرنے کے لئے کئی مدارس قائم کئے، جن میں روضہ الحیا، زہر الحیا، بچیوں کے لئے، اور سعادۃ الابنائ، وقایۃ الابناء اور ہدایہ الابناء لڑکوں کے لئے قائم کئے، اسی جمعیت کے قائم کئے ہوئے مدارس سے شیخ حسن حبنکہ، شیخ عبد الوہاب الحافظ اور شیخ

عبد الکریم رفاعی جیسے کبار علما پیدا ہوئے۔

جمعیۃ الفتح الاسلامی

اس ادارہ کی بنیاد شیخ صالح فرفور نے ڈالی تھی، جس نے تعلیمی اور سماجی اصلاح کو اپنا مقصد بنایا تھا،1956 میں اس کو منظوری حاصل ہوئی،اس ادارے نے معہد الفتح الاسلامی نامی ادارہ قائم کیا،اس کے تحت تمام مراحل میں دینی تعلیم فراہم کی جاتی ہے،اس وقت اس کی ایک اور شاخ معہد الشام العالی کے نام سے قایم ہوئی ہے۔

جمعیت ابو النور

اس ادارے کی بنیاد شیخ محمد امین کفتارو نے قاسیون پہاڑ کے دامن میں ڈالی تھی،ان کے فرزند شیخ احمد کفتارو نے والد کے بعد اس کی ذمہ داری سنبھالی،1964 میں شیخ کفتارو کو شام کا مفتی عام بنایا گیا تھا۔احمد کفتارو نے اس ادارے کو بہت ترقی دی،ابتدا میں اس کے تحت 1949 میں معہد الانصار کے نام سے ثانویہ قائم کیا،اور 1964 میں لڑکیوں کئے معہد بدر قائم کیا،اور 1970 میں مجمع کفتارو قایم کیا،یہ دینی تعلیمی ادارہ ہے،اس کے تحت ابتدائیہ سے ڈاکٹریٹ تک کی تعلیم دی جاتی ہے،اس میں ایک دار الایتام بھی قائم ہے۔

المجمع العلمی العربی دمشق

1919 میں اس ادارے کی بنیاد میں رکھی گئی،اس کے صدر محمد کرد علی تھے،اور امین سوید،سعید کرمی،عیسی معلوف،عبد القادر مغربی اور طاہر الجزائری جیسے مشاہیر اس سے وابستہ تھے،اس ادارے کے اغراض ومقاصد میں عربی زبان پر غور کرنا،اس کو موجودہ زمانہ کی ضرورتوں سے ہم آہنگ کرنا،مخطوطات کی تحقیق،جدید علوم وفنون کی کتابوں کا ترجمہ ،اصطلاحات وضع کرنا،آثار قدیمہ پر توجہ دینا شامل تھا۔اس ادارے نے اپنا ایک مجلہ جاری کیا،جو عالم عرب کے موقر جرائد میں شمار کیا جاتا ہے،اس کا پہلا پرچہ جنوری 1921 میں شائع ہوا،ابتدا میں ماہانہ تھا،اس کے بعد سہ ماہی ہو گیا،مجمع اللغۃ العربیہ نے فصیح عربی زبان کی ترویج کے لئے محاضرات اور دروس کا اہتمام کیا،اور عربی زبان وادب کی خدمت کی۔

دار الکتب الظاہریہ

دمشق کا سب سے بڑا مخطوطات کا مرکز،جو مملوکی سلطان ظاہر بیبرس کے قائم کردہ مدرسہ میں 1296 مطابق 1879 میں قائم کیا گیا،اس کی بنیاد شیخ طاہر الجزائری نے رکھی،اس میں بارہ ہزار مخطوطات ہیں،اور 65000 مطبوعات ہیں۔یہ کتب خانہ دنیا کے مشہور ترین اور نادر مخطوطات کے مراکز میں سے ہے،بڑے بڑے علمائے عصر نے یہاں سے استفادہ کیا ہے،اس کتب خانہ میں دمشق کے مختلف اداروں اور علمی گھرانوں سے مخطوطات جمع کئے گئے،جن میں مکتبہ عمریہ ،مکتبہ عبد اللہ باشا،مکتبہ عثمان کردی،خانقاہ سمیساطیہ کا مکتبہ وغیرہ شامل ہیں۔دمشق میں مکتبہ الاسد کے قیام کے بعد یہ کتب خانہ اسی میں ضم کر دیا گیا۔

1.6 اردن

ملک شام کے جنوب میں واقع عربی مملکت ہے، جس کے جنوب میں سعودی عرب، مشرق میں عراق اور مغرب میں فلسطین واقع ہے۔ملک کی مغربی سرحد پر ایک نہر اردن کے نام سے بہتی ہے، جس کی نسبت سے اس ملک کا نام اردن پڑا، دار الحکومت عمان ہے، اور عربی سرکاری زبان ہے، غیر ملکی زبانوں میں انگریزی زیادہ بولی اور سمجھی جاتی ہے، کے اعداد و شمار کے مطابق اردن کی آبادی 57 لاکھ ہے، جن میں سنی 92 فیصد، مسیحی 6 فیصد، دروزی 2 اور دیگر باقی دیگر اقلیتیں ہیں۔ مملکت کا رقبہ 92300 مربع کلو میٹر ہے، یہاں کے سکہ کو اردنی دینار کہا جاتا ہے۔

ملک عبد اللہ بن حسین نے اس مملکت کی بنیاد برطانیہ کی مدد سے 1921 میں ڈالی تھی، یہ ملک ابتدا میں فلسطین کے برطانوی انتداب کے تابع تھا، اور 1946 میں آزاد ہوا، 25 مئی کو یوم آزادی منایا جاتا ہے، ملک عبد اللہ کا شجرہ نسب ہاشمی خاندان سے ملتا ہے، اس وجہ سے اس مملکت کو المملکہ الاردنیہ الہاشمیہ کہا جاتا ہے۔ اردن میں دستوری بادشاہت کا نظام قائم ہے، 1952 میں ملک حسین معظم بادشاہ بنے، ان کی وفات کے بعد 1999 میں ملک عبد اللہ ثانی سریر آرائے سلطنت ہوئے، جو افواج کے سربراہ اعلی بھی ہیں۔ بادشاہ وزرا کی 55 رکنی کمیٹی کو مقرر کرتے ہیں، جو 110 ارکان پر مبنی مجلس نائبین کے سامنے جوابدہ ہوتی ہے۔

1.7 لبنان

جمہوریہ لبنان شرق اوسط میں واقع عربی ملک ہے، جس کے شمال اور مشرق میں سوریا، جنوب میں فلسطین، اور مغرب میں بحر متوسط ہے، یہ ملک مختلف فرقوں کی آماج گاہ ہے، اکثر آبادی عربوں مشتمل ہے، جن میں مسلمان اور مسیحی بڑی تعداد میں ہیں، لبنان کی آبادی 4259000 ہے، جس میں 59 فیصد مسلمان، 41 فیصد مسیحی ہیں، ان کے علاوہ درزی اور دیگر اقلیتیں بھی رہتی ہیں۔

لبنان تاریخ میں شام کا حصہ رہا ہے، جدید لبنان کی تاریخ 1920 سے شروع ہوتی ہے، جب کہ فرانس کے حملہ کے بعد مملکۃ لبنان الکبیر کا اعلان کیا گیا، اور بیروت کو اس کا دار الحکومت بنایا۔ 1926 میں جمہوریہ لبنان کا قیام عمل میں آیا، جو موجودہ لبنان کی تاریخ کا نقطہ آغاز ہے، مسلمانوں نے اس تقسیم کی مخالفت کی تھی، کیوں کہ اس میں وہ اقلیت میں آگئے تھے، ایک عرصہ تک دیگر پڑوسی ممالک کی طرح یہاں بھی فرانسیسی انتداب رہا، اور 1946 میں اس کی آزادی عمل میں آئی، آزادی کے فورا بعد ہی اس نوزئدہ مملکت کو 1948 میں اسرائیل سے جنگ میں حصہ لینا پڑا، یہ لڑائی 1949 میں اختتام کو پہونچی، اور عرب ممالک اور اسرائیل کے درمیان معاہدہ ہوا۔ 1982 میں اسرائیل نے لبنان پر حملہ کیا، تاکہ وہاں سے ہونے والے فلسطینی حملوں کو روکے، یہ جنگ معاہدہ پر ختم ہوئی۔ 2000 میں ایہود باراک نے لبنان پر حملہ کیا، لیکن حزب اللہ نے ان کو واپس جانے پر مجبور کر دیا۔ لبنان میں موجود مختلف فرقوں کی وجہ سے یہاں اکثر داخلی انتشار رہتا ہے، لیکن اس کے باوجود عالم عربی میں اس کو علمی اور ثقافتی اہمیت حاصل ہے، عربی ادب کے فروغ میں یہاں کے ادبا نے عظیم خدمات انجام دیں ہیں، بیروت میں واقع جامعہ امریکیہ سے عالم عرب کے مشاہیر نے تعلیم حاصل کی ہے۔

1.8 لبنان کی اہم تحریک حزب اللہ

حزب اللہ لبنان کی ایک سیاسی اور عسکری تنظیم ہے، جو لبنان پر 1982 کے حملہ کے بعد قائم کی گئی، اس کی تاسیس میں محمد حسین فضل اللہ، عباس موسوی اور راغب حرب شریک تھے، موجودہ قیادت حسن نصر اللہ کی ہے، 2000 اور 2006 میں اس نے اسرائیل کے خلاف سخت مقابلہ کیا۔ شیعہ تنظیم ہونے کی وجہ سے ایران سے اس کو کافی تعاون حاصل ہوتا ہے، اس تنظیم نے عسکری قوت کے علاوہ سماجی تعلیمی، اور مسلمانوں کی فلاح وبہودی کے لئے بھی اپنی شاخیں قائم کر رکھی ہیں۔

1.9 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- اس اکائی کے مطالعہ سے ہم نے جانا کہ مغربی ایشیا کے ملکوں سے مراد خلیج عرب کے ممالک یعنی سعودی عرب، بحرین، کویت، عمان، یمن، ملک شام، اردن اور لبنان ہیں، ان ریاستوں کو ابتدائے اسلام سے بڑی اہمیت حاصل رہی ہے، کیوں کہ یہاں کے باشندے آغاز ہی میں اسلام میں داخل ہوگئے تھے۔
- بیسویں صدی میں خلافت عثمانیہ کی شکست وریخت کے بعد ان ممالک پر برطانیہ اور فرانس نے قبضہ کرلیا، دوسری جنگ عظیم کے بعد پانچویں اور ساتویں دہائی میں ان ریاستوں کو انتداب سے آزادی ملی۔
- خلیج عرب کے ممالک میں تیل کی دریافت نے ترقی کی رفتار تیز کردی، معاشی اور تعلیمی ترقی میں بہتری آئی، البتہ سیاسی اور سماجی بیداری میں عموما شعور بیدار نہیں ہے، اور خاندانی بادشاہت کے نظام میں سب جکڑے ہوئے ہیں۔ شام میں اگرچہ جمہوری حکومت ہے، لیکن وہ بھی ایک ہی خاندان سے مربوط ہے۔
- موجودہ دور میں بہار عرب سے متاثر ہونے کے نتیجہ میں ان ممالک میں بھی عوامی تحریکیں اٹھیں، لیکن خلیجی ممالک میں ان کو زر کی طاقت سے دبادیا گیا، لیکن یمن اور شام ابھی تک خزاں کے موسم سے باہر نہیں آسکے۔

1.10 نمونہ امتحانی سوالات

1.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. جزیرہ نما عرب کس براعظم میں واقع ہے؟

(a) ایشیاء (b) یورپ (c) جنوبی افریقہ (d) شمالی افریقہ

2. مکہ اور مدینہ کس عرب ملک کا حصہ ہیں؟

(a) سعودی عرب (b) متحدہ عرب امارات (c) یمن (d) فلسطین

3. سعودی عرب میں کس خاندان کی حکومت ہے؟

(a)ل سعود (b)آل ہاشم (c)آل خلیفہ (d)آل سعید

4. کس ملک کی اہمیت یہ ہے کہ اسے مسلم دنیا میں دنیوی اور روحانی دونوں طرح کی سیادت حاصل ہے؟

(a)سعدوی عرب (b)شام (c)یمن (d)دبئی

5. یمن کے کس سمت میں سعودی عرب میں واقع ہے۔

(a)شمال (b)جنوب (c)مغرب (d)مشرق

6. اللہ کے رسول ﷺ نے معاذ بن جبل کو کہاں کا گورنر بنایا تھا؟

(a)یمن (b)سعودی عرب (c)بحرین (d)قطر

7. بہار عرب کا آغاز کب ہوا؟

(a)2011 (b)2020 (c)2024 (d)سب غلط

8. عمان کس مملکت کا دارالحکومت ہے؟

(a)اردن (b)لبنان (c)قطر (d)دبئی

9. لبنان کا دارالحکومت-------------ہے

(a)دمشق (b)بیروت (c)اردن (d)قاہرہ

10. حزب اللہ کس ملک کی سیاسی اور عسکری تنظیم ہے، جو1982 کے حملہ کے بعد قائم کی گئی

(a) لبنان (b)شام (c)ایران (d)سعودی عرب

1.10.2 مختصر جوابی سوالات

1. ملک شام کی اہم شخصیات اور اداروں کے بارے میں گفتگو کیجئے۔
2. لبنان اور اردن کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں، تحریر کیجئے۔
3. سعودی عرب کے احوال پر ایک تبصراتی نوٹ تحریر کیجیے۔
4. عرب بہاریہ سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟ اس کے اسباب و نتائج پر روشنی ڈالیے۔
5. خلیج عرب میں تیل کی دریافت کے نتائج پر روشنی ڈالیے۔

1.10.3 طویل جوابی سوالات

1. سعودی عرب میں آل سعود کی حکومت کا جائزہ لیجئے۔

2. قطر اور کویت کے نظام حکومت اور ان ملکوں کی سماجی بیداری پر گفتگو کیجئے۔

3. یمن کے بارے میں اپنی معلومات قلم بند کیجئے۔۔

1.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ : ثروت صولت مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی

2. الاستیطان الاجنبی فی الوطن العربی : ڈاکٹر عبد المالک خلف التمیمی عالم المعرفہ۔1978

3. الدیمقراطیہ فی العالم العربی : المؤسسہ الدولیہ للدیمقراطیہ والانتخابات لبنان، 2003-2004

4. الموسوعۃ الموجزہ، الدرر السنیہ، فضائل الشام : عبد الکریم سمعانی، دار الثقافہ العربیہ، دمشق، 1992

5. خطط الشام : محمد کرد علی، مکتبہ نوری، دمشق، 1983

6. Over view of civil Society in the Arab world : Mervat Rishmawi with Tim Morris, INTRAC Oct. 2007

اکائی 2: شمالی افریقہ اجمالی تعارف

اکائی کے اجزا:

2.0 تمہید

2.1 مقاصد

2.2 شمالی افریقہ وجنوبی افریقہ کے اہم مسلم ملکوں کا اجمالی تعارف

2.2.1 مصر

2.3 سوڈان

2.3.1 تیونس

2.4 لیبیا

2.0 تونس

2.1 الجزائر

2.2 مراکش

2.2.1 نائجیریا

2.2.2 موریتانیہ

2.3 جمہوریہ مالی

2.4 اکتسابی نتائج

2.5 کلیدی الفاظ

2.6 نمونہ امتحانی سوالات

2.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

2.6.2 مختصر جوابی سوالات

2.6.3 طویل جوابی سوالات

2.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

2.0 تمہید

شمالی افریقہ اور مغربی افریقہ میں بہت سارے اسلامی ممالک واقع ہیں۔ان میں سے بعض ممالک مثال کے طور پر مصر، مراکش اورالجزائر جیسے ملک ہیں جنہوں نے اسلامی تاریخ میں بڑازبردست کرداراداکیاہے۔اور مصر آج بھی عالم عرب کاسب سے زیادہ ترقی یافتہ، موئثراوراہم ترین ملک ہے۔اس اکائی میں ہم ان تمام ملکوں کے بارے میں پڑھیں گے اور کوشش کی جائے گی کہ ان کے سلسلہ میں تازہ ترین معلومات طلبہ کو دی جاسکے۔۔

2.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ اس اکائی کو پڑھنے کے بعد طلبہ کوافریقہ کے دونوں مسلم خطوں شمالی افریقہ اور مغربی افریقہ کے بارے میں اجمالی معلومات حاصل ہوجائیں گی۔وہ ان کے امکانات ووسائل،مسائل اوراحوال سے باخبر ہوسکیں گے۔

2.2 شمالی افریقہ وجنوبی افریقہ کے اہم مسلم ملکوں کا اجمالی تعارف

شمالی افریقہ

2.3 مصر

مصر آبادی اوراپنے وسائل کے لحاظ سے عرب دنیاکاسب سے بڑااور معاشی، فکری، عقلی وتمدنی اعتبارسے سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک ہے۔اس میں کوئی نظریہ یاتحریک اٹھتی ہے تواُس کے اثرات ساری دنیائے عرب میں محسوس کیے جاتے ہیں۔ مصر عربوں اور عربی زبان کی نشاۃ ثانیہ کا بھی مرکزہے۔سب سے پہلے جدید بیداری یہیں آئی تھی۔اس کے بعد اس کے شعلے دوسرے عرب ملکوں میں پہنچے۔اُسی طرح مذہبی ودینی بیداری کا نقیب بھی مصرہی مسلم دنیااورخاص عرب ملکوں میں رہاہے۔مصراسلامی تاریخ میں بھی ایک زبردست کرداراداکرتارہاہے۔ آبادی سات کروڑسے زیادہ ہے۔عربی یہاں کی زبان ہے اور سرکاری مذہب اسلام۔ویسے دوسری اقلیتیں خاص کر قبطی عیسائی معاشی وسیاسی طور پر بہت مضبوط ہیں۔

مصر کی جدید تاریخ اس کے خدیووالی محمد علی پاشاسے شروع ہوتی ہے۔جو خلافتِ عثمانیہ کی طرف سے 1805 میں مصر کا والی مقرر کیا گیا تھا۔البتہ بعض جدید اصلاحات فرانسیسیوں نے اپنے دور میں شروع کردی تھیں جن کو محمد علی نے جاری رکھا۔رفتہ رفتہ محمد علی نے

خاصی طاقت حاصل کرکے اپنی بادشاہت قائم کرلی، تاہم آئینی طور پر اُس نے عثمانی خلافت کی بالادستی قبول کیے رکھی۔ محمد علی نے نئی تعلیم کے اسکول کھولے، فوجی ٹریننگ کے ادارے کھولے، بعض طلبہ کو گورنمنٹ کے خرچ پر فرانس اعلی تعلیم کے لیے بھیجا۔ اخبارات شروع کرائے۔ فرانس والوں کے قائم کردہ مطابع کو ترقی دی، زرعی اصلاحات کیں وغیرہ۔ محمد علی کی اولاد 1882 تک حکمراں رہی۔ اس کے بعد مصر پر برطانیہ کا تسلط قائم ہو گیا جس نے بادشاہت کو برقرار رکھا لیکن ملک کے اصل اختیارات اس کے ریزیڈنٹ کے ہاتھ میں ہوتے تھے۔

برطانوی تسلط 1922 تک جاری رہا۔ برطانیہ نے بھی اپنے کپڑے کے کارخانوں کے لیے خام مال پیدا کرنے کے لیے مصر میں زرعی ترقی پر زور دیا۔ اسوان ڈیم نیل پر تعمیر کرایا، نہر سوئز بنائی گئی جو مصر کی معیشت میں بڑا رول ادا کرتی ہے۔ روئی اور گنے کی کاشت پر توجہ دی گئی۔ صحافت اور جدید ادب کا ارتقا ہوا۔ جدید عربی ادب کے ارکان اربعہ محمود سامی بارودی، احمد شوقی، حافظ ابراہیم بک، مطران خلیل اسی دور میں تھے۔ برطانوی دور میں سوڈان جو محمد علی کے زمانہ میں مصر کا ہی حصہ تھا، الگ ملک بن گیا۔ اسی زمانہ میں مصر میں انگریزوں نے قبطی عیسائیوں کو بہت آگے بڑھایا وہ آج بھی مصر میں تعلیمی واقتصادی میدان میں اجارہ دار بنے ہوئے ہیں۔

اسی زمانہ میں مصر کے اندر سیاسی و دینی بیداری آئی۔ سید جمال الدین افغانی اوران کے شاگرد مفتی محمد عبدہ نے مصر کے کلچر اور دینی شعور پر گہرا اثر ڈالا۔ محمد عبدہ کے شاگردوں مصطفی کمال، سعد زغلول، قاسم امین، رشید رضا، طٰہٰ حسین، فرید وجدی وغیرہم نے اس تحریک کو آگے بڑھایا۔ سعد زغلول نے وفد پارٹی قائم کی جو حکومت میں شامل ہوئی۔ عرابی پاشا نے انگریزوں سے آزادی کی مہم شروع کی جس میں وفد پارٹی نے بھی اپنا رول ادا کیا۔ سعد زغلول کئی مرتبہ قید کیے گئے۔ مگر ملک میں ان کو اوران کے ساتھیوں کو عمومی حمایت حاصل ہوگئی تھی۔ مارچ 1922 کو برطانیہ نے مصر کو آزادی دی۔ جنوری 1924 میں مصری پارلیمنٹ کے پہلے انتخابات ہوئے جس میں وفد پارٹی کو زبردست کامیابی ملی اور سعد زغلول ملک کے پہلے وزیر اعظم بن گئے۔ مصر میں ابھی تک روایتی بادشاہت قائم تھی' جس کے آخری بادشاہ شاہ فاروق تھے۔ ان بادشاہوں کے طور طریق آمرانہ تھے' یہ اصلاحات میں روڑے اٹکاتے تھے۔ پھر مصر میں تعلیم اور جدید کلچر کی وجہ سے اب لوگوں میں جمہوری شعور بیدار ہو چکا تھا اس لیے حکمراں وفد پارٹی اور شاہ فاروق کے درمیان کشمکش شروع ہوگئی۔

اسی درمیان ایک دینی اصلاحی تنظیم الاخوان المسلمون تیزی سے اٹھی اور اپنے انقلابی لب ولہجہ سے مصر کے عوام میں مقبولیت حاصل کرنے لگی۔ اس تحریک کو امام حسن البنا شہید نے 1928 میں مصر کے شہر اسماعیلیہ میں قائم کیا تھا۔ حسن البنا ایک روحانی آدمی تھے انہوں نے اس تحریک میں دعوت و تبلیغ اور تصوف و شریعت، سلفیت و سیاست سب کو یکجا کرنے کی کوشش کی۔ ساتھ ہی یہ تحریک بڑے پیمانہ پر رفاہی سرگرمیاں انجام دیتی تھی۔ اس کا ہدف مصر میں اسلامی حکومت کا قیام تھا۔ فلسطین میں اپنے جہاد اور غریبوں وناداروں کی خدمت کی بدولت اور اپنے پرکشش نعروں کی وجہ سے جلد ہی یہ تحریک پورے مصر میں پھیل گئی۔ اور وہاں سے نکل کر مشرق میں فلسطین، شام، اردن، اور مغربی افریقہ میں الجزائر و مراکش اور جنوب میں سوڈان کی جانب پھیلنے لگی۔ جلد ہی اس کے اثرات عالمی ہوگئے۔ 1930 کے عشرہ میں اخوان نے سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا۔ اسی درمیان تقسیم فلسطین کا المیہ پیش آیا، مصر میں برطانوی فوجیں

ابھی تک موجود تھیں۔ اور برطانیہ کی یہود نواز پالیسیوں کی وجہ سے عوام میں سخت اشتعال پیدا ہو رہا تھا۔ مصری سیاست ڈانواڈول تھی۔ معیشت کا برا حال تھا۔ ان حالات کے رد عمل میں 1952 میں مصر کے اندر جنرل نجیب کی قیادت میں ایک فوجی انقلاب آگیا اور مصر کا ایک بالکل نیا دور شروع ہو گیا۔

اس فوجی انقلاب کا ساتھ اخوان المسلمون نے بھی دیا تھا۔ انقلاب کے بعد شاہ فاروق کو معزول کر دیا گیا' وہ سوئٹزرلینڈ چلے گئے۔ بظاہر انقلاب کی قیادت جنرل نجیب نے کی تھی لیکن اُس کے اصل محرک جنرل جمال عبد الناصر تھے جنہوں نے موقع ملتے ہی جنرل نجیب کو کنارہ کر دیا اور حکومت کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لی۔ انہوں نے شروع میں اخوان کو اپنے ایجنڈے کے لیے راضی کرنا چاہا' جب اخوان کی طرف سے مزاحمت ہوئی تواُن کو سختی سے کچل دیا۔ ان کے دور میں اخوان المسلمون پر بے پناہ مظالم کیے گئے ، سید قطب ، عبد القادر عودہ اور دوسروں کو پھانسیاں دی گئیں۔ اخوان کالعدم قرار دی گئی۔ جائیدادیں ضبط، اور اس کے ہزارہا افراد و کارکنوں کو جیلوں میں سڑا دیا گیا۔ صدر جمال عبد الناصر نے یمن اور شام و مصر کو ملا کر ایک متحدہ ملک بنانا چاہا۔ وہ قومیت عربیہ یا عرب نیشنل ازم کے علمبردار بن کر ابھرے۔ اپنی جوشیلی تقریروں اور بیانات سے بہت جلد عرب دنیا کے ہیرو بن گئے۔ انہوں نے 1967 میں اسرائیل سے جنگ کی۔ لیکن اس چھ روزہ جنگ میں عربوں اور خاص کر مصر کو اپنی تاریخ کی سب سے بدترین شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔

عرب فوج کئی ممالک اردن، شام، مصر، مراکش و عراق کی متحدہ فوج تھی جسے روس کی حمایت حاصل تھی۔ صدر ناصر کو اپنے اوپر بڑا زعم تھا، مگر چھ روزہ جنگ شروع ہوتے ہی اسرائیل کا فضائی حملہ اتنا سخت تھا کہ مصری فوج کا سارا فضائی بیڑا جو 420 جہازوں پر مشتمل تھا وہ پرواز بھی نہ کر سکا اور سارا کا سارا رن وے پر ہی تباہ کر دیا گیا۔ اس شکست سے مصری فوج کی بھی کمر ٹوٹ گئی اور جمال ناصر کا بت بھی ٹوٹ گیا۔ سینا کا 42 ہزار مربع میل کا وسیع علاقہ اسرائیل کے قبضہ میں آگیا۔ نہر سوئز سے جہاز رانی بند ہونے سے مصری معیشت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ 1970 میں صدر جمال ناصر کا انتقال ہو گیا۔ ان کے بعد ان کے قریبی ساتھی انور سادات مصر کے صدر بنے۔ انور سادات کے زمانہ میں کئی اصلاحی کام ہوئے۔ سب سے پہلے انہوں نے ملک کے اندر سے جبر واستبداد کا خاتمہ کیا۔ اخوانیوں کو بھی رہا کر دیا گیا۔ 6 اکتوبر 1973 کو مصر نے اسرائیل سے پھر جنگ کی اور اسرائیلی فوج کو اپنے مشرقی ساحل سے بے دخل کر دیا' اس طرح جزوی طور پر 67 کی شرمناک شکست کی تلافی ہوئی۔ سادات کے زمانہ میں اسرائیل سے کیمپ ڈیوڈ کا معاہدہ ہوا جس کے رد عمل میں فوج کے ایک جذباتی نوجوان نے صدر انور سادات کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ سادات کے بعد حسنی مبارک مصر کے صدر بنے جو اگلے 30 سالوں تک آہنی پنجوں کے ساتھ ملک پر مسلط رہے۔ 2011 سے عالم عربی میں جو عوامی انقلاب الربیع العربی یا بہار عرب کے نام سے شروع ہوا، جس کی ابتداء تونس سے ہوئی تھی، اس کا دوسرا پڑاؤ مصر بنا اور فوج نے عدم مداخلت کا رویہ اختیار کیا۔ تحریر چوک سے شروع ہوئے اس انقلاب میں حسنی مبارک کو اقتدار چھوڑنا پڑا۔ پھر آزادانہ انتخابات کے نتیجہ میں اخوان المسلمون کی سیاسی پارٹی کے اہم رہنما ڈاکٹر محمد مرسی عہدۂ صدارت پر فائز ہوئے۔ ایک سال بعد ان کی حکومت کے خلاف بھی عوامی شورش ہوئی اور فوج نے ایک بار پھر موقع سے فائدہ اٹھا کر منتخب حکومت کا تختہ پلٹ دیا۔ اب جنرل عبد الفتاح السیسی ملک کے صدر ہیں ، اخوان دوبارہ کالعدم قرار دی جا چکی ہے۔ جنرل سیسی پورے آمرانہ استبداد کے ساتھ حکومت

کر رہے ہیں۔ جن کے خلاف عوامی مظاہرے ہوتے رہتے ہیں۔

تعمیر و ترقی

مصر اسلامی دنیا کا بڑا ملک ہے، لیکن ملک کا بیشتر حصہ قابل کاشت نہیں ۔جو قابل کاشت ہے وہ نہایت زرخیز ہے اور پورا دریائے نیل سے سیراب ہوتا ہے ۔ قاہرہ عرب دنیا کا سب سے بڑا اور ترقی یافتہ شہر ہے۔ مصری صحافت بھی اسلامی دنیا میں سب سے ترقی یافتہ ہے۔ اخبارات لاکھوں کی تعداد میں نکلتے ہیں ۔ پیٹرول، لوہا، فاسفیٹ نکلتے ہیں اور روئی کی پیداوار بھی سب سے زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ مصر سیاست کا بھی اہم مقام ہے یہاں کے اہرام مشہورِ عالم ہیں ۔ مصر کے اندر تعلیم مفت ہے اور متعدد یونیورسٹیاں ہیں ۔ مصر کی یونیورسٹی جامعہ قاہرہ کے تین فرزندوں نے نوبل انعام حاصل کیے ہیں۔ مصر میں آزادیٔ رائے اور اباحیت بھی انتہائی حد کی ہے۔ فلم انڈسٹری بھی ترقی یافتہ ہے اور معاشرہ بالعموم ان چیزوں کا اتنا عادی ہو چکا ہے کہ اس بے مہار آزادی سے محرومی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ مصر کی جامعہ ازہر عالم اسلام کی سب سے بڑی دینی دانش گاہ ہے۔ اور اب عام یونیورسٹیوں کی طرح اعلی تعلیم کا بڑا ادارہ بن گئی ہے۔

2.4 سوڈان

سوڈان قدیم زمانہ میں نوبیہ کہلاتا تھا۔ یہ بھی دنیا کے قدیم ملکوں میں سے ہے۔ مصر کا مشہور دریائے نیل سوڈان کو بھی سیراب کرتا ہے۔ قدیم زمانہ میں سوڈان مصر کی حکومت میں شامل رہا ہے۔ اسلام سے پہلے سوڈان میں عیسائیت پہنچی اور ملک کے شمال میں آبادی کے بڑے حصہ نے مسیحیت کو قبول کر لیا تھا۔ خلافت راشدہ کے زمانہ میں مسلمان نوبیہ پر حملہ کر چکے تھے۔ لیکن وہ آٹھویں صدی میں یہاں پہنچے۔ بہت سے عرب قبائل بحیرہ احمر کے راستہ مشرقی سوڈان میں پہنچ کر یہیں آباد ہو گئے ۔ سَنار کے علاقہ میں ان کی اکثریت ہو گئی اور پندرہویں صدی تک شمالی سوڈان میں مسلمانوں کی سلطنتیں قائم ہو گئیں۔ سوڈان کا رقبہ بہت بڑا ہے، آبادی 4 کروڑ سے زیادہ ہے۔ قدیم قبائلی کے علاوہ عربی اصل زبان ہے۔ اسلام مذہب ہے۔ عیسائی اور مظاہر پرست بھی ہیں۔

جدید دور میں سوڈان مصر سے اُس وقت الگ ہوا جب محمد احمد مہدی سوڈانی کی قیادت میں ان کے پیروؤں اور درویشوں نے 1883 میں مصر کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور اپنے ملک کو الگ کر لیا۔ مہدی سوڈانی نے خرطوم کے بالمقام ام درمان نام سے ایک شہر کو آباد کیا اور اُسے دارالحکومت قرار دیا۔ 1899 میں انگریز لارڈ کچنر کی قیادت میں انگریزوں نے سوڈان پر حملہ کیا۔ درویش انگریزوں کی جدید اسلحہ سے لیس فوج کا مقابلہ نہ کر سکے۔ اور سوڈان پر برطانیہ کا تسلط ہو گیا جو 1899 سے 1956 تک جاری رہا۔ اس برطانوی دور میں سوڈان میں آبپاشی کا وسیع نظام قائم کیا گیا، کئی بند دریائے نیل پر بنائے گئے۔ نہریں نکالی گئیں، ریلوے کو ترقی دی گئی، نظام مواصلات کو ترقی دی گئی۔ روئی کی کاشت میں بہتری آئی۔ خرطوم میں یونیورسٹی قائم ہوئی۔ سوڈان کی مجلس قانون ساز بھی 1948 میں قائم کی گئی۔ تاہم اسی دور میں سوڈانیوں کے درمیان مسیحیت کی تبلیغ ہوئی، مشنری سرگرمیاں پھیلیں، جنوبی سوڈان میں مسئلہ کھڑا کیا گیا۔ ان تمام اسباب سے برطانیہ کے خلاف عوامی رجحان زور پکڑنے لگا۔ جس کے مد نظر یکم جنوری 1956 کو بالآخر سوڈان کو برطانیہ سے آزادی مل گئی۔

آزادی کے بعد پہلی حکومت اسماعیل ازہری نے بنائی ،ان کے بعد عبد اللہ خلیل اس کے سربراہ ہوئے۔سوڈان میں اسلامی عناصر مضبوط تھے اور انہوں نے سوڈان کا ایک اسلامی دستور بنانے پر اتفاق کر لیا تھا کہ سوشلسٹ عناصر سے ساز باز کر کے فوج کے جنرل ابراہیم عبود نے آئینی اور جمہوری حکومت توڑ کر فوجی حکومت قائم کر دی۔ تمام سیاسی جماعتوں پر پابندی لگا دی گئی۔ فوجی آمریت چار سال چلتی رہی مگر عوام نے جمہوری نظام کے لیے تحریک جاری رکھی اور بالآخر جنرل عبود 1964 میں مستعفی ہو گئے ۔اور ملک میں ایک بار پھر جمہوری حکومت قائم ہو گئی ۔صادق المہدی اوران کے بھائی ہادی المہدی ،ان کی الامۃ پارٹی اوراسماعیل ازہری کی حزب الاتحادالدیمو قراطی نے اتحاد کر کے اسلامی آئین کے لیے جدوجہد شروع کی۔ لیکن 1969 میں کرنل محمد جعفر نمیری نے پھر فوجی انقلاب برپا کر دیا۔ام درمان کی اسلامی یونیورسٹی بند کر دی ،اخباروں کو قومی تحویل میں لیا،سیاسی پارٹیوں کو خلافِ قانون قرار دیا۔ نمیری مصری صدر ناصر کے مداح تھے۔ انہوں نے کیمپ ڈیوڈ معاہدہ کی حمایت کی تھی۔ انہوں نے اپنے خلاف ہونے والے مظاہروں کو سختی سے کچل دیا۔ شروع میں کمیونسٹوں سے سہارا لیا لیکن بعد میں وہ کمیونسٹوں کے بھی خلاف ہو گئے،اور مذہبی جماعتوں سے تصفیہ کی کوشش کی۔

اس کے بعد وہ برابر اسلام کا نام لینے لگے بلکہ اسلامائزیشن کا ایک پروگرام بھی شروع کیا۔ زکوۃ ٹیکس نافذ کیا۔ بینکاری نظام کو غیر سودی بنیادوں پر استوار کرنے کا اعلان کیا۔ اپنے آپ کو ''امام ''اورامیر المومنین قرار دینے کی کوشش کی۔ انہوں نے اسلامی حدود کا نفاذ بھی 1983 میں شروع کیا۔ شراب، سرقہ اور ارتداد کی سزائیں نافذ کی گئیں۔ تاہم اسلامائزیشن کا یہ عمل ان کی اپنی ذاتی خواہشات پر مبنی تھا۔ جس کے تحت ہزاروں لوگوں کو گرفتار کیا گیا اور چھوٹے چھوٹے جرائم پر بھی کوڑوں کی سزائیں نافذ کی جانے لگیں'نتیجہ یہ ہوا کہ معاشرہ میں اس عمل کی مخالفت شروع ہو گئی۔ نمیری کے اسلامائزیشن کا پروگرام بجائے اتحاد کے ملک میں انتشار کا باعث بننے لگا۔ نمیری نے ملکی عدلیہ سے الگ خصوصی عدالتیں قائم کیں اوران کے ذریعہ اسلامی قانون کا اطلاق غیر مسلموں پر بھی شروع کر دیا۔ ان کے یہ اقدامات کسی اسلامی شعور کے بجائے مخبوط الحواسی کے مظہر تھے۔ جب اسلام پسند حلقوں نے ان پر شدید تنقید شروع کر دی تو ان کے ایک رہنما محمد طٰہٰ کو ارتداد کا الزام لگا کر پھانسی پر چڑھا دیا۔ حتی کے ملک کے ایک بااثر رہنما صادق المہدی نے ان پر کھلے عام تنقید کی۔ جس پر ان کو بھی جیل میں ڈال دیا گیا۔ جب تنقیدیں زیادہ بڑھیں تو نمیری نے اپنا اسلامائزیشن کا پروگرام بند کر دیا۔ اپنی ناکامیوں کا الزام اخوان پر دھرتے ہوئے نہ صرف ان کو حکومت سے فارغ کر دیا بلکہ حسن ترابی سمیت کئی سولیڈروں کو گرفتار کر لیا۔ حالانکہ انہوں نے پہلے حسن ترابی کو اٹارنی جنرل تک بنایا تھا۔ بہر حال نمیری کی انتہاپسندی کے باعث ملک میں جمہوری اقدار اور روایات پروان نہیں چڑھ سکیں تھی اور سوڈان فوجی بغاوتوں اور شورشوں کی آماجگاہ بن کر رہ گیا۔ چنانچہ 1985 میں جنرل سوارالذہب نے نمیری کا تختہ پلٹ دیا، نئی فوجی حکومت نے ملک میں عام انتخابات کرائے جن کے نتیجہ میں صادق المہدی وزیر اعظم بن گئے۔

تاہم یہ جمہوری حکومت بھی کامیاب ثابت نہیں ہوئی اور 1989 میں ایک اور فوجی انقلاب آیا جس کی قیادت جنرل عمر البشیر کر رہے تھے۔ آج وہی سوڈان کے صدر ہیں ۔شروع میں اسلامی تحریک بھی ان کے ساتھ رہی۔ جس کے سب سے بڑے قائد حسن الترابی ہیں جو اسلامی دنیا کی ایک بڑی فکری شخصیت ہیں ۔وہ قومی اسمبلی کے اسپیکر رہ چکے ہیں اور کئی مشہور کتابوں کے مصنف ہیں ۔جنرل عمر

البشیر ملک کے مقبول رہنماہیں ۔ انہوں نے ملک کی معیشت کو ترقی دینے کی کوشش کی ۔ جنوبی سوڈان کے باغیوں سے مذاکرات کیے۔ ان مذاکرات کے نتیجہ میں اب جنوبی سوڈان ایک الگ ملک بن چکاہے جس میں عیسائی اکثریت ہے۔ سوڈان کو ابھی دارفور کی قبائلی خانہ جنگی کا سامناہے۔ نیز اُس پر کئی مغربی ممالک نے اقتصادی پابندیاں لگار کھی ہیں۔

سوڈان ایک زرعی ملک ہے۔ غلہ کی پیداوار میں وہ خود کفیل ہے۔ معدنیات بھی ہیں ، صنعت ابتدائی مرحلہ میں ہے۔ ملک کی 40 فیصد آبادی عربی نسل کی ہے۔ مسلمانوں کا تناسب 80 فیصد ہے۔ باقی عیسائی اور مظاہر پرست ہیں ۔ خواندگی کی شرح 27 فیصد ہے۔ ابتدائی وثانوی تعلیم مفت ہے۔ کرنسی پاؤنڈ ہے۔ سوڈان عرب لیگ، اقوام متحدہ، اوراوآئی سی کا ممبر ہے۔ رقبہ کے اعتبار سے سوڈان مسلم دنیاکا سب سے بڑاملک ہے البتہ جنوبی سوڈان کے الگ ہونے سے اب اس کا رقبہ گھٹ گیاہے۔

2.5 لیبیا

بحیثیت ملک لیبیاکی تاریخ زیادہ پرانی نہیں ۔ اُس کا قیام گزشتہ صدی میں ہواہے۔ پہلے اس ملک کے مشرقی حصہ کووادی برقہ کے نام سے جاناجاتاتھا، جو مصر کے ماتحت ہواکرتاتھا۔ مغربی حصہ طرابلس کا علاقہ تھاجو تیونس کی حکومت کے تحت ہواکرتاتھا۔ اس کے بعد طرابلس پر اسپین نے قبضہ کرلیاتھا۔ 1551 میں عثمانی ترکوں نے طرابلس اور بنغازی کو نیز جنوبی صحرائے اعظم فزان سب کو اپنے مقبوضات میں شامل کرلیا۔ عثمانی سلطنت میں اس پورے علاقہ کو طرابلس کے نام سے پکارتے تھے۔ جب اس پر اٹلی نے قبضہ کیااور پھر آزادی کی تحریکوں کے بعد یہ خطہ آزاد ہواتواِس کو لیبیاکے نام سے پکاراجانے لگا۔ لیبیاکا رقبہ 6 لاکھ 79 ہزار 359 مربع میل ہے ، آبادی لگ بھگ ایک کروڑ ہے' زبان عربی اور مذہب اسلام ہے۔

لیبیاسنوسی صوفی تحریک کا گہوارہ ہے ۔ اس تحریک کے پیروؤں نے اپنے ملک پر حملہ آور فرانسیسیوں اوران کے بعد اطالوی استعمار سے دہائیوں تک مزاحمت کی ۔ ان سے جہاد کرتے ہوئے اس صوفی سلسلہ کے مجاہد سنوسی رہنماسیدی عمر مختار نے شہادت پائی۔ سید محمد ابن علی سنوسی ، ان کے بیٹے سید مہدی اورایک دوسرے قائد سید احمد شریف نے جغبوب وکفرہ میں اپنے مراکز قائم کیے تھے، جو زاویے کہلاتے تھے۔ سنوسی ایک ہی وقت میں مبلغ، کسان، معلم اور مجاہد سبھی کچھ ہوتے تھے۔ اطالیہ نے وادی برقہ پر قبضہ کرکے لیبیاکو اپنی نو آبادی بنادیا، اس میں معاشی واقتصادی اصلاحات کیں۔ لیکن وہاں لاکھوں اطالوی باشندوں کو بھی آباد کردیا۔ جنگ عظیم دوم میں سنوسیوں کے رہنماسید محمد ادریس نے برطانیہ سے تعاون کیااور جب جنگ میں محوری طاقتوں ، جرمنی اوراٹلی کو شکست ہوگئی تو فرانس اور برطانیہ نے لیبیاکے اپنے اپنے زیر انتظام علاقے سید محمد ادریس کے حوالے کردیے۔ سید محمد ادریس ملک کے دستوری بادشاہ قرار دیے گئے ۔ آزادی کے ابتدائی سالوں میں ترقیاتی کاموں کی رفتار سست تھی ملک کے وسائل بھی اس وقت محدود تھے۔ 1969 میں جب شاہ ادریس غیر ملکی دورے پر تھے فوج نے بغاوت کرکے شاہی حکومت کا تختہ پلٹ دیا۔ اب جنرل معمر قذافی لیبیاکے صدر بنے۔ اس زمانہ میں پیٹرول کی آمدنی اتنی بڑھی کہ لیبیامسلم دنیاکا آٹھواں سب سے بڑاتیل پیدا کرنے والاملک بن گیا۔ صدر قذافی نے داخلی وخارجی سطح پر

جرأت مندانہ اقدامات کیے، لیبیا کو امریکہ اور برطانیہ کے اثرات سے آزاد کرایا۔ عرب دنیا سے اتحاد کی کوششیں کیں۔ اُس میں کامیابی نہ ملی تو افریقن اتحاد کی مہم چلائی۔ انہوں نے مختلف ممالک میں آزادی کی تحریکوں اور انقلابوں کی تائید کی۔ اپنی کتاب، 'کتاب اخضر' کو مملکت کا دستور بنایا جو اسلام اور سوشلزم کا ملغوبہ ہے۔ معمر قذافی کا دامن اخلاقی کمزوریوں سے پاک تھا لیکن مزاج میں آمریت، تلون، خودسری اور جلد بازی تھی۔ جن کی وجہ سے ان کے اقدامات اکثر ناعاقبت اندیشانہ ہو کر رہ جاتے تھے۔

قذافی نے اپنے زمانہ میں اخوان المسلمون کو بری طرح کچل دیا، وہ ان کو ارہابی (دہشت پسند) قرار دیتے تھے۔ قذافی نام اسلام کا لیتے تھے لیکن انہوں نے اسلام کے مقابلہ میں اپنے نظریات و مفادات کو زیادہ اہمیت دی۔ لیبیا میں جو انقلاب آیا وہ قرآن و سنت کی بنیاد پر نہیں بلکہ قذافی کے ذاتی نظریات پر تھا۔ لیبیا کی یہ نئی حکومت ایک عوامی ریاست بن گئی جس میں عوامی کمیٹیوں نے حکومتی دفاتر، اسکولوں، میڈیا، کاروباری اداروں، سفارت خانوں اور مساجد کا انتظام سنبھالنا شروع کر دیا۔ یہ سوشلسٹ تجربہ 1978 میں شروع ہوا جس میں جاگیرداری کا خاتمہ کر دیا گیا۔ لیبیا میں ایک مکان سے زیادہ جائداد ممنوع قرار پائی۔ پرائیویٹ تجارت پر پابندی لگا دی گئی، فیکٹری ورکرز کو حق دیا گیا کہ وہ اپنی فیکٹریوں پر قبضہ کرلیں۔ اس طرح کارکنان راتوں رات اپنی کمپنیوں کے مالک بن گئے۔

اگرچہ ان کے عہد میں ملک کے اندر امن وامان کی صورت حال مثالی تھی۔ لیبیا مختلف طریقوں سے اسلامی ملکوں نیز دنیا کے غریبوں کی امداد کرتا تھا۔ تاہم اپنے 40 سالہ عہد میں جنرل معمر قذافی نے عوامی آزادیوں کو بری طرح پامال کیا تھا۔ انہوں نے ہر تنقیدی آواز کو سختی سے دبا دیا۔ استبدادی قوانین کو لوگوں پر اتنی سختی سے نافذ کیا کہ سبھی عاجز آگئے۔ ملکی صحافت، ذرائع ابلاغ وغیرہ سب پر شدید پابندیاں تھیں۔ 2011 میں جو بہار عرب چلی تو لیبیا میں قذافی کے خلاف برسوں سے پکنے والا لاوا پھوٹ پڑا۔ شدید بغاوت شروع ہو گئی جس کی مغربی ملکوں نے حمایت کی اور آخر کار دو سال کی جدوجہد کے بعد قذافی کے پنجوں سے ملک کو آزاد کروالیا گیا۔ تاہم قذافی کے خاتمہ کے بعد سے ملک ابھی تک سیاسی عدم استحکام کا شکار ہے۔

تاہم قذافی کے عہد میں لیبیا میں شراب پر پابندی تھی، خواتین کے لیے ستر ڈھانپنا لازمی تھا۔ زکوۃ کا سرکاری نظم ہوتا۔ جہاد فنڈ قائم کیا گیا۔ ابتدائی تعلیم لازمی تھی۔ قذافی حکومت نے ریلوے، شفاخانے، عمدہ سڑکیں، یونیورسٹیاں، کارخانے ہوائی اڈے وغیرہ قائم کیے اور لیبیا کو ایک جدید و ترقی یافتہ ملک بنا دیا۔ آبادی تمام تر مسلمان ہے اور عرب و بربر نسلوں کے باشندوں پر مشتمل ہے۔ خواندگی کی شرح 90 فیصد تھی۔ لیبیا اوپیک ممالک، اقوام متحدہ، او آئی سی اور عرب لیگ کا رکن ہے۔

2.0 تونس

شمالی افریقہ کا اہم ملک ہے۔ وہ خلافت راشدہ کے زمانہ میں ہی اسلامی قلمرو میں شامل ہو گیا تھا۔ دوسری صدی ہجری تک مرکز خلافت کے تحت رہا۔ اُس کے بعد یہاں الگ الگ خودمختار سلطنتیں قائم ہوئیں۔ جن میں اغلبی، بنو فاطمہ، صنہاجی خاندانوں کی اور بعد میں موحدین کی حکومتیں قائم ہوئیں۔ تیونس کا سب سے مشہور علمی و تمدنی شہر قیروان تھا اور امام فلسفہ تاریخ ابن خلدون کا تعلق بھی

تیونس سے تھا۔1534 میں اس پر عثمانی ترکوں نے قبضہ کر لیا۔انیسویں صدی میں مغربی استعمار کی تاخت کا شکار دوسرے عرب اور مسلم ملکوں کی طرح تیونس بھی ہوا۔اور 1881 میں اس کو فرانس کا زیر حفاظت علاقہ قرار دیا گیا۔تیونس کا رقبہ 63ہزار378مربع میل ہے ،آبادی تقریبا ایک کروڑ۔عربی یہاں کی بھی زبان ہے۔اور فرنچ بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔مذہب اسلام ہے۔

فرانس نے تونس پر قبضہ کرکے وہاں کے مقامی حکمران 'بے 'کو بر قرار رکھا لیکن اصل اختیارات فرنچ ریزیڈینٹ جنرل کے ہاتھ میں رہے۔فرانس نے تونس میں اصلاحات بھی کیں،انتظامی اور مالی ڈھانچہ میں مفید تبدیلیاں لائی گئیں۔ریلوے،عام سڑکیں،بندر گاہیں تعمیر کیں،جدید تعلیم کو پھیلایا۔اسکول اور اسپتال قائم کیے۔باغبانی اور کاشت پر توجہ کی کان کنی کی طرف بھی توجہ دی گئی۔لیکن انگریزوں کے بر خلاف فرانسیسیوں نے بڑی تعداد میں اپنے شہریوں کو تونس میں لالا کر بسایا۔اپنی زبان اور کلچر کو سختی سے نافذ کیا۔نتیجہ یہ ہوا کہ تونس حقیقی معنی میں ایک فرانسیسی نو آبادی بن گیا۔1907 سے تونس میں قومی تحریک آزادی شروع ہوئی جس میں مذہبی طبقہ،مغربیت پسند طبقہ اور نوجوان طلبہ سب شامل تھے۔مذہبی علما میں شیخ عبد العزیز الثعالبی جو جامع زیتونہ کے فارغ تھے،قابل ذکر ہیں۔دوسری بڑی پارٹی حزب الدستور تھی جس میں فرانسیسی کالجوں کے پڑھے ہوئے تونسی طلبہ تھے۔تاہم جوں جوں آزای کی منزل قریب آئی قدیم وجدید طبقہ کے درمیان کشمکش بھی بڑھی اور1939 میں تیز طرار جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کے ایک گروپ نے علما اور حزب دستور دونوں سے الگ ہو کر حزب دستور جدید کے نام سے ایک الگ جماعت بنالی جس کے قائد حبیب بورقیبہ تھے۔تعلیم کے حصول کے بعد ان کی زیادہ تر زندگی جیل کے اندر جلاوطنی اور آزادی کی لڑائی لڑتے گزری۔آزادی کی لڑائی پورے ملک میں پھیل گئی،احتجاج،مظاہرے اور ہنگامے سالوں تک جاری رہے۔1955 میں بورقیبہ وطن واپس آئے۔20مارچ1956 میں تونس آزاد ہوا حزب دستور جدید نے حکومت بنائی اور حبیب بورقیبہ پہلے وزیر اعظم مقرر ہوئے۔

جب تونس جمہوریہ بنا اور اس نے امریکی طرز کا صدارتی نظام منتخب کیا تو وہ صدر بن گئے۔اور اگلے 31سال تک مسلسل صدر منتخب ہوتے رہے۔وہ سوشلسٹ،مغرب نواز،مادیت پسند اور مذہبی عقائد میں تجد دپسندی کی طرف مائل تھے،انہوں نے رمضان کے روزوں پر بھی اعتراض کیا تھا کہ روزہ رکھ کر انسان کی قوت کار گھٹ جاتی ہے۔خود میڈیا پر آکر جوس پی کر روزہ توڑا۔حجاب پر پابندی عائدی کی،عربی کی بجائے فرنچ کو سرکاری زبان قرار دیا۔اور مذہبی تحریکوں کو کچلنے کی کوشش کی۔انہوں نے اپنے طویل عہد میں جو اصلاحات کیں وہ کمال اتاترک سے مشابہ تھیں۔1987 میں جنرل زین العابدین بن علی نے حبیب بورقیبہ کو اقتدار سے بے دخل کر دیا۔دو تین سال بن علی نے مذہبیت کا مظاہرہ کیا۔اسلام پسندوں کو کچھ آزادیاں بھی دیں مگر اس کے بعد اس نے بھی اپنا اصل رنگ دکھایا اور پوری آمریت کے ساتھ حکومت شروع کردی۔2011 تک بن علی ملک پر مسلط رہا۔اس کے لمبے اقتدار میں ملک کے اندر بے روزگاری اور معاشی بے کاری اتنی بڑھی کہ 2011 میں ایک نوجوان ریڑھی والے البوعزیزی کے خود سوزی کے واقعہ کے بعد ہزاروں نوجوانوں نے دفعتاً انقلاب شروع کردیا۔بہار عرب کا پہلا شرارہ یہیں سے پھوٹا۔چند دنوں کے بعد بن علی نے ملک چھوڑ دیا۔اس کے بعد ملک میں ایک جمہوری نظام قائم کیا گیا جس میں اسلام پسند النہضہ پارٹی بھی اقتدار میں شریک ہے۔

النہضہ کے قائد شیخ راشد الغنوشی مشہور اسلام پسند مصلح ہیں ۔ انہوں نے روایتی وجدید تعلیم حاصل کی ہے۔اعلی تعلیم کے لیے فرانس میں رہے اور وہاں رہ کر قریب سے مغربی تہذیب کا مشاہدہ کیا۔ انہوں نے ماضی قریب کی اسلامی تحریکات کا مطالعہ کر کے ان کے نتائج سے سبق سیکھ کر اپنے ملک کے لیے مخصوص حالات کے تحت حکمت عملی وضع کی ۔ انہوں نے اعتدال پسند اپروچ اپنائی ۔ اسلامی سیاسیات میں انہوں نے قابل ذکر اضافہ کیاہے۔ شروع میں غنوشی کی تحریک ایک غیر سیاسی، دعوتی و تبلیغی تحریک رہی اس لیے حکومت نے اس سے تعرض نہیں کیا۔1979 میں انقلاب ایران کے اثرات دوسرے ملکوں پر بھی پڑے ۔ تونس میں حکومت اور مزدوروں میں زبردست ٹکراؤ پیدا ہو گیا۔ پولیس کی وحشیانہ فائرنگ سے بہت سے مزدور ہلاک ہو گئے ۔ اس کے بعد غنوشی نے مظلوموں کی حمایت کے لیے باقاعدہ سیاست میں آنے کا فیصلہ کر لیا۔ انہوں نے میوزیم اسلام کی جگہ زندہ اسلام کا تصور پیش کیا اور مزدوروں کے حقوق، ملازموں کے حقوق، تنخواہ، غربت، مغرب زدگی اور سیاسی آزادیوں پر لکھا۔ ان کی جماعت نے مزدوروں کی تحریک سے قریبی روابط قائم کیے۔ انہوں نے بائیں بازو کی تنظیموں کا مقابلہ بھی شروع کیا۔ ان کی طلبہ تنظیم جلد ہی کالجوں اور اسکولوں میں مقبولیت حاصل کرنے لگی۔

حکومت نے غنوشی اور دوسرے رہنمائوں کو گرفتار کر لیا لیکن راشد غنوشی نے اپنی جماعت کو مکمل طور پر پر امن رکھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ''اسلام اوپر سے مسلط ہونے کی بجائے نیچے سے آئے گا''۔1984 میں ملک بھر میں ہنگامے ہوئے جن کے نتیجہ میں حکومت نے غنوشی کو رہا کر دیا لیکن تقریر و تحریر پر پابندی لگادی۔ 1987 میں حبیب بورقیبہ نے غنوشی اور ان کی جماعت کی بڑھتی ہوئی طاقت کو اپنے لیے خطرہ محسوس کرتے ہوئے ان پر پھر پابندی لگادی اور ان کی جماعت کے تین ہزار کارکنوں کو گرفتار کر لیا۔ خود غنوشی کو عمر قید بامشقت کی سزادی گئی۔ اس کے بعد بن علی نے بغاوت کر کے بورقیبہ کو اقتدار سے بے دخل کر دیا۔ شروع میں مذہبی جماعتوں کو آزادیاں دی گئیں ۔ عوام کے لیے مذہبی فرائض ادا کرنے پر ساری پابندیاں ختم کر دی گئیں۔ جامع زیتونہ کو کھول دیا گیا۔ غنوشی کی جماعت کو اپنا رسالہ نکالنے کی اجازت دینے کا وعدہ بھی کیا۔ غنوشی نے اب اپنی جماعت کا نام بدل کر النہضہ کر دیا۔ 1989 میں بن علی تمام وعدوں سے مکر گئے اور النہضہ کی زبردست داروگیر شروع کر دی، غنوشی کو بھی لندن میں پناہ لینی پڑی۔ پارٹی کے بہت سے رہنماؤں کو جلاوطن کر دیا گیا۔ تاہم نئے انقلاب کے بعد غنوشی اور دوسرے رہنما ملک لوٹ آئے۔ انتخابات میں شامل ہوئے، ان کی پارٹی النہ-ضہ اکثریت سے جیتی اور اس نے حکومت بنائی ۔ انہوں نے سب کو ساتھ لیکر چلنے کی کوشش کی لیکن بائیں بازو کے سیکولر عناصر کی سازشوں سے ان کی حکومت کو مستعفی ہونا پڑا۔ دوسرے انتخابات میں ان کی پارٹی دوسرے نمبر رہی اور اب وہ نئی حکومت میں شریک ہے۔

تونس کا بڑا حصہ ریگستان ہے۔ لیکن قابل کاشت زمین بھی کوئی 75 لاکھ ایکڑ ہے۔ معدنیات بھی خوب نکلتی ہیں۔ لوہا، سیسہ، اسفیٹ کے علاوہ پٹرول اور قدرتی گیس بھی پائی جاتی ہے۔ سیمنٹ اور فولاد سازی کے کارخانے ہیں ۔ سیاحت بھی ملکی آمدنی کا اچھا ذریعہ ہے۔ تعلیم کے میدان میں تونس نے ترقی کی ہے۔ مذہبی اور غیر مذہبی تعلیم کا فرق وہاں ختم کر دیا گیا ہے۔ اور جامع زیتونہ کو اب تونس یونیورسٹی سے ملحق کر دیا گیا ہے۔ ابتدائی مرحلہ سے یونیورسٹی تک تعلیم مفت ہے۔ صدر مقام تونس شہر ہے۔ جس میں عرب لیگ کا دفتر بھی ہے۔ خواندگی کی شرح تقریبا 70 فیصد ہے ، باشندے تمام مسلمان ہیں اور عرب و بربر نسل سے تعلق رکھتے ہیں ۔ زبان عربی ہے۔ دینار یہاں کی کرنسی

ہے۔ تونس اقوام متحدہ، او آئی سی اور عرب لیگ کا رکن ہے۔

2.1 الجزائر

شمالی افریقہ کا ایک اہم ملک الجزائر ہے۔ جو المغرب العربی میں آتا ہے۔ شمالی افریقہ کے پہلے مسلمان فاتح اور شہر قیروان کے بانی عقبہ بن نافع کا مزار بسقرہ شہر میں ہے۔ تاریخی طور پر یہ صوبہ اغالبہ، فاطمی خلافت اور موحدین کی سلطنتوں میں شامل رہا ہے۔ کبھی کبھی یہاں الگ الگ مقامی سلطنتیں بھی قائم ہو جاتی تھیں۔ 1553 میں مشہور ترک امیر البحر خیر الدین باربروسہ نے اس کو فتح کر کے خلافت عثمانیہ میں شامل کر دیا۔ اس علاقہ کا صدر مقام شہر الجزائر تھا اس لیے پورے ملک کو الجزائر کہنے لگے۔ 1830 میں فرانس نے اس پر تاخت کی اور چند سالوں میں اس پر قبضہ کر لیا۔ فرانس سے مزاحمت کرنے والے مجاہدین میں سب سے مشہور امیر عبد القادر الجزائری ہوئے۔ جنہوں نے اخیر میں فرانس کے آگے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ اُس کے بعد فرانس نے اس کو اپنا صوبہ بنا دیا۔ الجزائر کا رقبہ کافی وسیع یعنی 9 لاکھ 19 ہزار 595 مربع میل ہے۔ آبادی تین کروڑ سے زاید ہے۔ زبان عربی، صدر مقام الجیریا شہر ہے۔ مذہب اسلام ہے۔

الجزائر پر فرانسی استعمار پورے سو سال حکمراں رہا۔ اس دوران اس نے کافی ترقیاتی کام بھی کیے۔ مثلاً لاکھوں ایکڑ بنجر زمینوں کو قابل کاشت بنایا گیا، ہزاروں میل لمبی سڑکیں اور ریلوے لائنیں بچھائی گئیں۔ شہروں کی تعمیر جدید طرز پر کی گئی۔ لیکن الجزائر میں اِن ترقیاتی کاموں میں افسوس کا پہلو یہ تھا کہ ان کے سارے فائدے نئے فرنچ باشندے اٹھاتے تھے اور الجزائر کے باشندے ان سے محروم تھے۔ ملک کی تمام زرخیز زمینیں نو آباد کار فرانسیسیوں کے ہاتھ میں تھیں۔ عبد القادر الجزائری کے بعد بھی کئی بار آزادی کی تحریکیں اٹھیں جن کو سختی سے کچل دیا گیا۔ 1924 میں ایک مزدور رہنما مسالی حج نے ایک مزدور تنظیم قائم کی۔ اُس کے بعد اور بھی کئی تنظیمیں مثلاً فرحت عباس کی حزب منشور الجزائر، علما کی تنظیم جمعیۃ العلما الجزائر، الجزائری محاذ برائے دفاع و حریت وغیرہ میدان میں آگئیں۔ شیخ عبد الحمید بن بادیس قرآن کا درس دیتے تھے جو بہت مشہور ہو گیا تھا۔ یہ جمعیۃ دینی و معاشرتی اصلاح کے ساتھ آزادی کے جذبات کی آبیاری بھی کرتی تھی اور اپنا پیغام ہفت روزہ ''البصائر'' کے ذریعہ عام کرتی تھی۔ اس تنظیم کا نعرہ تھا: ''اسلام میرا دین ہے، عربی میری زبان ہے اور الجیریا میرا وطن ہے''۔ یہ تمام پارٹیاں برسر عمل تھیں اسی دوران انقلاب پسند نوجوانوں نے احمد بن باللہ کی قیادت میں 1947 میں ایک خفیہ تنظیم (SQ) قائم کر لی جس نے ایک آزاد فوج تشکیل دی۔ 1958 میں مختلف تنظیموں کا ایک قومی محاذ بھی قائم ہوا اور اُس نے الجزائر کی عارضی حکومت بھی قائم کر لی۔

سات برس تک جنگ آزادی چلتی رہی جس کے دوران کئی لاکھ الجزائری مسلمان مارے گئے۔ بالآخر فرانس الجزائر میں استصوابِ رائے کرانے کے لیے تیار ہو گیا۔ اور اس استصواب میں ملک کے تمام باشندوں نے آزادی کے حق میں رائے دی۔ 3 جولائی 1962 میں الجزائر نے مکمل آزادی حاصل کر لی۔ اور تحریک آزادی کے سب سے بڑے لیڈر احمد بن باللہ کو ستمبر 1962 میں وزیر اعظم منتخب کر لیا گیا۔ 1965 میں بن باللہ کے ہی ایک رفیق حواری بومدین نے ان کا تختہ پلٹ دیا اور فوجی انقلابی کونسل کے ذریعہ حکومت شروع کی۔ 1979 تک وہ ملک کے صدر رہے۔ ان کے انتقال کے بعد انقلابی کونسل نے شاذلی بن جدید کو صدر منتخب کیا۔ انہوں نے زراعت پر توجہ دی

،سیاسی قیدیوں کو آزاد کیا۔ مذکورہ بالاسارے رہنماسوشلسٹ تھے ' انہوں نے اپنی جماعت کے علاوہ سب کی زبان بندی کرر کھی تھی۔ علمااوراسلامی فکر رکھنے والوں کا قافیہ تنگ کیاجاتا تھا۔ حالانکہ ملک کا سرکاری مذہب اسلام ہے ، عربی سرکاری زبان ہے وزارت مذھبی امور بھی قائم ہے۔ مگر اسلام پسندوں کو سختی سے کچل دیاجاتا تھا۔ ملک میں خراب معیشت اور بے روزگاری عام ہونے کی وجہ سے اور دوسرے اسباب سے اسلامی تحریک نے سیاست میں سرگرم حصہ لیا۔ اس موقع پر اسلام پسند گروپوں نے مل کر اسلامی سالویشن فرنٹ تشکیل دیا جس کو مختصراً FIS کہاجاتا ہے۔ اس کی قیادت شیخ علی عباسی مدنی کررہے تھے جو کہ ایک اعتدال پسند مذہبی اور مغربی تعلیم یافتہ رہنما تھے۔ مدنی نے تعلیم کے میدان میں برطانیہ سے ڈاکٹریٹ کیا تھا اور الجزائر یونیورسٹی میں پروفیسر تھے۔ مدنی اسلامی جمہوریت کے قائل تھے۔ معاشی اعتبار سے بھی فرنٹ نے اسلامی بنیادوں پر قائم ایک منصفانہ نظام کا وعدہ کیا۔

اسلام پسندوں کے اس متحدہ محاذ نے 1990 کے بلدیاتی انتخابات جیتے اور اس کے بعد 1991 کے عمومی انتخابات میں بھی پہلے مرحلہ کے انتخاب میں واضح طور پر دوسری پارٹیوں پر سبقت حاصل کرلی۔ مگر فوج نے ان کا راستہ روکنے کے لیے مداخلت کر دی، دوسرے مرحلہ کے انتخابات نہیں ہوئے۔ نتائج کو منسوخ کر کے محاذ کے تمام رہنمائوں کو گرفتار کرلیا۔ فرنٹ پر پابندی لگادی ، اور کئی اخبارات کو بند کر دیا۔ اور جمہوریت کا پودا جڑ پکڑنے سے پہلے ہی کاٹ ڈالا گیا۔ ردعمل میں بعض شدت پسند مذہبی نوجوانوں کے بہت سارے گروپ بن گئے اور انہوں نے سیاسی عمل کی بجائے گوریلا جنگ شروع کر دی۔ بعد میں بعد از خرابیٔ بسیار صدر عبدالعزیز بوتفلیقہ اور اسلام پسندوں کے درمیان مذاکرات ہوئے اور اس صورت حال کا خاتمہ ہوا۔

الجزائر قدرتی وسائل سے مالامال ہے۔ پیٹرول، فاسفیٹ، لوہے اور رسوئی گیس کے ذخائر ہیں۔ ملک کا نوے فیصد حصہ ریگستانی ہے مگر ساحلی میدان بہت زرخیز ہیں اور بارش بھی وافر مقدار میں ہوتی ہے۔ ملک کا تعلیمی نظام فرانسیسی ہے ، کئی یونیورسٹیاں ہیں ۔ صحافت کا معیار بھی بلند ہے۔ بڑے اخبار عربی اور فرنچ میں نکلتے ہیں ۔ 80 فیصد لوگ عربی بولتے ہیں اور 20 فیصد بربری۔ الجزائر اقوام متحدہ، عرب لیگ، اوآئی سی اور اوپیک کا رکن ہے۔ مشہور عرب مفکر مالک بن نبی کا تعلق بھی الجزائر سے تھا۔

2.2 مراکش

مراکش اسلامی تاریخ میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ اس کو عہد قدیم میں مغرب اقصی اور آج کل المغرب کہتے ہیں ۔ یہ اسلامی تہذیب وتمدن کا شمالی افریقہ میں سب سے بڑا مرکز رہا ہے۔ اندلس کے بعد مراکش بھی دوسری صدی ہجری میں ہی خلافت عباسیہ سے الگ ہو گیا تھا۔ اِس پر بالترتیب ادریسیوں، فاطمیوں، مرابطین، موحدین اور بنومرین نے حکومت کی۔ یہاں جامع ازہر مصر کی طرح جامع قروین کا قیام ہوا جو شمالی افریقہ کے مسلم ممالک کے لیے آج بھی سب سے بڑی دینی دانش گاہ ہے۔ فاس، مکناس، رباط اور دار بیضاء (کیسابلانکا) اس کے مشہور شہر ہیں ۔ اسلامی تاریخ کی نامی گرامی شخصیات میں قاضی عیاض، جغرافیہ داں ادریسی، ابن طفیل اور ابن رشد جیسے فلسفی، طبیب ابن زہر اور سیاح ابن بطوطہ اسی خطہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ مراکش کا رقبہ 1 لاکھ 77 ہزار مربع میل ہے۔ آبادی تین کروڑ سے زاید ہے زبان

عربی اور مذہب اسلام ہے۔

مراکش کے شریف حکمراں خاندان کو مولائی یا مولائے کہا جاتا ہے۔ یہ قدیم فلالی خاندان ہے۔ شمالی افریقہ کے ملکوں میں فرانس نے مراکش پر 1912 میں قبضہ کر لیا لیکن اس نے ملک کے اندر بادشاہی نظام کو برقرار رکھا، البتہ نظام حکومت فرنچ ریزیڈنٹ حکام چلایا کرتے تھے۔ مراکش کا شمالی حصہ ریف اسپین کے تسلط میں تھا۔ عوام نے ان قبضہ گیر قوتوں کے خلاف ہتھیار اٹھا لیے، تاہم فرانس نے جلد ہی اس انقلاب کو کچل دیا اور پھر پورے 44 سال فرانسیسی استعمار مراکش پر راج کرتا رہا۔ فرانس نے دوسرے ملکوں کی طرح مراکش میں بھی ترقیاتی کام کیے۔ البتہ اس نے عربی زبان وادب اور کلچر کو دبا کر فرنچ زبان و کلچر کو رواج دیا۔ اسی طرح عربوں اور بربروں میں نزاع پیدا کی اور ان کو لڑانے کی کوشش کی۔ جس کے ردعمل میں ریف میں پہلی عوامی مزاحمت شروع ہوئی۔ جس کی قیادت غازی عبدالکریم خطابی کر رہے تھے۔ انہوں نے اسپین کی فوج کو شکست دے کر ریف میں ایک آزاد مملکت جمہوریہ ریف قائم کر لی تھی۔ مگر 1925 فرانس اور اسپین کی مشترکہ فوج نے جس کی تعداد تین لاکھ تھی اس چھوٹی سی مملکت پر حملہ کر دیا، اس بڑی فوج کا مقابلہ ممکن نہ تھا اس لیے غازی عبدالکریم نے 27 مئی 1926 میں ہتھیار ڈال دیے۔

تاہم دوسرے قومی رہنمائوں علال الفاسی، احمد بالافرج اور محمد حسن الوزانی نے خفیہ طور پر قومی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ ان کی تحریک سیاسی تھی اور مسلح جدوجہد نہ تھی۔ علال الفاسی نے مراکش کے روایتی سلطان محمد خامس سے بھی ملاقات کی اور ان کو بھی قومی تحریک کا ساتھ دینے پر آمادہ کر لیا۔ 1943 میں حزب استقلال قائم ہوئی۔ ریف کے باشندوں نے پھر بغاوت کر دی۔ آخر کار فرانس نے 2 مارچ 1956 کو مراکش کی آزادی تسلیم کر لی۔ اسپین بھی ریف سے دست بردار ہو گیا۔ مراکش میں دستوری بادشاہت برقرار رکھی گئی۔ سلطان محمد خامس کا 1961 میں انتقال ہو گیا' ان کی جگہ مولائے حسن ثانی تخت پر بیٹھے۔ اس وقت مراکش میں آئینی بادشاہت ہے اور بادشاہ کو وسیع اختیارات حاصل ہیں۔ ساتھ ہی ملک میں پارلیمانی نظام بھی موجود ہے، سیاسی پارٹیاں آزاد ہیں۔ جن میں حزب الحرکۃ الشعبیہ الدستوریہ، جمعیۃ العدل والاحسان اور حزب العدالۃ والتنمیۃ ہے۔ شاہ حسن ہر دل عزیز حکمراں ہیں، ان کے کئی اقدامات قوم کی بھلائی کے لیے یادگار ہیں مثلاً انہوں نے فرنچ اور اسپین کے آبادکاروں سے واپس لی ہوئی پانچ لاکھ ایکڑ زمین اپنے غریب کسانوں میں تقسیم کر دی۔ اسرائیل کے خلاف جنگ میں شریک ہوئے۔ مسجد اقصیٰ کو صہیونی خطرات سے بچانے کے لیے اور اس میں آگ زنی کے حادثہ کے بعد رباط میں انہوں نے ہی پہلی مؤتمر اسلامی بلائی اور وہیں او آئی سی کی تاسیس ہوئی۔ انہوں نے ہسپانوی صحراء کو حاصل کرنے کی بھی کامیاب کوشش کی۔ شاہ حسن نے اپنے لیے 'امیر المومنین' کا لقب بھی اختیار کر رکھا ہے۔ یہاں کی اکثریت مالکی مسلک سے تعلق رکھنے والے اہل سنت پر مشتمل ہے۔

زراعت اور کان کنی مراکش کی معیشت کی بنیاد ہیں۔ معدنیات بھی خاصی ہیں۔ لوہا، کوئلہ، سیسہ، جست اور فاسفیٹ کے علاوہ یورانیم اور پیٹرول بھی نکالا جا رہا ہے۔ صنعت کو ترقی دی جا رہی ہے۔ سیاحت کے امکانات بھی وسیع ہیں۔ مسلم دنیا میں ملائشیا کے بعد مراکش میں سب سے زیادہ سیاح آتے ہیں۔ ابتدائی تعلیم لازمی ہے۔ فاس میں جامعۃ القرویین ہے۔ مراکش میں کتب خانے اور مخطوطات بھی بہت

ہیں۔ صحافت عربی میں ہوتی ہے، خواندگی کی شرح 50 فیصد سے زیادہ ہے۔ کرنسی درہم ہے۔ مراکش اقوام متحدہ، اوآئی سی اور عرب لیگ کا رکن ہے۔ محمد الفاسی ، عبداللہ کنون ، اور عبدالرحیم غنیمہ یہاں کی علمی شخصیات میں ہیں ۔ دارالحکومت رباط ہے۔ کیسابلانکا (دارالبیضاء) مراکش، فاس ، مکناس اور طنجہ قدیم اور بڑے اور تاریخی شہر ہیں۔ مراکش کے گرم ساحل اور معتدل موسم عرب دنیا میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔

2.2.1 نائجیریا

مغربی افریقہ کے ممالک میں نائجیریا رقبہ میں تو نہیں لیکن آبادی میں بہت بڑا ملک ہے۔ اسے افریقہ کا دیو بھی کہتے ہیں ۔ یہ ایک نیانام اور نیاملک ہے۔ یہ قدیم زمانہ کی مملکت کانم کا ایک حصہ ہے۔ آج نائجیریا ایک وفاق ہے جس میں بارہ ریاستیں ہیں۔ بعض ریاستوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے بعض میں عیسائیوں کی اور بعض میں مظاہر پرستوں کی۔ ویسے اسلام تیزی سے مقبولیت حاصل کرہاہے۔ پورے ملک میں مسلمانوں کی آبادی نصف سے زیادہ ہے لیکن حکومت ان کی نہیں بلکہ سیکولر اور جمہوری ہے۔ نائجیریا دراصل دریائے نائجر کی نسبت سے کہاجاتاہے ۔ یہ نام اس کوانگریزوں نے دیاہے۔ دارالحکومت کانا م لاگوس ہے، سرکاری زبان انگریزی ہے، رقبہ 3 لاکھ 56 ہزار 669 مربع میل اور آبادی 14 کروڑ سے زاید ہے۔

1903 میں انگریزوں نے پورے نائجیریا کو اپنے تسلط میں لے لیا۔ انہوں نے بعض حصوں کو راست اپنے انتظام میں لیا اور بعض میں مقامی حکومتوں کو برقراررکھا۔ شمال میں یہ حکومتیں متعدد تھیں اور سب مسلمان تھیں۔ 1946 میں ملک کے تینوں حصوں میں علاقائی اسمبلیاں اور مرکز میں مجلس قانون ساز قائم ہوئی۔ نائجیریا میں سیاسی اور قومی جدوجہد علاقائی اور قبائلی اور نسلی بنیاد پر ہوئی۔ اس لیے اسلام کے نام پر مسلمانوں نے بھی کوئی مہم نہیں چلائی۔ البتہ شمال میں مسلمانوں کی اکثریت ہونے کی وجہ سے شمال کی سیاست اور مسلمانوں کی سیاست مترادف ہی مانی جاتی تھیں۔ 1957 میں نائجیریا میں وفاقی نظام قائم کیاگیا جس میں شمال کے رہنما ابو بکر تفادابلیوا نائیجیریا کے پہلے وزیراعظم مقرر ہوئے۔ ان کی قیادت میں 1960 میں ملک کو برطانیہ سے مکمل آزادی مل گئی۔ نیا آئین بنایاگیا۔ نائجیریا کو جمہوریہ قرار دیاگیا۔ نائجیریا میں چھوٹے بڑے قبیلوں کی تعداد اڑھائی سو کے قریب ہے، تقریباً اتنی ہی ان کی بولیاں ہیں ۔ ان قبیلوں میں پانچ قبیلے بہت بڑے ہیں ۔ ان کی تعداد پورے ملک کی دو تہائی کے برابر ہے۔ ان میں بھی ہاؤسا اور ایبو سب سے بڑے قبیلے ہیں ۔ جن میں ہاؤسا مسلمان اور ایبو کی اکثریت عیسائی ہے۔ ملک میں مسیحی مشنری سرگرمیاں عروج پر ہیں ۔ اگرچہ مظاہر پرست قبائل بڑی تعداد میں اسلام بھی قبول کررہے ہیں ۔ چونکہ مجموعی طور پر سیاسی، معاشی اور تعلیمی طور پر مسیحی برتر پوزیشن میں ہیں اس لیے مظاہر پرستوں کو وہ بآسانی اپنی طرف مائل کرلیتے ہیں ۔ ایبو باشندوں کو فوج میں بھی غلبہ حاصل تھا۔ اس لیے انہوں نے جنرل آئرونسی کی قیادت میں 1996 میں فوجی بغاوت کرکے آئینی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور مسلم رہنمائوں احمد وبلو اور ابو بکر تفادا کو قتل کردیا۔ اور وفاق کو ختم کرکے ایک مرکزی حکومت قائم کردی۔ لیکن وہ مستحکم ثابت نہیں ہوئی اور جواب میں ہاؤسا سپاہیوں نے بغاوت کرکے جنرل آئیرونسی کو قتل کردیا۔ تبھی سے مسیحی مسلم تصادم ہوتے چلے آرہے ہیں ۔ فوجی انقلابات بھی آتے رہتے ہیں ۔ مجموعی طور پر نائجیریا کے وفاق میں مسلمانوں کی پوزیشن کمزور ہے اسی لیے ایبو وزراء نے مسلم

آبادی کی مخالفت کے باوجود اسرائیل کو تسلیم کر لیا۔اب نائجیریا میں صدارتی آئین ہے اس کے تحت ایوان نمائندگان ہے۔اور 95 ممبران پر مشتمل سینیٹ ہے۔

نائجیریا زرعی اور معدنی ملک ہے۔کوئلہ ،لوہا، سیسہ ،ٹین اور جست کے ذخیروں کے علاوہ بڑے پیمانہ پر پیٹرول بھی نکل رہا ہے اور قدرتی گیس بھی۔ تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دی جارہی ہے۔خواندگی کا تناسب 51 فیصد ہے۔ صحافت بھی ترقی یافتہ ہے۔ سرکاری زبان انگریزی ہے۔مقامی زبانوں میں ہاؤسا ہے جو عربی و رومن دونوں میں لکھی جاتی ہے۔فاترا یہاں کا سکہ ہے ۔نائجیریا اقوام متحدہ ،اوپیک اور دولت مشترکہ کا رکن ہے۔

2.2.2 موریتانیہ

المغرب العربی کا چوتھا ملک ہے۔ماضی میں مراکش کا حصہ رہا۔اور مراکش کی ثقافت و تہذیب کا اِس پر گہرا اثر پڑا ہے۔وہ مراکش کے جنوب میں واقع ہے۔قدیم زمانہ میں اس علاقہ کو شنقیط کہتے تھے۔بعض علما کے ناموں میں جو شنقیطی آتا ہے وہ اسی نسبت سے آتا ہے۔موریتانیہ دراصل بربر نسل کے باشندے ہیں جنھوں نے صدیوں سے عربوں سے اختلاط اور شادی بیاہ کے نتیجہ میں عرب حیثیت اختیار کرلی ہے۔آج اِس ملک کے 80 فیصد لوگ عربی بولتے ہیں ۔20 فیصد باشندے جو نیگرو ہیں وہ مختلف قبائلی زبانیں بولتے ہیں ۔دارالحکومت کا نام نواکشوط ہے۔رقبہ 3 لاکھ 98 ہزار مربع میل، آبادی لگ بھگ 40 لاکھ۔اکثریت مسلمان اور سب دیندار ہیں۔موریتانیہ نے حال ہی میں اسلامی جمہوریہ ہونے کا اعلان کیا ہے۔

موریتانیہ پر فرانس نے 1903 میں استیلاء حاصل کیا تھا۔جب موریتانیہ میں آزادی کی تحریک شروع ہوئی تو لوگوں کے تین رجحان سامنے آئے ۔شمالی موریتانیہ کی جماعت النہضۃ الوطنیہ مراکش کے ساتھ اس کے الحاق کی حامی تھی ۔جبکہ دوسری جماعت نیشنل موریتانیا جنوب کے نیگرو باشندوں پر مشتمل تھی اور مالی کے ساتھ وفاق بنانے کی حامی تھی۔ان دونوں رجحانوں کے بیچ ایک تیسرا خیال عام باشندوں کا ایک الگ خود مختار ملک بنانے کا تھا۔ملک کی آزادی سے متعلق ان مختلف نظریات کی کشمکش کی وجہ سے ہی جب 25 نومبر 1960 کو فرانس نے موریتانیہ کو مکمل آزادی دیدی تو عرب ملکوں میں سے تونس کو چھوڑ کر کسی نے بھی اس تسلیم نہیں کیا۔وہ سب اس کو مراکش کا ہی ایک حصہ سمجھتے تھے۔تاہم موریتانیہ نے ایک الگ اور آزاد جمہوری اسلامی ملک ہونے کا اعلان کر دیا۔اسمبلی کے انتخابات میں متحدہ محاذ نے تمام نشستیں جیت لیں اور مختار الدادہ پہلے وزیر اعظم بنائے گئے۔9 جون 1970 میں موریتانیہ اور مراکش میں بھی دوستی کا معاہدہ ہو گیا، مراکش نے اس کو آزاد ملک مان لیا تو اور عرب ملکوں نے بھی اسے تسلیم کر لیا اور 1973 میں موریتانیہ کو عرب لیگ کا رکن بنالیا گیا۔

موریتانیہ کے باشندے زیادہ تر خانہ بدوش ہیں ۔ بھیڑ بکریاں اور اونٹ پالنا پیشہ ہے ۔زراعت بھی ہوتی ہے۔معدنی وسائل کم ہیں۔ تاہم لوہے اور تانبے کے وسیع ذخائر موجود ہیں۔ عرب ملکوں کی مدد سے مختلف منصوبوں پر کام ہو رہا ہے۔ سڑکیں تعمیر کی جارہی ہیں، تعلیم پر توجہ دی جارہی ہے۔خواندگی بہت کم ہے۔بربر، نیگرو اور عرب تین طرح کے باشندے ہیں ۔ عربی اور فرنچ لازمی طور پر پڑھائی جاتی ہیں ۔

عائلی معاملات میں اسلامی قوانین نافذ ہیں ۔اب دوسرے اجتماعی معاملات میں بھی اسلامی قوانین کے نفاذ کا مطالبہ بڑھ رہاہے۔ آبادی پوری مسلمان ہے، مساجد کی کثرت ہے۔ دینی مدارس بھی بڑی تعداد میں ہیں ۔ سرکاری زبان عربی ہے۔ موریتانیہ کی کرنسی اوقیہ ہے۔ وہ اقوام متحدہ، اوآئی سی اور عرب لیگ کا ممبر ہے۔

2.3 جمہوریہ مالی

مالی کا علاقہ دراصل دریائے نائجر کی وسطی وادیوں اوران کے ملحقہ علاقوں پر مشتمل ہے ۔اس کی سرحدیں سینی گال، موریتانیہ، الجزائراور نائجر سے ملتی ہیں ۔ اسلام یہاں بارہویں صدی میں پھیل گیا تھا۔ چودھویں صدی میں منسیٰ موسی کے عہد میں مالی کی سلطنت عروج پر تھی۔ سوناپیدا کرنے والے ملک کی حیثیت سے مالی بہت مشہور تھا۔ 1893 میں فرانس نے اس پر قبضہ کر لیا تھااور یہ نو آبادیاتی دور 65 سال تک جاری رہا۔ فرانس نے اس کو فرانسیسی سوڈان کا نام دیا۔ 21جون 1960 میں مالی نے فرانس سے مکمل آزادی حاصل کی اور ایک وفاق تشکیل دیا جس کا نام جمہوریہ مالی رکھا گیا۔ مالی میں معاشی وسائل کافی ہیں ۔ تعلیم مفت ہے مگر خواندگی کا تناسب محض 30 فیصد ہے۔ مالی میں مسلمانوں کا تناسب نوے فیصد ہے۔ رقبہ 4لاکھ 82ہزار 77 مربع میل ہے۔ آبادی تقریبا ایک کروڑ۔

مالی پر فرانس کا قبضہ 65 سال رہا۔ وہ مالی کو فرانسیسی سوڈان کہتا تھا۔ اس درمیان فرانس نے یہاں بھی ترقی کے کام کیے، سڑکیں بنائیں ، ریلوے کی پٹریاں بچھائیں ، تاراور ٹیلی گراف کے سلسلے قائم کیے۔ مالی میں آبپاشی کے نظام کو ترقی دی۔ لیکن فرنچ حکومت کے ان ترقیاتی کاموں کا ایک تاریک پہلو یہ تھا کہ وہ شہری حقوق صرف ان لوگوں کو دیتی تھی جو فرنچ زبان اور کلچر کو اختیار کر لیتے تھے۔ اس کے علاوہ فرانس نے جن جن ملکوں پر قبضہ کیاوہاں اپنے مفاد میں ایک الیٹ طبقہ پیدا کرنے میں مدد دی۔ یہ طبقہ زبان و کلچر کے اعتبار سے مغربی تھااوراس نے قدیم روایات سے تعلق تقریباتوڑ لیا تھا۔ لیکن اپنے تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے قوم کی قیادت یہی طبقہ کر رہا تھا۔ جب مالی آزاد ہوااوراس نے اپنانام جمہوریہ مالی رکھاتواس کے پہلے صدر مودیبو کیتا ایسے ہی ایک فرد تھے وہ طبقہ اعلی سے تعلق رکھتے اوراپنے کلچر کے اعتبار سے فرنچ اور خیالات میں سوشلسٹ تھے۔ چنانچہ انہوں نے 1959 کے انتخابات میں کامیابی حاصل کر کے اپنی پارٹی (سابق مغربی سوڈانی یونین) کے علاوہ بقیہ سبھی پارٹیوں کو ختم کر دیا۔ جمہوریہ مالی کو ایک جمہوری، سیکولر اور سوشلسٹ جمہوریہ قرار دیا۔ انہوں نے ملک میں روس اور چین کے طرز کا سوشلزم اختیار کیا اور ملک میں اجتماعی کاشت کا پروگرام شروع کیا، کثیر تعداد میں چینیوں کو نیانظام چلانے کے لیے اپنے ملک بلایا۔ اسی طرح انہوں نے مالی کو فرنچ بلاک سے بھی الگ کر دیا۔ ان کا طرز حکومت آمرانہ تھا۔ جس کی وجہ سے ملک میں بے چینی پھیل گئی۔ 19نومبر 1968 کو لیفٹیننٹ موسی تراورے نے مودیبو کیتا کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ نئی حکومت نے نجی کاروبار اور سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کی۔ مالی کے اقتصادی وسائل اچھے ہیں ۔ نصف ملک کی زمین زرخیز ہے' پانی وافر مقدار میں موجود ہے۔ مویشی پالنے کے امکانات بھی وسیع ہیں ۔ میگنیز، پیٹرول اور یورینیم کی تلاش جاری ہے۔ دارالحکومت بماکو ہے۔ ٹمبکٹو کا تاریخی بندرگاہ بھی مالی میں ہی پڑتا ہے۔ خواندگی کا تناسب قریبا 30 فیصد ہے۔ یہاں کا سکہ فرانک ہے۔ مالی اقوام متحدہ اور او آئی سی کا رکن ہے۔

2.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- مصر آبادی اور اپنے وسائل کے لحاظ سے عرب دنیا کا سب سے بڑا اور معاشی، فکری، عقلی و تمدنی اعتبار سے سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک ہے۔ مصر عربوں اور عربی زبان کی نشأۃ ثانیہ کا بھی مرکز ہے۔ سب سے پہلے جدید بیداری یہیں آئی تھی۔ اس کے بعد اس کے شعلے دوسرے عرب ملکوں میں پہنچے۔ اُسی طرح مذہبی و دینی بیداری کا نقیب بھی مصر ہی مسلم دنیا اور خاص عرب ملکوں میں رہا ہے۔ مصر اسلامی تاریخ میں بھی ایک زبردست کردار ادا کرتا رہا ہے۔ آبادی سات کروڑ سے زیادہ ہے۔ عربی یہاں کی زبان ہے اور سرکاری مذہب اسلام۔ سے عالم عربی میں جو عوامی انقلاب الربیع العربی یا بہار عرب کے نام سے شروع ہوا، جس کی ابتداء تونس سے ہوئی تھی ،اس کا دوسرا پڑاؤ مصر بنا اور فوج نے عدم مداخلت کا رویہ اختیار کیا۔ تحریر چوک سے شروع ہوئے اس انقلاب میں حسنی مبارک کو اقتدار چھوڑنا پڑا۔
- پھر آزادانہ انتخابات کے نتیجہ میں اخوان المسلمون کی سیاسی پارٹی کے اہم رہنما ڈاکٹر محمد مرسی عہدۂ صدارت پر فائز ہوئے۔ ایک سال بعد ان کی حکومت کے خلاف بھی عوامی شورش ہوئی اور فوج نے ایک بار پھر موقع سے فائدہ اٹھا کر منتخب حکومت کا تختہ پلٹ دیا۔ مصری صحافت اسلامی دنیا میں سب سے ترقی یافتہ ہے۔ اخبارات لاکھوں کی تعداد میں نکلتے ہیں ۔ پیٹرول، لوہا، فاسفیٹ نکلتے ہیں اور روئی کی پیداوار بھی سب سے زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ مصر سیاست کا بھی اہم مقام ہے یہاں کے اہرام مشہورِ عالم ہیں ۔ مصر کے اندر تعلیم مفت ہے اور متعدد یونیورسٹیاں ہیں۔
- سوڈان قدیم زمانہ میں نوبیہ کہلاتا تھا یہ بھی دنیا کے قدیم ملکوں میں سے ہے۔ اسلام سے پہلے سوڈان میں عیسائیت پہنچی اور ملک کے شمال میں آبادی کے بڑے حصہ نے مسیحیت کو قبول کر لیا تھا۔ خلافت راشدہ کے زمانہ میں مسلمان نوبیہ پر حملہ کر چکے تھے۔ لیکن وہ آٹھویں صدی میں یہاں پہنچے۔ سوڈان کا رقبہ بہت بڑا ہے یعنی 9 لاکھ 66 ہزار مربع میل، آبادی 4 کروڑ سے زیادہ ہے۔ قدیم قبائلی زبانوں کے علاوہ عربی اصل زبان ہے۔ اسلام مذہب ہے۔ عیسائی اور مظاہر پرست بھی ہیں۔
- شمالی افریقہ کا تیونس بھی اہم ملک ہے۔ وہ خلافت راشدہ کے زمانہ میں ہی اسلامی قلمرو میں شامل ہو گیا تھا۔ دوسری صدی ہجری تک مرکز خلافت کے تحت رہا۔ اُس کے بعد یہاں الگ الگ خود مختار سلطنتیں قائم ہوئیں۔ جن میں اغلبی، بنو فاطمہ، صنہاجی خاندانوں کی اور بعد میں موحدین کی حکومتیں قائم ہوئیں۔ تیونس کا سب سے مشہور علمی و تمدنی شہر قیروان تھا اور امام فلسفۂ تاریخ ابن خلدون کا تعلق بھی تیونس سے تھا۔ 1534 میں اس پر عثمانی ترکوں نے قبضہ کر لیا۔ انیسویں صدی میں مغربی استعمار کی تاخت کا شکار دوسرے عرب اور مسلم ملکوں کی طرح تیونس بھی ہوا۔ اور 1881 میں اس کو فرانس کا زیر حفاظت علاقہ قرار دیا گیا۔ عربی زبان یہاں کی بھی زبان ہے۔ اور فرنچ بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ مذہب اسلام ہے۔ فی الوقت جمہوری و سیکولر قوتوں کی حکومت ہے جس میں اسلام

پسند النہضہ پارٹی شامل ہے۔

- بحیثیت ملک لیبیا کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں۔ اُس کا قیام گزشتہ صدی میں ہوا ہے۔ پہلے اس ملک کے مشرقی حصہ کو وادی برقہ کے نام سے جانا جاتا تھا، جو مصر کے ماتحت ہوا کرتا تھا۔ مغربی حصہ طرابلس کا علاقہ تھا جو تیونس کی حکومت کے تحت ہوا کرتا تھا۔ اس کے بعد طرابلس پر اسپین نے قبضہ کر لیا تھا۔ 1551 میں عثمانی ترکوں نے طرابلس اور بنغازی کو نیز جنوبی صحرائے اعظم فزان سب کو اپنے مقبوضات میں شامل کر لیا۔ عثمانی سلطنت میں اس پورے علاقہ کو طرابلس کے نام سے پکارتے تھے۔ جب اس پر اٹلی نے قبضہ کیا اور پھر آزادی کی تحریکوں کے بعد یہ خطہ آزاد ہوا تو اِس کو لیبیا کے نام سے پکارا جانے لگا۔
- شمالی افریقہ کا ایک اہم ملک الجزائر ہے۔ جو المغرب العربی میں آتا ہے۔ شمالی افریقہ کے پہلے مسلمان فاتح اور شہر قیروان کے بانی عقبہ بن نافع کا مزار بسقرہ شہر میں ہے۔ تاریخی طور پر یہ صوبہ اغالبہ، فاطمی خلافت اور موحدین کی سلطنتوں میں شامل رہا ہے۔ کبھی کبھی یہاں الگ الگ مقامی سلطنتیں بھی قائم ہو جاتی تھیں۔ 1553 میں مشہور ترک امیر البحر خیر الدین باربروسہ نے اس کو فتح کر کے خلافت عثمانیہ میں شامل کر دیا۔ اس علاقہ کا صدر مقام شہر الجزائر تھا اس لیے پورے ملک کو الجزائر کہنے لگے۔ 1830 میں فرانس نے اس پر تاخت کی اور چند سالوں میں اس پر قبضہ کر لیا۔ فرانس سے مزاحمت کرنے والے مجاہدین میں سب سے مشہور امیر عبد القادرالجزائری ہوئے ۔ جنہوں نے اخیر میں فرانس کے آگے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ اُس کے بعد فرانس نے اس کو اپنا صوبہ بنا دیا۔ آبادی تین کروڑ سے زاید ہے۔ زبان عربی، صدر مقام الجیریا شہر ہے۔ مذہب اسلام ہے۔
- مراکش اسلامی تاریخ میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ اس کو عہد قدیم میں مغرب اقصی اور آج کل المغرب کہتے ہیں ۔ یہ اسلامی تہذیب و تمدن کا شمالی افریقہ میں سب سے بڑا مرکز رہا ہے۔ اندلس کے بعد مراکش بھی دوسری صدی ہجری میں ہی خلافت عباسیہ سے الگ ہو گیا تھا۔ اِس پر بالترتیب ادریسیوں، فاطمیوں، مرابطین، موحدین اور بنو مرین نے حکومت کی ۔ یہاں جامع ازہر مصر کی طرح جامع قرویین کا قیام ہوا جو شمالی افریقہ کے مسلم ممالک کے لیے آج بھی سب سے بڑی دینی دانش گاہ ہے ۔ فاس، مکناس، رباط اور دار بیضاء (کیسابلانکا) اس کے مشہور شہر ہیں ۔ اسلامی تاریخ کی نامی گرامی شخصیات میں قاضی عیاض، جغرافیہ داں ادریسی، ابن طفیل اور ابن رشد جیسے فلسفی، طبیب ابن زہر اور سیاح ابن بطوطہ کے نام قابل ذکر ہیں ۔ آبادی تین کروڑ سے زاید ہے ۔ زبان عربی اور مذہب اسلام ہے ۔ اس وقت مراکش میں آئینی بادشاہت ہے اور بادشاہ کو وسیع اختیارات حاصل ہیں ۔ ساتھ ہی ملک میں پارلیمانی نظام بھی موجود ہے
،
- مغربی افریقہ کے ممالک میں نائجیریا رقبہ میں تو نہیں لیکن آبادی میں بہت بڑا ملک ہے۔ اسے افریقہ کا دیو بھی کہتے ہیں ۔ آج نائجیریا ایک وفاق ہے جس میں بارہ ریاستیں ہیں ۔ بعض ریاستوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے بعض میں عیسائیوں کی اور بعض میں مظاہر پرستوں کی ۔ پورے ملک میں مسلمانوں کی آبادی نصف سے زیادہ ہے لیکن حکومت ان کی نہیں بلکہ سیکولر اور جمہوری ہے ۔ دارالحکومت کا نام لاگوس ہے، سرکاری زبان انگریزی ہے ۔ آبادی دس کروڑ ہے ۔ المغرب العربی کا چوتھا ملک موریتانیہ ہے ۔ یہ ماضی میں مراکش کا حصہ

رہا۔اور مراکش کی ثقافت و تہذیب کا اِس پر گہرا اثر پڑا ہے۔وہ مراکش کے جنوب میں واقع ہے۔قدیم زمانہ میں اس علاقہ کو شنقیط کہتے تھے۔موریتانیہ دراصل بربر نسل کے باشندے ہیں جنھوں نے صدیوں سے عربوں سے اختلاط اور شادی بیاہ کے نتیجہ میں عرب حیثیت اختیار کرلی ہے۔آج اِس ملک کے 80 فیصد لوگ عربی بولتے ہیں 20 فیصد باشندے جو نیگرو ہیں وہ مختلف قبائلی زبانیں بولتے ہیں۔دارالحکومت کا نام نواکشوط ہے۔آبادی لگ بھگ 40 لاکھ۔اکثریت مسلمان اور سب دیندار ہیں ۔موریتانیہ نے حال ہی میں اسلامی جمہوریہ ہونے کا اعلان کیا ہے۔

- جمہوریہ مالی کا علاقہ دراصل دریائے نائجر کی وسطی وادیوں اوران کے ملحقہ علاقوں پر مشتمل ہے۔اس کی سرحدیں سینی گال،موریتانیہ، الجزائر اور نائجر سے ملتی ہیں۔اسلام یہاں بارہویں صدی میں پھیل گیا تھا۔چودھویں صدی میں منسیٰ موسی کے عہد میں مالی کی سلطنت عروج پر تھی۔سونا پیدا کرنے والے ملک کی حیثیت سے مالی بہت مشہور تھا۔1893 میں فرانس نے اس پر قبضہ کرلیا تھا اور یہ نو آبادیاتی دور 65 سال تک جاری رہا۔فرانس نے اس کو فرانسیسی سوڈان کا نام دیا۔21 جون 1960 میں مالی نے فرانس سے مکمل آزادی حاصل کی اور ایک وفاق تشکیل دیا جس کا نام جمہوریہ مالی رکھا گیا۔مالی میں معاشی وسائل کافی ہیں ۔تعلیم مفت ہے مگر خواندگی کا تناسب محض 30 فیصد ہے۔مالی میں مسلمانوں کا تناسب نوے فیصد ہے۔فی الوقت جمہوری نظام حکومت چل رہا ہے۔

2.5 کلیدی الفاظ

نقیب	علمبردار،اگوا،اعلان کرنے والا	استعمار	نو آبادی،سامراج
تاخت	حملہ کرنا برباد کرنا	المغرب	مراکش کا عربی نام
الیٹ طبقہ	اونچا طبقہ	شرارہ	چنگاری شعلہ

المغرب العربی — شمالی افریقہ کا وہ عرب علاقہ جو اس براعظم کے مغرب میں پڑتا ہے۔

وفاق — کئی ریاستوں کا اتحاد جن کا مرکز حکومت ایک ہو

مظاہر پرست — فطری مظاہر آگ ہوا پانی پہاڑ، شجر و حجر وغیرہ کی پوجا کرنے والا

کتاب اخضر گرین بک — قذافی کی کتاب سبز

ریف — مراکش کا وہ دیہی علاقہ جو اسپین سے متصل ہے

2.6 نمونہ امتحانی سوالات

2.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. قیروان کہاں واقع ہے،اس کا بانی کون تھا؟

2. جامع قرووین کس ملک میں ہے ؟
3. مراکش سے اسلامی تاریخ کی کون سی نامی گرامی شخصیتوں کا تعلق رہا ہے ؟
4. فلسفۂ تاریخ کے امام ابن خلدون کس ملک سے تعلق رکھتے تھے ؟
5. سوڈان میں آزادی کے بعد کتنے فوجی انقلابات آئے ؟
6. تونس کا کون سا نوجوان بہار عرب کا محرک ثابت ہوا؟
7. مراکش کے حکمراں تاریخ میں کس لقب سے مشہور ہیں ؟
8. مراکش کے کس شہر میں مسلم ممالک کی پہلی مؤتمر منعقد ہوئی ؟
9. نائیجیریا کے دو بڑے قبیلے کون سے ہیں ؟
10. نائجیریا میں کون سے معدنیات زیادہ ہوتے ہیں ؟

2.6.2 مختصر جوابی سوالات

1. مصر عالم عرب کا فکری رہنما ہے۔ وضاحت کریں
2. فرانس نے مالی اور دوسرے ملکوں میں کس طبقہ کو پروان چڑھایا؟
3. الجزائر میں حکومت اور اسلام پسندوں میں تصادم کیسے شروع ہوا اور الجزائر کی تحریک آزادی میں علمانے کیا کردار ادا کیا؟
4. کرنل قذافی کے دور میں لیبیا نے کیا ترقی کی اور قذافی کا دور ہنگامہ خیز کیوں رہا؟
5. موجودہ بہار عرب کس ملک سے شروع ہوئی، اور اس کے کیا اسباب رہے۔

2.6.3 طویل جوابی سوالات

1. مصر کی جدید بیداری کے عوامل کا جائزہ لیجئے
2. سوڈان میں سیاسی عدم استحکام کا اہم سبب فوجی انقلابات ہیں۔ وضاحت کریں
3. لیبیا قبائلی دور سے ایک جدید مملکت میں کس طرح تبدیل ہوا؟۔

2.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

4. محمود تیمور، التاریخ الاسلامی (آخری جلد)
5. کیرن آرم اسٹرانگ: ISlam a Short History ,USA
6. ثروت صولت، ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ چہارم، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی
7. مبشر نذیر، پروگرام علوم اسلامیہ، ماڈیول CS06 (سیاسی، عسکری، دعوتی اور فکری تحریکیں) (انٹرنیٹ پر دستیاب)

8. ملف الربیع العربی، الجزیرہ عربی ویب سائٹ

اکائی 3: مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ پر یورپ کا استعمار

اکائی کے اجزا:

3.0 تمہید
3.1 مقاصد
3.2 استعمار کی تعریف
3.3 مغربی ایشیا کے ممالک
3.3.1 عراق
3.3.2 شام
3.3.3 لبنان
3.3.4 اردن و فلسطین
3.3.5 ترکی
3.3.6 ایران
3.3.7 سعودی عرب
3.3.8 یمن
3.4 شمالی افریقہ کے ممالک
3.4.1 مصر
3.4.2 سوڈان
3.4.3 جمہوریہ تیونس
3.4.4 الجزائر
3.4.5 مراکش

3.4.6 لیبیا
3.5 خلاصہ
3.6 کلیدی الفاظ
3.7 اکتسابی نتائج
3.8 نمونہ امتحانی سوالات
3.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
3.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
3.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
3.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

3.0 تمہید

موجودہ دور میں مغربی ایشیا(West Asia)میں یوں تو بہت سارے ممالک آتے ہیں مثلاً آرمینیا، قبرص اور جارجیا وغیرہ بھی اس کا حصہ ہیں۔ لیکن یہ ریاستیں چونکہ عیسائی اکثریت پر مشتمل ہیں اور پہلے عثمانی سلطنت کا حصہ تھیں اس لیے یوروپی استعمار نے ان میں جو مداخلت کی وہ ان کو عثمانی مملکت سے نکالنے کے لیے کی تھی اس لیے ان پر استعمار کا اطلاق نہ ہوگا۔اسی طرح چند ریاستیں ایسی ہیں جو بہت بعد میں تشکیل پذیر ہوئیں بلکہ یوروپی استعمار کے دوستونوں فرانس اور برطانیہ نے1916 میں سائکس پیکو(Sykes-Picot)کے خفیہ معاہدے کے ذریعہ اس خطہ کی بڑی ریاستوں کے حصے بخرے کرڈالے اوران کو اپنے درمیان بانٹ لیااس کے نتیجہ میں ان کا وجود ہوا۔اس لیے منطقی طورپر وہ بھی ہمارے موضوع سے خارج ہوں گی۔یہ نوزائیدہ چھوٹی مملکتیں ہیں: کویت، قطر، متحدہ عرب امارات، بحرین اور عمان۔ لہذایوروپی استعمار کانشانہ بننے والے اس خطہ کے تاریخی ممالک ہی سے ہم اس یونٹ میں بحث کریں گے۔جن کو آسانی کے لیے دوشقوں میں باٹاجاسکتاہے۔

3.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعہ سے آپ کواس خطہ کے اہم ممالک، ان کی تاریخ اوران کے موجودہ حالات سے واقفیت ہوگی اورآپ یہ جان سکیں گے کہ یوروپی استعمار کے ان ممالک پر کیامثبت ومنفی اثرات پڑے۔اور کس طرح ان ممالک نے استعمار سے آزادی حاصل کی اوراب کس حال میں ہیں۔

3.2 استعمار کی تعریف

"استعمار ایک غیر ملکی گروہ کے ذریعہ کسی جگہ لوگوں اور وسائل کے کنٹرول اور استحصال کا نظام قائم کرنااور برقرار رکھنا ہے۔ نو آباد کار سیاسی طاقت پر اجارہ داری رکھتے ہیں اور مفتوح معاشروں اور ان کے لوگوں کو قانونی، انتظامی، سماجی، ثقافتی یا حیاتیاتی لحاظ سے اپنے سے کم تر سمجھتے ہیں۔ گرچہ اکثر سامراجی حکومت میں ترقیاتی کام ہوتے ہیں مگروہ اکثر ایسی نو آبادیات کی شکل اختیار کرلیتی ہے، جس کے ذریعے نو آباد کار پہلے سے موجود معاشرے کو مستقل طور پر نو آبادیات میں تبدیل کرنے کے لئے کسی علاقے پر حملہ کرتے ہیں اوراس پر قبضہ کرتے ہیں۔اس سے ممکنہ طور پر مقامی آبادیوں کی نسل کشی ہوتی ہے"۔حوالہ کے لیے دیکھیے وکی پیڈیامیں مضمون : wiki/Colonialismhttps://en.wikipedia.org/

3.3 مغربی ایشیاکے ممالک

اس عنوان کے تحت آپ جن ممالک کے بارے میں مطالعہ کریں گے وہ مغربی ایشیاکے درج ذیل ممالک ہیں۔

عراق	شام	اردن	سعودی عرب
یمن	لبنان	ترکی	ایران

اور شمالی افریقہ کے یہ ممالک یوروپی استعمار کے نشانہ بنے:

مصر	سوڈان	تیونس
الجزائر	مراکش	لیبیا

ان دونوں خطوں میں یوروپی استعمار کا تسلط ہوا اور بعض میں اس کا انڈائرکٹ عمل دخل رہا۔ یہاں آزادی کی تحریکیں چلی ہیں اور یوروپی استعمار سے آزادی حاصل کی گئی ہے۔ مگر ذہنی ونفسیاتی غلامی آج بھی باقی ہے۔بہت سارے معاملات میں یہ پورا خطہ آج بھی مغربی سامراج کے اثرات سے جوجھ رہاہے خاص کر معاشی ومالیاتی مسائل میں نیز سائنس وٹیکنالوجی اور تعلیم میں یہ آج تک سامراج کا دست نگر بناہوا ہے۔

اس یونٹ میں ہم تفصیل سے سب کا مطالعہ کریں گے۔

3.3.1 عراق

عراق خلافتِ راشدہ کے ابتدائی سالوں میں اسلامی قلمرو میں داخل کرلیا گیا تھا۔اور بنو عباس کی خلافت میں یہ پوری اسلامی دنیاکا مرکز بن گیا تھا۔ کیونکہ دارالخلافۃ بغداد عراق میں پڑتا تھا۔بغداد اُس زمانہ میں دنیاکا سب سے زیادہ ترقی یافتہ شہر تھا۔اس سے الف لیلوی افسانے اور داستانیں منسوب ہیں۔ خلافت عباسیہ کے خاتمہ پر تاتاریوں نے اس شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی اوراس میں خون کے

دریا بہادیے تھے۔ عراق کچھ دنوں انہیں کے قبضے میں رہا پھر جلد ہی تاتاری مسلمان ہو گئے۔ ان کے اسلام لانے کے بعد کئی صدیوں تک کبھی تاتاری قبائل اور کبھی ان کے رشتہ دار ترک قبائل یہاں حکمراں رہے۔ سولہویں صدی کے آغاز میں صفوی شیعوں نے اس پر قبضہ کرلیا اور تقریباً30 سال ان کا تسلط رہا۔ اس کے بعد عثمانی ترکوں نے عراق کو اُن سے چھین لیا اور پھر کئی آئندہ تین صدیوں تک عراق عثمانی خلافت کا ایک صوبہ بنا رہا۔ سن1918 میں جب عربوں نے ترکوں سے بغاوت کرکے انگریزوں کا ساتھ دیا تو انگریزوں نے اِس پر قبضہ کرلیا اور شریف حسین آف مکہ سے بدعہدی کرکے خود اپنی حکومت یہاں قائم کرلی۔

عثمانی سلاطین کے تحت عراق میں کئی ترقیاتی کام کیے گئے تھے مواصلات کا جدید نظام قائم ہوا، چھاپہ خانے کھولے گئے، زرعی اصلاحات عمل میں آئیں، بغداد ریلوے کی تعمیر ہوئی۔ جب ترکی میں مشروطیت یا دستوری نظام قائم ہوا اور خلافت کا نظام کمزور پڑ گیا تو عربوں نے ترکوں سے علیحدگی کی جو خفیہ تحریکیں چل رہی تھیں ان میں اور تیزی آگئی۔ اِس میں شامل عراقی افسران نے ''العہد'' نامی خفیہ تنظیم قائم کی تھی جس کی شاخیں بصرہ، بغداد اور موصل میں تھیں۔ 1916 میں عربوں نے عثمانیوں کے خلاف بغاوت شروع کی۔ اور نومبر 1918 تک عرب باغیوں کی مدد سے انگریز فوجیں پورے عراق پر قابض ہو گئیں۔ عربوں کو جھوٹے اور خفیہ معاہدوں میں انگریزوں نے پھنسایا تھا۔ عربوں کی آنکھیں اُس وقت کھلیں جب 1920 میں دمشق میں انگریزوں کی مدد سے شریف حسین آف مکہ کے ایک بیٹے فیصل کو شام کا بادشاہ بنا دیا گیا تو عراقی رہنماؤں نے شریف حسین کے دوسرے بیٹے امیر عبد اللہ کو عراق کا حکمراں منتخب کیا۔ مگر انگریزوں نے اس کو تسلیم نہ کرکے عراق پر اپنا براہ راست کنٹرول قائم کرلیا۔ اب عراقیوں کی سمجھ میں آیا کہ ان کے ساتھ دھوکہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کردی۔ اس میں قبائلی بھی شامل ہو گئے۔ انگریزوں نے بغداد و موصل پر بمباری کرکے چار ہزار عراقیوں کو قتل کردیا۔ پھر بھی آزادی کی تحریکیں لگاتار چلتی رہیں۔ انگریزوں نے 23 اگست 1921 کو عراق میں قومی مجلس قائم کردی گرچہ اقتدار اب بھی برطانوی ہائی کمشنر کے ہاتھ میں مرکوز رہا۔ بالآخر تین اکتوبر1932 کو اپنے چند مفادات کے تحفظ کے معاہدے کے ساتھ برطانیہ نے عراق کی آزادی تسلیم کی اور وہ خود مختار ملک کی حیثیت سے UNO کی پیش رو جمعیۃ اقوام کا ممبر بنا۔

3.3.2 شام

جس طرح عراق پر انگریزوں نے قبضہ کیا اسی طرح استعماری طاقتوں نے شام کو فرانس کو دے دیا۔ جس نے پہلے تو اس کی مزید تقسیمیں کرکے اس کو غیر متحد کر دیا چنانچہ طرابلس، اورالجبل کو لبنان کے نام سے علیحدہ کر دیا گیا جس کی وجہ سے مسلمان اکثریت ایک دم اقلیت میں بدل گئی کیونکہ شام کے اِس جنوبی حصہ میں مسیحیوں کی بہت بڑی آبادی تھی۔ لبنان کے علاوہ لاذقیہ اور بلاد العلویین کے نام سے مزید چھوٹی ریاستیں بنائی گئیں۔ باقی جو بچا اُسے سوریا کے نام سے الگ ملک بنا دیا گیا۔ یوں شامیوں کو بہت کمزور کر دیا گیا تھا۔ مگر شامیوں نے پھر بھی ہار نہیں مانی انہوں نے پہلے مسلح جدوجہد کی اور جب ان کی فوجی بغاوت کچل دی گئی تو انہوں نے پرامن طریقے پر دوسرے محاذوں پر کام کیا۔ قاہرہ، پیرس، جنیوا اور نیویارک میں نشرواشاعت کے ادارے قائم کیے جریدے نکالے جس میں شکیب ارسلان بہت آگے تھے۔ آخر میں قوم پرستوں نے ایک عام ہڑتال کردی جو پچاس دن تک جاری رہی جس کے آگے حکومتِ فرانس کو آخر جھکنا پڑا۔ ستمبر 1936 میں

عرب قوم پرستوں اور حکومتِ فرانس کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے شام کو متحد کر دیا گیا۔ آزادی کی جدوجہد پھر بھی جاری رہی جس میں شامی رہنما شکری القوتلی کا قائدانہ کردار ادا کیا، آزادی کے بعد ان کو شام کا پہلا وزیر اعظم بھی بنایا گیا۔ کئی سال کی جدوجہد کے بعد آخرِ کار شام کو 1946 میں مکمل آزادی ملی اور اس کا نیا نام جمہوریہ سوریا رکھا گیا جس کو اردو میں سیریا یا شام کہا جاتا ہے۔

3.3.3 لبنان

لبنان کو عرب دنیا کی تفریح گاہ کہتے ہیں۔اس کا دارالحکومت بیروت کبھی پیرس کی مثال ہوا کرتا تھا۔ عہد قدیم میں اس خطہ کو فینیقیا کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بعد میں یہ شام سے ملحق کر دیا گیا۔ یادرہے کہ حروف تہجی فینیقیوں کی ہی ایجاد ہیں۔اسلام سے قبل یہاں کے باشندوں نے مسیحیت قبول کرلی تھی۔ خلافتِ راشدہ کے زمانہ میں اسلام اس کے ساحلی علاقوں میں پھیل گیا تھاالبتہ جبل لبنان میں مسیحی باقی رہے جو مارونی کیتھولک ہیں۔ صلیبی جنگوں کے درمیان وہ لاطینی مسیحی ریاست بن گیا تھا۔اس کے بعد ایوبی فتوحات کے بعد نیز عثمانی سلطنت کی توسیعی مہم میں دوبارہ اسلامی قلمرو میں شامل ہوا۔لیکن عثمانیوں نے یہاں جاگیرداری کا نظام باقی رکھا۔ یہ جاگیردار کبھی عیسائی ہوتے کبھی دروز۔1860 میں لبنان دروزاور مسیحیوں میں فرقہ وارانہ تصادم ہوا جو شام تک پھیل گیا جس میں کئی ہزار لوگ مارے گئے۔اس کو بہانہ بنا کر فرانس نے عیسائی باشندوں کے تحفظ کی آڑ میں اپنی فوج اتار دی، عثمانی سلطنت پر دباؤڈالا گیا کہ وہ لبنان کو شام سے الگ ایک ملک کی حیثیت دے۔اسی طرح اس کے والی کا مسیحی ہونا بھی ضروری قرار دیا گیا۔ فرانسیسی دور میں لبنان میں مسیحیت اور جدید مغربی افکار کو نفوذ کا ماحول میسر آیا۔ یہیں سے جدید عربی ادب کی داغ بیل پڑی اس کے علاوہ جدید عرب قوم پرستی کی تحریک کو بھی یہیں سے جلا ملی۔ آج لبنان میں زیادہ سیاسی اثرورسوخ مسیحی اقلیت کو حاصل ہے۔ملک کا صدر مسیحی،وزیر اعظم سنی اور پارلیمنٹ کا اسپیکر شیعہ ہوتا ہے۔یہاں مسیحیوں کے بہترین تعلیمی ادارے ہیں اور بیروت میں امریکن یونیورسٹی بھی ہے۔ معاشی طور پر لبنان ایک غریب ملک ہے۔

3.3.4 اردن و فلسطین

یہ دونوں ممالک بالکل جڑواں ہیں۔ تاریخی طور پر اردن یا جارڈن بھی لبنان کی طرح شام ہی کا ایک حصہ تھااور فلسطین بھی شام کا ایک صوبہ مانا جاتا تھا۔ موتہ کا وہ میدان جہاں سیف اللہ حضرت خالد بن الولیدؓ نے بے مثال جنگی ذہانت کا ثبوت دیا تھاوہ آج اردن میں ہی ہے۔اس کے علاوہ کرک اور عجلون نامی قلعے بھی جو عربوں نے تعمیر کیے تھے۔ پہلی جنگ عظیم تک اردن عثمانی سلطنت میں شامل تھا۔ مگر جب شریف حسین کی قیادت میں عربوں نے ترکوں سے غداری اور بغاوت کرکے برطانیہ کا ساتھ دیا تو شریف حسین کی اس خدمت کے بدلے میں برطانیہ نے اردن میں اس خاندان کو بادشاہ بنوادیا۔ چنانچہ اردن کے ہاشمی حکمراں سب شریف حسین کی اولاد ہیں۔ پہلا حکمراں شریف حسین کا بیٹاعبداللہ بن حسین تھا۔ وہ نہ صرف برطانیہ کے زیر اثر تھابلکہ انگریز نواز تھا۔اس کے سارے مشیر انگریز تھے۔اس کی فوج کی کمان بھی ایک انگریز گلوب پاشا کے ہاتھ میں تھی۔ جس نے فوج کو بہتر تربیت دے کر اُسے عرب لیجن (فوجی دستہ) کا نام دیا تھا۔اردن کا بیشتر حصہ ریگستانی ہے۔ذرائع آمدنی کم ہیں، شروع میں حکومت کے سارے اخراجات برطانیہ پورے کرتا تھااب امریکہ کی مدد سے پورے ہوتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اردن بظاہر آزاد ملک ہے مگر اس کی خارجہ پالیسی ہمیشہ مغرب کے ہاتھ میں رہی ہے اورآج بھی یہی صورت حال

ہے۔

حد تو یہ ہے کہ جب فلسطین کی ناجائز تقسیم کا منصوبہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں پاس کیا گیا تو تمام عرب ممالک نے اس کی مخالفت کی سوائے اردن کے جس نے اس کو تسلیم کیا تھا اور اس کے بعد اسرائیل سے تعلقات قائم کرنے میں بھی پہل کی تھی۔ یہی نہیں بلکہ اُس نے 1948 کی عرب اسرائیل جنگ میں اسرائیل سے تو کچھ نہیں واپس لیا البتہ فلسطین کا جو علاقہ اقوام متحدہ نے فلسطینیوں کو دیا تھا اُس پر بیت المقدس سمیت قبضہ کر لیا۔ اور ان کو اردن میں شامل کر لیا۔ تاہم 1967 کی جنگ میں عربوں کی بدترین ہار کے بعد وہ یہ سارا علاقہ کھو بیٹھا مگر اسرائیل نے مسجد اقصیٰ پر اردن کی تولیت برقرار رکھی۔ آج بھی اقصی کمپاؤنڈ کے تمام اخراجات اردن پورے کرتا ہے۔ 1948 کے فلسطینی نکبہ میں لاکھوں فلسطینیوں کو اسرائیل نے ان کے گھروں اور بستیوں سے نکال کر کھدیڑ دیا تو اِن مہاجرین کی بڑی تعداد قدرتی طور پر اردن پہنچ گئی۔ کسی زمانہ میں فلسطینی تحریک آزادی پی ایل او بھی اور دوسرے فلسطینی گروپ بھی اردن میں خاصی سرگرم تھیں۔ اِن تنظیموں نے حکومت اردن سے بھی تصادم مول لیا بلکہ بعض تنظیموں نے جن میں اشتراکی رجحان کے لوگ مسیحی جارج حبش کی سربراہی میں سرگرم تھے انہوں نے شمال کے حصہ میں آزاد حکومت قائم کر لی۔ فلسطینی چھاپہ مار اور اردن کی فوج 1970 میں آپس میں ٹکرا گئے۔

فلسطینیوں کی اس بغاوت کو کچلنے کے لیے ستمبر کے مہینہ میں اردن کی فوج نے پاکستانی فوجی افسران کی مدد سے ڈیڑھ ہزار سے زیادہ فلسطینی مجاہدینِ آزادی کو فوجی کارروائی میں قتل کر دیا ان کے اڈے تباہ کر دیے گئے۔ اسی لیے فلسطین کی تاریخ میں اس کو بلیک سپٹمبر یا کالا ستمبر مانا جاتا ہے۔ ایک فلسطینی نوجوان نے طیش میں آکر شاہ عبداللہ بن حسن کو اس وقت قتل کر دیا جب وہ مسجد اقصی میں نماز پڑھنے گئے تھے۔ اردن کا اسرائیل سے دفاعی اور اقتصادی معاہدہ ہے۔ آبادی کے لحاظ سے اردن میں آج بھی سب سے زیادہ فلسطینی رہتے ہیں مگر فلسطین کے لیے عملاً کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔

3.3.5 ترکی

خلافت عثمانیہ کی بدولت ترکی ایک عالمی قوت تھا۔ وہ ایشیا اور یوروپ دونوں براعظموں کو ملاتا ہے۔ اُس کی سلطنت بہت وسیع تھی۔ مگر بتدریج اُس کے اندر معاشی، علمی، فکری اور تعلیمی زوال آتا گیا جبکہ اُسی دوران یوروپ میں نئی قوتیں ابھر رہی تھیں۔ پہلی جنگ عظیم میں ترکی مدبروں سے یہ بڑی بھاری غلطی ہوئی کہ انہوں نے جرمنی کا ساتھ دیا اور بدقسمتی سے اِس اتحاد کو شکست ہوئی اور شکست نے خلافت کا خاتمہ کرا دیا۔ عربوں نے اپنے ممالک میں ترکوں سے بغاوت کر دی جس کا منصوبہ انہوں نے انگریز وغیرہ سامراجیوں سے مل کر بنایا تھا۔ اُس کے بعد مختلف ممالک کی فاتح اتحادیوں اٹلی، فرانس، یونان، رومانیہ اور انگریزوں نے مل کر بندربانٹ کر لی۔ باسفورس اور درۂ دانیال کے دونوں کے کنارے بشمول دارالخلافہ استنبول کے بین الاقوامی نگرانی میں دے دیے گئے۔ 16 مارچ 1920 کو اتحادی فوجیں بھی استنبول میں داخل ہو گئیں۔ ترکی فوجیں اگرچہ ہر محاذ پر شکست کھا رہی تھیں مگر ترک عوام بیدار ہوئے اور حریت پسندوں نے مصطفی کمال اتاترک کی قیادت میں ترک بادشاہت (خلافت) کی مخالفت کرتے ہوئے انقرہ میں الگ اور آزاد حکومت قائم کر لی۔ مصطفی کمال نے 1906 میں ہی ایک خفیہ تنظیم وطن و حریت کے نام سے قائم کر لی تھی۔ اور یہ ترک قوم پسند بیک وقت خلیفہ اور بیرونی استعماری قوتوں دونوں سے تصادم مول

لے رہے تھے۔ خلیفہ نہایت کمزور ہو چکا تھا کچھ نہ کر سکا۔ مصطفی کمال نے بیرونی محاذ پر توجہ مرکوز کی اور 1911 میں طرابلس اور بلقان کی جنگ میں بھی انہوں نے شرکت کی ۔ گیلی پولی یا درۂ دانیال کی جنگ میں انہوں نے برطانیہ اور فرانس کی متحدہ فوج کو پسپا کر دیا۔ اُس کے بعد ان کی یونانیوں سے کئی اور محاذوں پر جنگ ہوئی۔ نو ستمبر 1922 کو انہوں نے یونانیوں سے ازمیر بھی واپس لے لیا۔ ان کی فتوحات کو دیکھ کر اتحادیوں نے استنبول بھی خالی کر دیا۔ اتحادیوں اور ترکی کی نئی قوت کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس کو معاہدہ لوزان کہا جاتا ہے۔ اس کی رو سے ترکی کو ایک آزاد ملک تسلیم کر لیا گیا۔ مصطفی کمال اتاترک نے آزاد جمہوریہ ترکیہ کی بنیاد رکھی اور خلافت کے روایتی ادارہ کو ختم کر دیا گیا۔

مصطفی کمال کے آمرانہ اقدامات۔ جمہوریہ ترکیہ نے آزادی کے بعد پنج سالہ منصوبہ کے تحت ترقیاتی کام شروع کیے۔ یونان سے آبادی کی نقل مکانی کا معاہدہ کیا جس کی رو سے چار لاکھ ترک یونان سے ترکی آئے اور کئی لاکھ مسیحی یونان گئے۔ ملک میں داخلی استحکام پیدا کیا۔ کمال اتاترک کے ان قابل تحسین کارناموں کے ساتھ ہی ان کے کچھ نامعقول اور انتہاپسندانہ اقدامات بھی ہیں۔ مصطفی کمال نے سیکولرزم کی انتہاپسندانہ تعبیر کو اختیار کیا تھا جس کا نتیجہ مذہب سے جنگ کی صورت میں نکلا۔ چنانچہ انہوں نے ترکی زبان کا رسم الخط فارسی سے لاطینی کر دیا۔ جس کی وجہ سے ترکی کی نئی نسل کا رشتہ اپنے ماضی کے بیش بہا علمی سرمایہ سے کٹ گیا۔ عربی زبان کی مخالفت کی۔ اذان ترکی میں دی جانے لگی۔ مذہبی تعلیم یک قلم موقوف ہوئی، درویشوں اور صوفیاء کے سلسلوں کو مکمل طور پر بند کر دیا گیا۔ کیونکہ ان کو رجعت پسندی کی علامت سمجھا گیا تھا۔ عائلی قوانین اسلامی فقہ کی بجائے مغرب سے مستعار لیے گئے۔ اور ان چیزوں پر سختی سے عمل ہوا۔ پردہ اور حجاب پر پابندی عائد کی گئی، عرب دنیا سے رشتہ کاٹ لیا۔ اس طرح ایک انتہاپسندانہ ترک قوم پرستی ملک میں مسلط ہو گئی۔ اُس سے اختلاف کرنے پر ہزارہا مذہبی لوگوں کو جیلوں میں ٹھونس دیا گیا اور بہت سوں کو پھانسی دیدی گئی۔ ان سخت حالات میں شیخ بدیع الزماں سعید نورسی، ان کے شاگردوں اور ان کے رسائلِ نور نے ترکی میں اسلام کی شمع کو جلائے رکھا۔ اور برسوں کی جدوجہد کے بعد آج ترکی اِس مرحلہ میں پہنچ گیا ہے کہ اُسے عالم اسلام کا نمائندہ سمجھا جانے لگا ہے، اور آج ترکی ناٹو کا ممبر بھی ہے۔

3.3.6 ایران

ایران ماضی قریب میں عالم اسلام کی تیسری بڑی سلطنت دولت صفویہ کا مرکز رہا ہے۔ دوسرے دو مسلم ایمپائر سلطنت عثمانیہ اور ہندوستان میں مغل حکومت تھی۔ مغل اور عثمانی دونوں سنی تھے جبکہ دولت صفویہ شیعہ۔ جس وقت مغلوں کا دم واپسیں تھا ایران میں صفویہ کا خاتمہ ہوا اور ان کی جگہ نادر شاہ نے لی۔ جس نے بلائے بے درماں بن کر دہلی کو لوٹا اور وہاں قتل عام کیا۔ نادر شاہ کے بعد قاچاری حکومت کمزور پڑ گئی اور 1935 میں ایران میں ایک فوجی افسر رضا شاہ نے بغاوت کر کے اقتدار حاصل کر لیا اور پہلوی خاندان کی بنیاد رکھی۔ رضا شاہ پہلوی کے عہد سے ایران کا نیا عہد شروع ہوتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دنیا میں ہر طرف جمہوریت آگے بڑھ رہی تھی مگر رضا شاہ جمہوریت میں یقین نہیں رکھتے تھے بلکہ انہوں نے فوج کی مدد سے ملک میں ایک جابرانہ اور آمرانہ سلطنت چلائی۔ ملک کو مستحکم کرنے کی کوشش کی ۔ بغاوتوں کا خاتمہ کیا اپنے مخالفین کو خاموش کر دیا۔ چونکہ ملک میں پیٹرول دریافت ہو چکا تھا اس لیے انہوں نے ملک میں ترقیاتی کام کیے

، سڑکیں بنائیں، مختلف کارخانے لگائے ریل کی پٹری بچھائی گئی۔ نئی تعلیم کے لیے یونیورسٹی اور کالج قائم کیے گئے۔ جدید ایران پر مغربی قوتوں کا بالواسطہ تسلط قائم ہو گیا کیونکہ رضاشاہ مغربیت کا دلدادہ تھا، اُس نے 1935 میں برقع پر پابندی لگائی۔ خواتین کے لیے مغربی لباس کی حوصلہ افزائی کی۔ رضاشاہ کے آخری دور میں دنیامیں دوسری جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ ایران نے غیر جانبدار رہنے کا اعلان کیا مگر جغرافیائی محل وقوع نے اس کو بھی زبردستی جنگ میں ڈھکیل دیا کیونکہ روسیوں کو رسد اور کمک پہنچانے کا شارٹ کٹ راستہ براہ ایران جاتا تھا۔ اس لیے اتحادیوں نے ایران کو اپنے بلاک میں آنے کی دعوت دی جب اُس نے انکار کیا تو اتحادیوں یعنی برطانیہ اور روس نے اس پر حملہ کر دیا۔ 25 اگست 1941 میں یہ حملہ بیک وقت دو طرفوں سے ہوا تھا یعنی شمال سے روس نے اور جنوب کی جانب سے برطانیہ نے۔ ایران نے مقابلہ کرنے کی کوشش کی مگر اتنی بڑی طاقتوں کا وہ اکیلے مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے اس کو ہتھیار ڈال کر مذاکرات کرنے پڑے۔ اتحادیوں کی ایماء پر رضاشاہ اپنے بیٹے محمد رضا کے حق میں تخت سے دستبردار ہوئے اور جلاوطن ہو گئے۔ ایران اور اتحادیوں کے بیچ ہوئے معاہدے کی رو سے اتحادی فوجیں ایران پر قابض ہو گئیں۔ بادشاہ برائے نام تھا اختیارات سب اتحادیوں کے ہاتھ میں تھے۔ چار سال اس طرح سے ایران پر استعماری قوتوں کا براہ راست قبضہ رہا۔

بالآخر دو مارچ 1946 کو معاہدہ کی مدت ختم ہوئی اور برطانوی وامریکی فوجیں ایران سے نکل گئیں۔ مگر روس نے اس معاہدہ کا احترام نہیں کیا۔ اور فوجی انخلاء کے لیے یہ شرط لگائی کہ ایران اس کو ملک کے شمالی حصہ میں تیل نکالنے کی مراعات دے۔ ایران کو مجبوراً یہ شرط ماننی پڑی اور اس کے نتیجہ میں مئی 1946 میں آخر کار روس نے بھی ایران کو چھوڑ دیا۔ اور یوں ایران سامراجی قوتوں سے آزاد ہو گیا۔ تاہم بالواسطہ مغربی قوتوں کا دبدبہ محمد رضاشاہ کے دور میں اور بڑھ گیا۔ رضاشاہ نے علما اور مذہبی عناصر کو کچلنا شروع کیا، امریکہ اور اسرائیل سے اس کی قربتیں بے حد بڑھ گئیں۔ اکتوبر 1947 میں ایران اور امریکہ کے درمیان فوجی معاہدہ ہوا جس کے بعد ایران اس خطہ میں اسرائیل کے بعد دوسری امریکی چوکی بن گیا۔ شاہانہ عیاشیوں، عوام کی غربت اور معاشی بدحالی اور مذہبی عناصر کی پکڑ دھکڑ کے بعد 1978 میں شاہ کے خلاف ایک عوامی تحریک کا آغاز ہو گیا۔ جسے پولیس اور خفیہ ایجنسی ساواک نے بڑے تشدد کے ذریعہ روکنے کی کوشش کی مگر یہ انقلاب کی یہ لہر بڑھتی ہی چلی گئی جس کی قیادت ایک عراق میں جلاوطن کر دیے گئے ایک عالم آیت اللہ روح اللہ خمینی کر رہے تھے جن کو بعد میں پیرس جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ 16 / جنوری 1979 میں بڑے خون خرابہ کے بعد یہ عوامی تحریک آخر کار کامیاب ہو گئی شاہ کو ملک چھوڑ کر فرار ہونا پڑا۔ ملک میں اسلامی انقلاب آ گیا اور آیت اللہ خمینی نے فرانس سے آ کر نئی حکومت کی رہبری شروع کر دی اسی دن سے ایران سے مغربی سامراج کے اثرات بالکل ختم ہو گئے۔

3.3.7 سعودی عرب

جزیرہ نمائے عرب یا جزیرۃ العرب خلافتِ عباسیہ کے کمزور پڑ جانے کے بعد ہی سے آزادِ قبائلی سرداروں کے ماتحت رہتا آیا ہے۔ خلافت عباسیہ یا اس کے بعد دوسری سلطنتوں کا سکہ وہاں بس برائے نام ہوتا تھا۔ خلافتِ عثمانیہ نے البتہ یہاں اپنی بالادستی قائم کی تھی۔ لیکن انہوں نے بھی اندرونی نظم ونسق شریف حسین آف مکہ کے ذریعہ ہی چلایا جو عربوں میں سادات کا لقب ہوتا ہے۔ شریف حسین کے دماغ

میں بڑا بیٹے کا خبط تھا وہ چاہتا تھا کہ ایک خود مختاراورآزاد عرب بادشاہت قائم کرے۔اس کے لیے اس نے نہایت غلط راستہ اپنایااور عثمانی ترکوں کے بر خلاف 1915 میں انگریزوں سے خفیہ معاہدہ کرلیاجسے ہنری میک ماہن - حسین معاہدہ کہتے ہیں۔اس کے تحت انگریزوں نے ترکوں سے بغاوت کرنے کے انعام میں شریف حسین کو ایک الگ بادشاہت قائم کرکے اس کا بادشاہ بنانے کاوعدہ کیا تھا۔لیکن ترکوں کی شکست کے بعد انہوں نے اپناوعدہ وفا نہیں کیا۔دوسرے عرب سرداروں اورامراء کو حسین کی پالیسیوں سے اختلاف تھا۔عرب امراء کی اسی انتشار فکری سے فائدہ اٹھاکر نجد کے علاقہ درعیہ کے امیر عبدالعزیزبن سعود نے شریف حسین پر حملہ کردیا۔عبدالعزیز کے جداعلی محمد بن سعود نے نجد کے مشہور عالم و مصلح محمد بن عبدالوہاب (1703-1791) کے ہاتھ پر بیعت کرکے درعیہ سے آگے نکل کر کافی حصہ فتح کرلیااوراپنی مملکت قائم کرلی تھی۔لیکن پھرباب عالی یعنی عثمانی دربار کی ایماء پر مصر کے والی محمد علی نے ان پر حملہ کیااور بن سعود کی فوج کو شکست دے کر درعیہ کو برباد کردیا تھا۔1818 میں آل سعود کی یہ پہلی چھوٹی سی حکومت ختم ہوگئی تھی اور یہ خاندان مہاجرت کرکے کویت چلا گیا تھا۔عبدالعزیزاس خاندان کی دوسری زبردست شخصیت تھی جنہوں نے اسّی سال بعد اپنے خاندان کے کھوئے ہوئے وقار کو بحال کرنے کی جدوجہد کی اور شریف حسین کو شکست دے کر حجاز پر قبضہ کرلیا۔شریف حسین کا خاندان بھاگ کراردن چلا گیا جہاں ان کے لیے انگریزوں نے ان کی خدمات کے صلہ میں مملکتِ ہاشمی قائم کرکے ان کو دے دی تھی۔بہر حال 22 ستمبر 1932 کو جزیرۃ العرب کی اِس نئی حکومت نے اپنی مملکت کا نام سعودی عرب تجویز کیااور عالم اسلام کے علماء کی ایک مؤتمر بلائی۔ابن سعود نے ملک میں امن وامان قائم کیا، مذہبی اصلاحات کیں۔بدوؤں کو شہروں میں آباد کیا اور جب ان کے دور کے اخیر میں ملک میں بڑے پیمانے پر پیٹرول نکل آیاتوانہوں نے اوران کے بعد شاہ فیصل نے اس دولت سے فائدہ اٹھاکر ملک کو ایک جدید اسلامی فلاحی ریاست بنادیا۔لیکن اس ملک کا منفی پہلواس میں ملوکیت کا نظام ہے۔وہاں جمہوری قدروں کی بڑی کمی ہے۔رائل فیملی ملک کے ہر شعبہ پر چھائی ہوئی ہے۔علماء ودانشور حکومت سے کوئی اختلاف نہیں کرسکتے اگر کرتے ہیں توجیلوں میں ڈال دیا جاتا ہے۔آج سعودی عرب اس خطہ کی بہت بڑی اکانومی ہے اورعالم اسلام کا ایک طرح سے مذہبی سربراہ ہے۔

3.3.8 یمن

یمن بھی جزیرہ نمائے عرب کا اہم ملک ہے۔اورسب سے زیادہ زرخیز وشاداب ملک ہے۔قرآن میں جس قوم سبااورعادارم کا تذکرہ آیاہے اس کا مستقر یہی خطہ تھا۔بقیہ جزیرۃ العرب کے برعکس تاریخی طور پر یمن ہمیشہ متمدن قوموں اور سلطنتوں کی آماجگاہ رہا ہے۔ اسلامی تاریخ میں خلافت عباسیہ کی کمزوری کے دور میں یہاں آزاداور مستقل مقامی حکومت قائم ہوگئی تھی، لیکن بیچ بیچ میں کبھی فاطمی، کبھی سلجوقی اور کبھی ایوبی یا مملوک اقتدار بھی قائم ہو جاتا۔چونکہ جغرافیائی لحاظ سے یمن باقی عالم اسلام سے الگ تھلگ پڑ جاتا ہے اس لیے وہ مادی ومعنوی طور پر کبھی کوئی خاص ترقی نہ کرسکا۔بعد میں عثمانی قلمرو میں شامل کرلیا گیا۔یمن کی عام آبادی زیدی شیعوں کی ہے جو اہلِ سنت سے بہت قریب ہیں۔اس لیے وہ سنی عثمانی اقتدار کے خلاف باربار بغاوتیں کرتے رہے۔اور 1918 میں جب ترک فوجیں وہاں سے چلی گئیں تو زیدی امام یحیٰ کی حکومت پورے یمن پر قائم ہوگئی۔یوروپی استعمار نے یمن پر سیدھے قبضہ نہیں کیا کیونکہ ان کو اس سے کوئی معاشی وسیاسی

فائدہ ہونا نہیں تھا۔ البتہ یمن کے علاقہ حضرموت کے ساحلی شہر عدن پر برطانیہ نے قبضہ کر لیا تھا۔ اور اُس کو ترقی دے کر ایک بڑی بندرگاہ بنادیا تھا۔ یہ عرب کے جنوبی ساحل پر ہے اور ملک یمن کا جنوبی حصہ ہے۔ بعد میں یہ یمن سے کٹ کر الگ ریاست بن گیا۔ یہاں انگریزوں کی وجہ سے تعلیم عام ہوئی اور اس کے نتیجہ میں مقامی لوگوں میں آزادی کے جذبات بیدار ہوئے۔ آزادی کی ان تحریکوں کے قیام کے بعد برطانیہ نے 1967 میں از خود جنوبی یمن کو خالی کر دیا اور آزاد ریاست بن گیا۔ یہاں بیرونی قوتوں کے عمل دخل سے سوشل ازم نے فروغ پایا الحادی نظریات کا بول بالا ہوا۔ روس نے اس کی امداد کی اور نتیجہ یہ ہوا کہ آزادی کے بعد شمالی یمن سے اِن کا کئی بار تصادم ہوا۔ بحیثیت مجموعی یمن ایک غریب ملک ہے اور خانہ جنگی کا شکار بھی۔

3.4 شمالی افریقہ کے ممالک

3.4.1 مصر

موجودہ دور میں عرب دنیا کا سب سے بڑا ملک ہے تمدنی لحاظ سے سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور آبادی کے لحاظ سے بھی سب سے زیادہ ہے۔ مگر پیٹرول جیسی معدنیات سے محروم ہونے کی وجہ سے اب خلیجی ممالک سے معیشت میں پیچھے رہ گیا ہے۔ اس کی معیشت کا دار و مدار دریائے نیل سے ہونے والی آبپاشی اور زراعت پر ہے۔ کپاس یہاں کی خاص پیداوار ہے۔ تاریخ اسلام میں وہ اسلامی خلافت کا حصہ رہا ہے۔ عباسیوں کے زوال کے بعد یہاں اخشیدی، طولونی، فاطمی اور ایوبی اور مملوکوں کا اقتدار رہا۔ مملوکوں سے عثمانیوں نے اس کو لے کر اپنی متحدہ خلافت عثمانیہ کا حصہ بنالیا تھا۔ عثمانیوں کے کمزور ہونے کی وجہ سے 1798 میں فرانس کے مشہور فاتح نپولین نے مصر پر قبضہ کر لیا۔ اس شر سے ایک خیر یہ برآمد ہوا کہ فرنچ حکومت نے مصر کو جدید ترقیوں سے روشناس کرادیا۔ یہاں پرنٹنگ پریس لائے، اخبار نکالے، فوجوں کی جدید تربیت کی، ڈاکخانہ قائم کیا، آبپاشی کا نیا نظام قائم کیا۔ تاہم جلد ہی انگریز اور ترک فوجوں نے متحد ہو کر 1801 میں فرنچ قبضہ کر ختم کرادیا۔ آزادی کی اِس پہلی لڑائی میں ایک عثمانی البانوی ترک افسر محمد علی پاشا نے نمایاں خدمات انجام دی تھیں۔ اس لیے اس کی خدمات کے اعتراف میں عثمانی سلطنت نے 1805 میں محمد علی کو ہی مصر کا والی بنادیا۔ جس نے بتدریج مرکز سے الگ اپنا اقتدار مضبوط کر لیا اور خود مختار ہو گیا۔ خلافت عثمانیہ اپنی داخلی مشکلات و بحرانوں کے باعث اس سے کوئی باز پرس نہ کر سکی۔ محمد علی نے خدیو کا لقب اختیار کیا اور پھر پوری ایک صدی تک اُس کی اولاد ہی مصر پر حکمراں رہی۔ لیکن 1882 میں مصر پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا۔ انہوں نے خدیو کو محل میں باقی رکھا البتہ اختیارات قاہرہ میں رہنے والے انگریز کونسل جنرل کے ہاتھ میں ہوتے تھے۔ پہلا انگریز کونسل جنرل لارڈ کرومر تھا جو 1883 سے 1907 تک رہا۔ انگریزوں کا یہ اقتدار 1922 تک یعنی پورے چالیس سال رہا۔

برطانوی دور آزادی کی تحریک

برطانوی دور میں محمد علی پاشا نے جو جدید ترقیاں شروع کی تھیں، ان میں رکاوٹ نہیں ڈالی گئی وہ جاری رہیں۔ جدید عربی ادب پھلا پھولا، جدید عربی شعر و ادب کے ارکان خمسہ محمود سامی البارودی، احمد شوقی، محمد حافظ ابراہیم بک، مطران خلیل اور اسماعیل صبری پاشا سب

اسی دور میں تھے۔ محمود سامی بارودی جدید وقدیم کے مابین ایک سنگم تھے۔ احمد شوقی دور جدید کے سب سے بڑے شاعر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مصر میں ان کو وہی مقام حاصل ہے جو برصغیر میں اقبال کو حاصل ہے۔ احمد شوقی اسلام اور خلافت اسلامیہ کے وکیل وترجمان تھے۔ صبری پاشا کو شیخ الشعراء کہا جاتا تھا۔ حافظ ابراہیم شاعر العروبہ کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ انگریزی دور میں سوڈان مصر سے الگ ہوا۔ اوراسی دور میں ملک کے نو فیصد قبطی عیسائی اس کی معیشت وتجارت وصنعت اور سرکاری ملازمتوں میں چھاگئے۔ یہی صورت حال آج بھی برقرار ہے۔ انگریزی دور میں مصر میں شراب اور جوئے خانے، نائٹ کلب اور قحبہ گیری کے اڈوں کو لائسنس مل گیا۔ فلم ڈرامااورآرکیسٹرا وغیرہ وجود میں آئے۔ اس کے علاوہ شرعی قوانین کو کلعدم کرکے مغربی قوانین رائج کیے گیے۔ لارڈ کرومر نے اسلام کے عائلی قوانین پر سخت تنقید کی۔ انگریزوں اور ترکوں میں نفرت کو بڑھاوادیا۔ انگریزوں نے جدید تعلیم یافتہ قوم پرست مصریوں میں اس خیال کو پروان چڑھایا کہ اسلام جدید دور کے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ چنانچہ بعد میں مصری ادیب اوروزیر معارف (وزیر تعلیم) ڈاکٹر طٰہٰ حسین اوران کے حامیوں نے اس خیال کا پرچار کیا۔

آزادی: سنہ 1922 میں مصر کو پوری آزادی ملی۔ انگریزوں نے شاہ فاروق کو برقرار رکھ کر اپنے اقتدار کو طول دیناچاہاتھا۔ مگر کچھ مصری فوجیوں نے اوران کے ساتھ ہی بائیں بازواور دائیں بازو کی قوتوں نے بادشاہت کا تختہ پلٹ دیااور مصر پر فوجی حکمران مسلط ہوگئے جو کم وبیش آج تک چلے آتے ہیں۔ اس بیچ میں جمہوریت کو بہت کم حکومت کرنے کا موقع ملا صرف چند سال صدر مرسی کی قیادت میں ورنہ ابھی تک فوجی آمروں کی حکومت ہی چلی آتی ہے۔

3.4.2 سوڈان

سوڈان اور مصر دونوں ہی افریقہ میں پڑتے ہیں۔ دونوں دریائے نیل سے سیراب ہوتے ہیں۔ تاہم دونوں کے باشندوں میں رنگ وروپ اور تہذیب وثقافت کا زبردست فرق پایاجاتاہے۔ آثار قدیمہ کی نئی دریافتوں سے پتہ چلاہے کہ سوڈان میں بھی تاریخ میں بڑی بڑی سلطنتیں اور تہذیبیں رہ چکی ہیں۔ مصر سے متصل اُس کا علاقہ نوبیہ کہلاتاہے۔ سوڈان میں مسیحیت بھی بہت پہلے ہی داخل ہوچکی تھی۔ جنوب کے علاقہ میں ان کی اتنی تعداد بڑھ گئی کہ اب سے دودہائی قبل انہوں نے علیحدگی کی تحریک چلائی جس کو یوروپی حمایت حاصل ہوئی اور بالآخر اقوام متحدہ کی مداخلت سے جنوبی سوڈان کو الگ ملک بنادیا گیا۔

شمالی سوڈان جس کو سونار بھی کہتے ہیں، میں مسلمان آٹھویں صدی عیسوی میں ہی داخل ہوگئے تھے۔ جو بڑھتے بڑھتے مغرب کے علاقہ دارفور تک چلے گئے۔ سولوھویں صدی تک ان علاقوں میں مسلمانوں کی کئی بڑی اور مضبوط حکومتیں قائم ہوئیں جو ہند میں مغلیہ حکومت کی ہم عصر تھیں۔

سنہ 1883ء میں درویش تحریک کا ظہور ہوا جس کی رہنمائی محمد احمد مہدی سوڈانی کررہے تھے۔ کہاجاتاہے کہ انہوں نے مہدی ہونے کا دعوا بھی کیاتھا۔ انہوں نے اس تحریک کو کامیاب کیااور سوڈان کے دوسرے چھوٹے بڑے حکمرانوں کو زیر کرکے پورے سوڈان پر قبضہ کرلیا۔ انہوں نے وہاں عملاً کتاب وسنت کی بالادستی قائم کی، اسلامی اصلاحات کو سختی سے نافذ کیا، شراب وجوے پر پابندی لگائی۔ بدعات

ورسوم کا خاتمہ کیا۔ مصر کے مسلمان حکمرانوں نے انگریزوں کی مدد سے اس تحریک کو کچلنا چاہا۔ مہدی سوڈانی 1885 میں انتقال ہو گیا جب وہ مصر پر حملہ کی تیاری کر رہے تھے۔ ان کے جانشین خلیفہ عبداللہ بن مہدی نے مصر پر حملہ کیا جو ناکام ہو گیا۔ اور پھر جدید اسلحہ سے لیس مصری وانگریز فوجوں نے سوڈان پر حملہ کر دیا۔ درویشوں نے بہادری سے مقابلہ کیا مگر جدید ٹیکنالوجی سے مات کھا گئے۔ خلیفہ عبداللہ مارا گیا اور یوں انگریزوں نے سوڈان پر قبضہ کر لیا۔ انگریزی دور 1899ء 1956 تک رہا۔ جس کے دوران ترقیاتی کام ہوئے۔ آبپاشی کا نظام قائم کیا گیا۔ جدید تعلیم پر توجہ دی گئی، خرطوم میں یونیورسٹی قائم کی گئی۔ انگریزوں نے 19 جون 1948 میں مجلس قانون ساز بھی قائم کی۔ انہوں نے جنوب کے مسیحیوں کی سرپرستی کی اور ان کو اتنا طاقتور کر دیا کہ ملک کی آزادی کے بعد سوڈان کی کوئی بھی حکومت ان کو دبا نہ سکی۔ یکم جنوری 1956ء کو برطانیہ نے سوڈان کو آزاد کر دیا۔ مگر آزادی کے بعد کچھ عرصہ تک ہی سیاسی استحکام رہا جلد ہی ملک قحط، مالی بحران اور سیاسی عدم استحکام کا شکار ہو گیا۔ کئی بار فوجی آمروں کی حکومت رہی۔ آخر میں جنرل عمر حسن البشیر نے اسلام پسندوں کی مدد سے اقتدار پر قبضہ کیا۔ جس میں اخوان کے رہنما ڈاکٹر حسن ترابی نے حکومت میں اہم رول ادا کیا۔ تاہم ان کے اور صدر کے بیچ جلد ہی اختلافات پیدا ہو گئے۔ جنرل عمر البشیر کی حکومت لمبے عرصہ تک چلی، اس کے بعد عوام نے انقلاب لا کر ان کو حکومت سے دست برداری پر مجبور کر دیا۔ مگر مالی وسائل کی قلت، امریکی پابندیوں، قبائلی خانہ جنگی اور مسلسل بیرونی مداخلت کی وجہ سے سوڈان اب بھی خلفشار اور شدید خانہ جنگی کا شکار ہے۔

3.4.3 جمہوریہ تیونس

شمالی افریقہ میں تونس(Tunisia) ایک اہم ملک ہے۔ تاریخی طور پر وہ خلافت راشدہ کے زمانہ میں ہی مسلمانوں کے زیر نگیں آ گیا تھا۔ یہاں پہلے اغالبہ حکمراں رہے جنہوں نے صقلیہ اور جنوبی اطالیہ کے بعض حصوں تک اسلامی اقتدار یوروپ میں پہنچایا۔ ان کے زوال کے بعد فاطمیوں نے حکومت کی جو شیعہ تھے۔ اس کے بعد کچھ عرصہ تک صنہاجی خانوادہ اقتدار میں رہا۔ یہاں سب سے بڑی حکومت موحدون کی تھی جس کا بانی عبدالمؤمن موحد تھا۔ موحدون نے اپنا اقتدار اسلامی اندلس تک وسیع کر دیا تھا۔ ان کے زمانہ میں تونس میں قیروان کے بعد تونس شہر کو بھی علمی طور پر عروج حاصل ہوا اور اسی کے نام پر پورے ملک کو تیونس کہا جانے لگا۔ تاریخ میں علم اجتماع یا فلسفۂ تاریخ کے بانی ابن خلدون(1332ھ تا1406ھ) تونس کی سب سے بڑی علمی شخصیت گزرے ہیں۔

1534ء میں تونس کو مشہور عثمانی امیر البحر خیر الدین پاشا نے فتح کر لیا تھا اور 1881 تک پھر انہیں کی بالادستی قائم رہی۔ لیکن بابِ عالی(ترکی دربار خلافت) نے اُس کو اندرونی طور پر خود مختاری دے رکھی تھی۔ پہلے مرادبے کا خاندان حکمراں رہا۔ اس کے بعد 1710ء سے 1957 تک حسین بے کی اولاد حکمراں رہی۔ جن کا اقتدار برائے نام تھا اصل اختیارات فرانسیسیوں کو حاصل تھے جنہوں نے ملک کو معاشی قرضے دیے تھے اور 12 مئی 1881 کو معاشی قرضوں کی وصولی کے بہانے فرانس نے فوجی مداخلت کر دی۔ عثمانی سلطنت اپنے داخلی بحرانوں کی وجہ سے تونس کی کوئی مدد نہ کر سکی۔ لہذا فرانس کی حکومت سے تونس کے کمزور حکمرانوں نے ایک معاہدہ کر لیا جس کو قصر السعید کا معاہدہ کہتے ہیں۔ اس کی رو سے تونس فرانس کا زیر حفاظت علاقہ قرار دیا گیا۔

اس کے بعد تونس کا اصل حکمراں فرنچ ریزیڈینٹ جنرل بن گیا۔ لیکن انگریزی اور فرنچ کالونیوں میں یہ فرق ہوتا تھا کہ فرانسیسی

باضابطہ اپنی سامراجی کالونیاں بساتے تھے۔ چنانچہ تونس میں فرنچ لوگوں نے زمینیں خریدیں، اپنی کالونیاں آباد کیں، وہاں تجارت اور معیشت پر وہ چھاگئے۔ اس طرح تونس کے بڑے بڑے شہروں میں فرنچ لوگوں نے اپنے کلچر اور ثقافت کو فروغ دیا مقامی ثقافت کو دبایا یہاں تک کچھ ہی عرصہ میں وہ شہر تونسی اور عربی واسلامی کم فرانسیسی اور یوروپین زیادہ لگنے لگے۔ بڑھتے بڑھتے فرنچ تونس میں دس فیصد کے قریب پہنچ گئے۔ البتہ اس سامراج کا بالواسطہ فائدہ یہ ضرور ملک کو ہوا کہ ریلیں، سڑکیں، بندرگاہیں، جدید اسکول اوراسپتال وغیرہ نئی سہولیات فرنچ لوگوں نے بنائے۔ زراعت، باغبانی اور کان کنی کی طرف توجہ کی گئی لیکن تمام اچھی زمینیں غیر ملکیوں کے قبضہ میں ہونے اور ملازمتوں پر ان کی اجارہ داری کی وجہ سے مقامی آبادی ترقی کے فوائد سے محروم تھی۔ جس کے رد عمل میں 1907 سے ملک کی آزادی کی تحریک شروع ہوگئی۔ 1919 میں الحزب الدستوری قائم ہوئی جو ملک کی مکمل آزادی کا مطالبہ کررہی تھی۔ آزادی پسندوں میں اسلام پسند اور جدیدیت پسند دونوں عناصر متحد تھے۔ اسلام پسندوں کی ترجمانی شیخ عبدالعزیز ثعالبی کررہے تھے جبکہ سوشلسٹ اور ترقی پسند عناصر کی قیادت ایک انقلابی اور تیز طرار نوجوان حبیب بورقیبہ کررہے تھے۔

حبیب بورقیبہ نے 1934 میں اسلام پسندوں سے ناطہ توڑکر حزب دستور جدیدہ کے نام سے ایک نئی پارٹی بنائی اور ملک میں آزادی کی تحریک چلانے لگے۔ ان کو کئی بار گرفتار بھی کیا گیا۔ انہوں نے مختلف ممالک کے دورے کیے اور وہاں اپنے ملک کی آزادی کے لیے حمایت حاصل کی۔ بالآخر 20مارچ 1956 میں فرانس نے تونس کو آزادی دے دی۔ حبیب بورقیبہ کی پارٹی نے حکومت بنائی اور حبیب بورقیبہ پہلے وزیراعظم بنے۔ وہ آزاد خیال اوراصلاح پسند تھے انہوں نے روایتی بادشاہت کو ختم کرکے ملک کو جمہوریہ بنادیا۔ امریکی طرز کا صدارتی نظام پسند کیا۔ جس کے بعد وہ آمر مطلق بن گئے اور ہر بار انتخابات میں صرف وہی جیتنے لگے اور 1987 تک وہ اکیلے ہی صدر منتخب ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ جنرل زین العابدین بن علی نے فوج کی مدد سے اقتدار سے بے دخل کردیا۔ بورقیبہ نے ترقیاتی کام توکیے مگر ان کی مغربیت انتہا پسندانہ تھی اورانہوں نے رمضان کے روزوں پر بھی اعتراض کیا تھا کہ ان سے قوتِ کار میں کمی آتی ہے۔ جس کے بعد سے ان کی مقبولیت میں بے حد کمی آئی۔ ان کے بعد بن علی بھی آمر مطلق کی طرح ملک پر پورے چالیس سال مسلط رہے اورانہوں نے ہر طرح کی بدعنوانیاں کیں۔ معاشی بدحالی کے مارے ملک میں ایک خوانچہ فروش البوعزیزی نے غصہ اورمایوسی میں اپنے آپ کو آگ لگالی جس کے بعد عوامی غیض وغضب کا طوفان اٹھااوراس ریلے میں بن علی کا اقتدار تنکے کی طرح بہ گیااور بہت سے عرب ممالک میں بہارِ عرب کا آغاز ہوا۔

3.4.4 الجزائر

الجزائر کوالجیریا بھی کہتے ہیں۔ یہ مراکش اور تونس کے بیچ میں واقع ہے اور شمالی افریقہ کا تیسرا بڑاملک ہے۔ عہد جدید میں الجزائر دنیا بھر میں اپنی جنگ آزادی کے لیے مشہور ہوا۔ کیونکہ فرانس کے خلاف الجزائر کے لوگوں کی یہ جنگِ آزادی بہت طویل اور خون آشام رہی۔ اِس میں لاکھوں الجزائری شہید ہوئے۔ تب جاکر الجزائر آزاد ہو پایا۔ الجزائر کے فرانسیسی سامراج کی کہانی اسرائیل سے ملتی جلتی ہے۔ لیکن فرق اتناہے کہ الجزائر کے مجاہدینِ آزادی کو پوری دنیا کی حمایت حاصل تھی اور عرب ملکوں نے بھی بڑی سرگرمی سے اِس جہاد کو سپورٹ کیا تھا۔ بدقسمتی سے اب عرب حکمراں فلسطین کی مدد وحمایت نہیں کرتے۔ اور دنیا کی سپرپاورامریکہ کی ہر طرح کی جانبدارانہ طریقہ پر پوری

امداد و پرجوش حمایت بھی اسرائیل کو حاصل ہے۔

بہر کیف تیر ہویں صدی تک الجزائر میں اغالبہ ،فاطمیین اور موحدون کی حکومتیں رہیں۔1553ء میں الجزائر کو ترک امیر البحر خیر الدین باربروسا نے فتح کر کے اُس کو خلافتِ عثمانیہ کا ایک حصہ بنا دیا۔ الجزائر کا ترکی دور 1830 تک قائم رہا۔ تاہم اس دور میں حکومت کا نظم و نسق مقامی حکمراں چلاتے تھے۔ بابِ عالی سے ان کو سند حاصل ہوتی تھی۔ جب سلطنتِ عثمانیہ خاصی کمزور ہو گئی تو یوروپ کی مختلف سامراجی قوتوں نے اُس کے ماتحت ممالک میں مداخلت شروع کر دی۔ ایسے ہی ایک مسئلہ کو بنیاد بنا کر فرانس نے الجزائر میں فوجی مداخلت کی۔ وہ مسئلہ تھا فرانس اور الجزائر کے مابین غلہ کی فراہمی کا۔ دونوں ملکوں کے مابین مصالحت کسی نتیجہ پر پہنچی نہ تھی کہ فرانس نے اپنے بحری بیڑے سے تین سال تک الجزائر کی معاشی ناکہ بندی کر دی۔ عثمانی ترک اپنے بحرانوں میں الجھے ہوئے تھے وہ الجزائر کی کوئی مدد نہ کر سکے۔ الجزائر نے پھر بھی فرانس کی ماتحتی قبول نہ کی تو فرانس نے باضابطہ ایک بڑی بری فوج ملک کے اندر اتار دی اور پہلے الجیریا، پھر بجایہ اور وہران پر قبضہ کر لیا۔ الجزائر میں مختلف قبائل آپس میں بر سرِ پیکار تھے۔ ایک عالم دین امیر عبد القادر الجزائری نے مختلف قبائل کو اپنے جھنڈے تلے متحد کر کے کئی سال تک فرنچ سامراج کی کامیاب مزاحمت کی۔ انہوں نے کئی محاذوں پر فرانسیسیوں کو شکستیں دیں۔ اور 1839 میں ملک کے مغربی حصہ میں اپنی ایک آزاد حکومت بھی قائم کر لی اور وہاں اسلامی نظام نافذ کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد فرانس نے پھر حملہ کیا۔ اس کی فوجوں کی بہت بڑی تعداد اور جدید اسلحے و ٹیکنالوجی کے سامنے مزاحمتی قوتوں کے لیے اپنا دفاع جاری رکھنا ناممکن ہو گیا کہ وہ ناممکن کی چٹان سے ٹکرانا تھا اس لیے 21 دسمبر 1947 کو امیر عبد القادر ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔ اس کے بعد پورے الجزائر پر فرانس کا قبضہ و تسلط ہو گیا۔

فرانس نے الجزائر کو اپنی نو آبادی بنا لیا۔ اس کے سرسبز علاقوں اور خوبصورت وادیوں میں فرانسیسیوں نے بڑے پیمانے پر زمینیں خریدیں اور وہاں آباد ہونے لگے۔ تمام بڑے شہر فرانسیسی شہریوں سے پٹ گئے۔ ان کی خدمت کے لیے ترقیاتی کام بھی ہوئے ریلوں کا نظام بچھایا گیا، کارخانے بنائے گئے، اسپتال اور اسکول کھولے گئے ہزاروں میل لمبی سڑکیں نکالی گئیں، جدید عمارتوں اور خوبصورت باغوں اور پارکوں کی وجہ سے الجزائر یورپ کا ایک خطہ لگنے لگا۔ مگر مقامی آبادی بڑی حد تک ان ترقیاتی کاموں کے ثمرات و فائدوں سے محروم رہی۔ ملک کو فرانس نے اپنے رنگ میں رنگ دیا۔ اسکولوں میں فرنچ زبان لازمی ہو گئی۔ اور فرنچ کلچر و ثقافت نے عربی کلچر و ثقافت کو ہر سطح پر دبایا۔ جس کا ردعمل شروع ہوا۔

الجزائر میں مسلح تحریکِ آزادی 1924ء سے شروع ہوئی جب ایک مزدور رہنما مسالی حج نے الجمعیہ الافریقیہ الشمالیۃ کے نام سے ایک تنظیم قائم کی۔ اس کے بعد دھیرے دھیرے دوسری تنظیمیں بھی وجود میں آئیں جن میں فرحت عباس نے حزب منشور الجزائر قائم کی اور علما میں شیخ عبد الحمید بن بادیس نے الجمعیۃ الجزائریۃ الاسلامیہ قائم کی۔ اس کا رابطہ جامعہ الزیتونہ اور جامعۃ القرویین سے تھا جو افریقہ میں بڑی اور قدیم اسلامی دانشگاہیں تھیں۔ یہ ملک میں اسلامی ثقافت کے احیاء اور الجزائر کے افریقی ممالک سے اتحاد اور فرانس سے آزادی کے لیے کام کرتی تھی۔ شیخ ابن بادیس نے البصیرۃ کے نام سے ایک ہفت روزہ ترجمان بھی جاری کیا جس کا بہت شہرہ تھا۔ اس کے علاوہ کچھ نیم عسکری گروپ اور بھی تھے۔ تحریک آزادی کے مختلف گروپوں اور دھڑوں نے 1954 میں ایک قومی محاذ بنایا اور فرنچ سامراج کے خلاف

مسلح بغاوت کا اعلان کیا۔ ستمبر 1958 میں قومی محاذ نے الجزائر کی قومی عارضی گورنمنت بھی قائم کی۔ سات سال آزادی کی یہ مسلح تحریک شدت سے جاری رہی۔ اور لاکھوں الجزائریوں نے اس کے لیے جانوں کی قربانی دی۔ یکم جولائی 1962 کو فرانس نے الجزائر کے عوام کی رائے معلوم کرنے کے لیے استصوابِ رائے کرایا جس میں تمام باشندوں نے آزادی کے حق میں ووٹ دیا۔ اور اس کے نتیجہ میں 3 جولائی 1962 میں الجزائر نے مکمل آزادی حاصل کرلی۔ 26 ستمبر 1962ء کو احمد بن باللہ آزاد ملک کے پہلے وزیر اعظم منتخب کیے گئے۔

3.4.5 مراکش

مراکش جس کو عرب مؤرخین اور جغرافیہ دان المغرب العربی کے نام سے یاد کرتے ہیں، شمالی افریقہ میں اسلامی تہذیب کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ اس کی سرحدیں اندلس سے ملتی ہیں۔ جامعہ ازہر کی مماثل قدیم اسلامی جامعہ قرویین یہیں ہے۔ اس کے علاوہ فاس، رباط اور الدار البیضاء (کیسابلانکا) جیسے مشہور شہر اسی میں ہیں۔ سیاح ابن بطوطہ، فلسفی ابن طفیل اور جغرافیہ داں الادریسی یہیں سے تعلق رکھتے تھے۔ جب اندلس کا سقوط ہو گیا تو پڑوس میں ہونے کی وجہ سے اندلس کے شکست خوردہ مسلمانوں کی آخری جائے پناہ مراکش ہی بنا۔ خلافت عباسیہ کے آغاز ہی میں مراکش کا تعلق مشرق سے کٹ گیا تھا اور وہاں ادریسیوں نے اپنی سلطنت قائم کرلی تھی۔ اس کے بعد فاطمیوں کا تسلط رہا۔ مرابطین کا عہد اس پورے خطہ کے لیے سیاسی استحکام کا دور تھا۔ یوسف بن تاشفین المرابطین سے ہی تعلق رکھتا تھا جس نے اندلس کے مسلمانوں کو سو سال کے لیے عیسائیوں کی چیرہ دستیوں سے بچالیا تھا۔ مرابطین کے بعد موحدون نے اندلس، مراکش اور صحرائے اعظم کے پورے خطہ کو متحد کر دیا تھا۔ ان کے زوال کے بعد بنو مرین نے بھی تمدنی ترقی دی۔ بنو مرین کے بعد فلالی خاندان کے لوگ حکمراں بنے جن کو تاریخ میں مولائی یا مولائے کہا جاتا تھا۔ آج بھی اسی خاندان کے لوگ یہاں بادشاہ ہیں۔ 1912 میں جب مولائے عبد الحفیظ حکمراں تھا تو شمالی مراکش کے دیہی علاقہ پر جس کو ریف کہا جاتا ہے اسپین نے قبضہ کرلیا۔ مارچ 1912 میں فرانس نے حملہ کیا اور مولائے عبد الحفیظ کو ایک معاہدہ کرنے پر مجبور کر دیا جس کی رو سے مراکش بھی فرانس کا زیر حفاظت علاقہ (protactorate) قرار دے دیا گیا۔ مراکش کے لوگوں نے کئی بار چھوٹی چھوٹی بغاوتیں کیں جو کچل دی گئیں۔ تاہم ریف میں مجاہد محمد بن عبد الکریم خطابی کا انقلاب مشہور ہے۔ جنہوں نے ریف میں اسپین کو عبرت ناک شکست دے کر اپنی آزاد مملکت قائم کرلی تھی۔ لیکن 1925 میں فرانس اور اسپین دونوں نے مشترکہ طور پر ریف کی چھوٹی سی مملکت پر حملہ کر دیا چند ماہ کی مزاحمت کے بعد عبد الکریم خطابی نے 25 مئی 1926 میں ہتھیار ڈال دیے۔ اب فرانس نے مراکش پر مکمل قبضہ کرلیا اس نے دوسرے ممالک محروسہ کی طرح یہاں بھی کچھ ترقیاتی کام کیے، سڑکیں نکالیں، ریلوے لائن بچھائیں، جدید طرز پر کاشت کاری کو فروغ دیا وغیرہ۔ فرنچ شہری کثرت سے مراکش میں آباد ہوئے، عربی زبان کی حوصلہ شکنی کی گئی اور فرنچ زبان و ثقافت کو بڑھاوا دیا گیا۔ فرنچ کلچر کے منفی اثرات پورے ملک میں خاص طور پر شہروں میں ہر طرف چھا گئے۔

مراکش میں فرانس کا سب سے خطرناک گیم عربوں اور بربروں کے بیچ تفریق کو ہوا دینا تھا۔ البتہ اس کا یہ قبضہ ہندوستان پر انگریزوں کے قبضہ سے اس معنی میں مختلف تھا کہ فرانس نے وہاں روایتی بادشاہت کو برقرار رکھا اس کو ختم نہیں کیا۔ البتہ اِس شاہی کے پاس کوئی اختیارات نہیں تھے۔ جب ملک میں آزادی کی تحریکیں چلیں جو ابتداء میں خفیہ تھیں تو ان کو سلطان کی حمایت حاصل تھی۔ اسی وجہ سے

اس وقت کے سلطان مولائے محمد خامس کو سزا کے طور پر فرانس نے جلاوطن بھی کیا۔ ادیب و مفکر علال الفاسی نے 1925 میں ادبی و سماجی مباحث پر بات شروع کی سیاست سے پرہیز کیا۔ پھر مئی 1934 کتلۃ العمل الوطنی (نیشنل ایکشن گروپ) کے نام سے پہلی پارٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اِس کی ابتداء بھی ویسی ہی تھی جیسی ہندوستان میں کانگریس کی تھی کہ فرانس کی حکومت کو عوام کی شکایات اور مشکلات سے آگاہ کرنا۔ اس نے اخبارات نکالے، شروع میں آزادی کا مطالبہ نہیں کیا۔ مگر فرانس اِن سرگرمیوں کو تشویش کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس وجہ سے 1934 کے اخیر میں اس نے اس پارٹی کو توڑ دیا۔ لیکن جو سیاسی شعور بیدار ہو رہا تھا اُس نے اپنا کام کیا اور چند سالوں بعد یعنی 1947 میں احمد بالا فرج نے طنجہ شہر میں حزب استقلال قائم کی اور سلطان محمد خامس کی حمایت سے مکمل آزادی کی مہم زور وشور سے شروع کر دی۔ پکڑ دھکڑ، مظاہرے اور ہنگامے پورے ملک میں کئی سال جاری رہے آخر کار 2 مارچ 1954 کو مراکش کی آزادی تسلیم کر لی گئی مگر وہاں الجزائر اور تونس کی طرح جمہوریت نہیں آئی بلکہ سلطانی کو ہی بحال کیا گیا جو آج بھی قائم ہے۔ ویسے ملک میں پارلیمانی نظام قائم کیا گیا ہے، سیاسی پارٹیاں بھی ہیں مگر روایتی بادشاہت بھی موجود ہے اور اس کو وسیع اختیارات حاصل ہیں جیسے کہ سعودی عرب یا کویت وغیرہ عرب ملکوں میں بادشاہوں اور امراء کو حاصل ہیں۔

3.4.6 لیبیا

قدیم زمانہ میں لیبیا نام کا کوئی ملک نہیں تھا۔ بلکہ یہ مصر اور تونس دونوں کے زیر انتظام کچھ علاقے تھے جن کو ملا کر لیبیا کی تشکیل سامراجی قوتوں نے کی ہے۔ اِس کا شمالی مغربی حصہ طرابلس کہلاتا تھا اور تاریخ میں اسی نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور شمالی مشرق میں برقہ واقع تھا، اسی برقہ یا سائرینیکا کے ایک صحرائی حصہ جغبوب میں مشہور سنوسی تحریک قائم ہوئی تھی۔ یہ تحریک صوفیانہ اور مجاہدانہ دونوں مزاج رکھتی تھی۔ طرابلس اور برقہ دونوں عثمانیوں کے مقبوضات میں آ گئے تھے۔ چنانچہ انیسویں صدی کے اوائل تک یہاں عثمانی ہی قابض رہے۔ اس کے بعد پہلے فرانس اور پھر اطالیہ نے اپنے سامراجی ایجنڈے پر عمل شروع کیا۔ ابتداء میں مقامی لوگوں کی مزاحمت کی ترک فوجوں نے مدد و حمایت کی۔ مگر پھر دوسرے صوبوں میں بغاوتوں کی وجہ سے ترکوں کو اپنی فوج واپس بلانی پڑی۔ میدان خالی دیکھ کر اطالیہ نے حملہ کر دیا۔ سنوسی مجاہد کافی مدت تک ان کے سدراہ بن کر کھڑے رہے۔ صحرا کے مجاہد عمر مختار کا تعلق اسی سنوسی تحریک سے تھا۔ عمر مختار کی قیادت میں سنوسی زاویوں کا جہاد اطالیہ کے خلاف بے سروسامانی کے ساتھ جاری رہا۔ یہاں تک کہ 1933 میں عمر مختار کی شہادت کے بعد وہ ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے اور اطالیہ اس پورے خطہ پر قابض ہو گیا۔ ایک مؤرخ کے بقول: ”اِس جنگ میں اٹلی کی فوجوں نے سخت ظلم وبربریت کا مظاہرہ کیا، سنوسی زاویے ڈھا دیے گئے، کنوؤں کو پاٹ دیا گیا تاکہ مجاہد صحراء میں پیاس سے مر جائیں، جائدادیں ضبط کر لی گئیں اور عمر مختار اور دوسرے رہنماؤں کو ہوائی جہاز میں اوپر لے جا کر نیچے زمین پر پھینک دیا“۔ (ثروت صولت، ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ جلد چہارم ص 201 مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز ایڈیشن 1999ء)

3.5 خلاصہ

موجودہ دور میں مغربی ایشیا(West Asia)میں یوں تو بہت سارے ممالک آتے ہیں مثلاً آرمینیا، قبرص اور جارجیا وغیرہ بھی اس کا حصہ ہیں۔ لیکن یہ ریاستیں چونکہ عیسائی اکثریت پر مشتمل ہیں اور پہلے عثمانی سلطنت کا حصہ تھیں اس لیے یوروپی استعمار نے ان میں جو مداخلت کی وہ ان کو عثمانی مملکت سے نکالنے کے لیے کی تھی اس لیے اس پر استعمار کا اطلاق نہ ہو گا۔ اسی طرح چند ریاستیں ایسی ہیں جو بہت بعد میں تشکیل پذیر ہوئیں بلکہ یوروپی استعمار نے اس خطہ کی بڑی ریاستوں کے حصے بخرے کر ڈالے اس کے نتیجہ میں ان کا وجود ہوا اس لیے منطقی طور پر وہ بھی ہمارے موضوع سے خارج رہیں۔ یہ نوزائیدہ چھوٹی مملکتیں ہیں: کویت، قطر، متحدہ عرب امارات، بحرین اور عمان۔ لہذا یوروپی استعمار کا نشانہ بننے والے اس خطہ کے تاریخی ممالک ہی سے ہم اس یونٹ میں بحث کی گئی ہے۔۔ مغربی ایشیا کے ممالک جو درج ذیل ہیں: ایران، عراق، ایران سعودی عرب، یمن، شام و فلسطین، اردن، لبنان اور ترکی۔

اس یونٹ کے دوسرے حصہ یعنی شمالی افریقہ اور استعمار کے تحت آپ نے جانا کہ شمالی افریقہ کے یہ ممالک یوروپی استعمار کے نشانہ بنے، مصر، سوڈان، تونس، الجزائر اور مراکش اور لیبیا۔

ان دونوں خطوں میں یوروپی استعمار کا تسلط ہوا اور بعض میں اس کا بالواسطہ عمل دخل رہا، آزادی کی تحریکیں چلی اور یوروپی استعمار سے آزادی حاصل کی گئی ہے۔ مگر ذہنی ونفسیاتی غلامی آج بھی باقی ہے۔ بہت سارے معاملات میں یہ پورا خطہ آج بھی مغربی سامراج کے اثرات سے جوجھ رہا ہے خاص کر معاشی ومالیاتی مسائل میں نیز سائنس وٹیکنالوجی اور تعلیم میں یہ آج تک سامراج کا دست نگر بنا ہوا ہے۔ یہ ساری معلومات آپ کو اِس یونٹ میں تفصیل سے دی گئیں ہیں۔

البتہ مغربی ایشیا کے بارے میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ یوروپی سامراج کی مداخلت اور قبضہ سے پہلے جزیرۃ العرب خاص طور ہی ایک ہی ملک یا ایک ہی سیاسی اکائی کے تحت آتا تھا۔ پہلی جنگ عظیم سے پہلے عثمانی ترک سلطنت مکہ کے شریف حسین کے واسطہ سے اس سیاسی کائی کا نظم ونسق چلاتے تھے۔ اس جنگ میں انگریزوں نے عرب سرداروں اور خاص کر شریف حسین آف مکہ کو ترکوں سے بغاوت پر آمادہ کیا اور اس سے یہ معاہدہ کیا کہ تمام عرب ممالک کو ایک متحدہ عرب مملکت میں بدل جائے گا۔ لیکن اسی دوران فرانس اور انگریزوں نے اپنے مابین ایک خفیہ معاہدہ کیا جس تاریخ میں اس کو سائکس پیکو معاہدہ(Sykes-Picot) کہتے ہیں۔ جس کے مطابق جنگ کے بعد انگریزوں نے عربوں کو دھوکہ دیا اور انہوں نے ایسی کوئی مملکت قائم نہیں کی بلکہ انگریز اور فرانسیسیوں دونوں نے مل کر اس خطہ کے ممالک کو آپس میں بانٹ لیا۔ جس کے نتیجہ میں اس خطہ میں انگریزوں کے خلاف آزادی کی ایک تحریک چلی اور مختلف قبائل اور مختلف قبائلی سرداروں نے جہاں بھی موقع پایا ایک علاقہ پر قبضہ کر کے اپنی حکومت کا اعلان کر دیا جن میں سے سعودی عرب، عمان اور بحرین کے ساتھ انگریزوں نے دفاعی معاہدے بھی کر لیے۔ اس طرح اس خطہ میں متحدہ جزیرۃ العرب سے الگ ہو کر جو چھوٹی مملکتیں وجود میں آئیں وہ یہ ہیں: سعودی عرب، جس کے بارے میں الگ یونٹ میں بتایا جاچکا ہے اور جو رقبہ میں بہت بڑا ملک ہے۔ اس کے علاوہ چھوٹے ممالک یہ ہیں

کویت، قطر، متحدہ عرب امارات، بحرین اور عمان۔ آج رقبہ میں بہت چھوٹے ممالک پیٹرول نکل آنے کی وجہ سے اس خطہ کی بڑی معیشتیں ہیں۔

3.6 کلیدی الفاظ

استعمار	سامراج	حصے	بخرے ٹکڑے کرنا
تسلط	قبضہ	دست نگر	محتاج
قلمرو	دائرۂ اثر	الف لیلوی	الف لیلہ (ہزار داستان) کی طرف منسوب
والی	گورنر	اقتدار	حکومت
مہاجرت	ہجرت، ترک وطن	موتمر	کانفرنس
باب عالی	خلافت عثمانیہ کا دربار	مزاحمت	مقابلہ
آمر	ڈکٹیٹر	زاویہ	گوشہ، خانقاہ
ارکان خمسہ	پانچ ستون	شیخ الشعراء	شاعروں کا سردار
کالعدم کرنا	ختم کرنا	عائلی قوانین	خاندان سے متعلق قوانین
لیجن	فوج کا دستہ	تولیت	ذمہ داری
اشتراکی	کمیونسٹ	رسائل نور	شیخ بدیع الزمان کے لکھے ہوئے کتابچے
دولت صفویہ	صفویوں کی حکومت	مصلح	اصلاح کرنے والا ریفارمر
ایماء	اشارہ	استصوابِ رائے	رائے عامہ معلوم کرنا
ناکہ بندی	چاروں طرف سے بند کر دینا	ریف	مراکش کا وہ علاقہ جو اسپین سے ملتا ہے
نوزائدہ	نیا نیا پیدا ہوا	دم واپسیں	مرنے کے قریب
خون آشام	جس میں بہت خون بہے	بلائے بے درماں	ایسی بلا جس کا علاج نہ ہو
آماجگاہ	میدان		
مہدی	شیعہ و سنی تھیولوجی کے مطابق دنیا کے خاتمہ کے وقت آنے والا بڑا مصلح		
اتحادی	جنگ عظیم میں جرمنوں سے لڑنے والے ممالک کا گروپ		

3.7 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- اس خطہ کے بڑے اور تاریخی ممالک کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔
- عربوں اور انگریزوں کے درمیان کیا معاہدہ ہوا تھا اس کی معلومات ملیں۔
- سعودی عرب کیسے وجود پذیر ہوا یہ آپ کو بتایا گیا۔
- عالم عرب کی تفریح گاہ کس کو کہتے ہیں یہ معلوم ہوا۔
- مذکورہ ممالک میں استعمار نے کچھ مفید اور ترقیاتی کام بھی کیے۔

3.8 نمونہ امتحانی سوالات

3.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. عبدالعزیز ثعالبی

(a). مراکش کی تحریک آزادی کے رہنما تھے
(b). تونس کی اسلام پسند تحریک کے رہنما تھے
(c). الجزائر کے پہلے صدر تھے
(d). ان میں سے کوئی بھی نہیں

2. حبیب بورقیبہ

(a). مشہور مراکشی مفکر
(b). افریقہ کے معروف اشتراکی رہنما
(c). تونس کے پہلے صدر
(d). الحزب الدستوری کے بانی

3. مصطفی کمال اتاترک

(a). ایران کی جنگ آزادی کا ہیرو
(b). جدید ترکی کا بانی
(c). معرکۂ ادرنہ کا ہیرو
(d). ترکی مصنف

4. سعید نورسی

(a). ترکی کے مجاہد آزادی
(b). رسائل نور کے مصنف
(c). ترکی کے قومی شاعر
(d). ترکی کے آخری شیخ الاسلام

3.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. استعمار سے کیا مراد ہے؟

2. ملک شام سے متعلق اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔
3. لبنان کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟ بیان کیجیے۔
4. یوروپی سامراج سے آزادی کی تحریک میں مذہبی و غیر مذہبی عناصر نے مشترکہ تحریک چلائی، اس کی تفصیل سے وضاحت کیجیے۔
5. استعمار کے ان ممالک پر کیا اچھے اثرات بھی ہوئے۔

3.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. مغربی ایشیا کے تین ممالک پر تجزیاتی نوٹ لکھیے۔
2. عالم عرب کس طرح مغربی استعمار کی زد میں آیا اسباب کی وضاحت کیجیے۔
3. شمالی مغربی افریقہ کے ممالک استعمار سے آزادی کے باوجود سیاسی استحکام حاصل نہیں کر سکے؟ کیوں تفصیل سے لکھیں۔

3.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ ثروت صولت جلد سوم
2. ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ ثروت صولت جلد چہارم
3. Jawahar lal Nahru,Glimpses of World History
4. Philip K Hitti, History of the Arabs

اکائی 4: عرب قومیت اور سیاسی آزادی

اکائی کے اجزا:

4.0 تمہید
4.1 مقاصد
4.2 قدیم دور میں عرب قوم پرستی
4.3 تاریخ اسلام میں عربیت
4.4 بیسویں صدی کے آغاز میں عرب انجمنوں کا کردار
4.5 عرب قوم پرست فکر میں بڑے اور اہم فکری رجحانات:
4.6 انتہا پسندانہ اور معتدل عرب قوم پرستی
4.7 علاقائی رجحانات
4.8 جدید عرب قوم پرستی کا آغاز
4.8.1 عرب قوم پرست اور سیاسی بیداری
4.8.2 عرب قوم پرستی کے جھوٹے مظاہر
4.8.3 عرب قوم پرستی اور سیاسی آزادی
4.9 مذہبی ظلم وجبر
4.10 مذہبی آزادی کا خاتمہ
4.11 کلیدی الفاظ
4.12 خلاصہ
4.13 اکتسابی نتائج
4.14 نمونہ امتحانی سوالات

4.14.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
4.14.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
4.14.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
4.15 تجویز کردہ اکتسابی مواد

4.0 تمہید

عرب قوم پرستی یا عروبہ و عربیت اپنے عصری تصور میں یہ ماننا ہے کہ عرب لوگ زبان، ثقافت، تاریخ، جغرافیہ اور مفادات کے لحاظ سے متحد لوگ ہیں اور ان کی ایک واحد عرب ریاست قائم کی جائے جو پورے جزیرۃ العرب اور عالم عربی میں عربوں کو متحد کر دے۔

عرب مفکر عزمی بشارہ نے عرب قوم پرستی کی تعریف اس طرح کی ہے :

" عرب قوم پرستی خون یا نسل کا بندھن نہیں ہے، بلکہ زبان کے آلات اور ابلاغ کے جدید ذرائع سے لیس ایک گروہ ہے جو ایک خود مختار قوم بنناچاہتا ہے "۔ حوالہ کے لیے دیکھیں، القومیۃ العربیۃ، وکی پیڈیا:

https://ar.wikipedia.org/wiki/%D9%82%D9%88%D9%85%D9%8A%D8%A9_%D8%B9%D8%B1%D8%A8%D9%8A%D8%A9

4.1 مقاصد

مقاصد اس یونٹ میں ہم تفصیل سے عرب قومیت اور سیاسی آزادی کے بارے میں پڑھیں گے۔ اور یہ جانیں گے کہ عرب قوم پرستی کے رجحانات نے عرب دنیا پر کیا مثبت و منفی اثرات مرتب کیے اور سیاسی آزادی میں کیا رول ادا کیا۔

4.2 قدیم دور میں عرب قوم پرستی

یہ تصور کہ عرب ایک قوم ہیں قدیم ہے اور اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ عربی شاعری میں جاہلی شعراء نے اپنی نسل اور اپنے حسب ونسب پر خوب فخر کیا اور اسلام کے دور میں قوم پرستی عربوں کے اس احساس سے مجسم ہوئی کہ وہ اسلام کے اندر ایک الگ قوم تھے اور یہ احساس اموی دور میں بڑھتا گیا۔ اسلام سے پہلے عربوں کو اپنے نسب، اپنی وابستگی اور اپنے ادب بالخصوص شاعری پر فخر تھا۔ اسی طرح ان کو شاعری کے علاوہ اپنے نسب پر بھی فخر تھا۔

شعر و ادب میں عربوں کی دلچسپی اور ان کے نسب پر فخر کی بھرپور نمائندگی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس کی ایک مثال جریر کا یہ شعر ہے:

سیروابنی العم فالاہوازمنزلکم

وبهرثيرى، فلم تعرفكم العرب؟

(اے میرے چچا کے بیٹو جاؤ اہواز تمہارا گھر ہے۔

اور دریائے ثیری، تو کیا عربوں نے تمہیں ابھی نہیں پہچانا؟)

عباسی دور میں البحتری کا یہ شعر بھی اسی جذبہ کی ترجمانی کرتا ہے۔

نحن ابناء يعرب اعرب الناس

لساناوانضرالناس عوداً

(ہم عربوں کے بیٹے ہیں، سب سے زیادہ فصیح لوگ ہیں زبان کے لحاظ سے، اور لوگوں میں تازہ ترین ہیں حسب ونسب میں۔)

شعر وادب کی دنیامیں یہ سب سے مشہور چیزوں میں سے ایک ہے جو عربوں نے اپنے نسب پر فخر کے بارے میں لکھی ہیں۔ عرب اپنی زبان پر فخر کرتے تھے اپنے آپ کو دنیا کی دوسری ساری قوموں سے فصاحت وبلاغت میں برتر سمجھتے تھے اسی لیے وہ اپنے آپ کو عرب اور دوسروں کو عجم (گونگا) کہتے تھے۔

البتہ بعض کے نزدیک قوم پرستی کا مطلب ہے کہ لوگ ایک آباؤاجداد سے آئے ہیں لیکن پھر اس تصور میں ارتقاہوا اور قوم پرستی کی اصطلاح اپنی لسانی جڑوں سے الگ ہو گئی ہے، اس لیے اس کا مفہوم قوم کے معنی کے قریب ہو گیا ہے، اور یہ سیاسی طور پر اہمیت اختیار کر گیا ہے۔

4.3 تاریخ اسلام میں عربیت

اسلام نے گرچہ عرب وعجم کی تفریق ختم کی اور دونوں میں مساوات قائم کی مگر عملی طور پر تاریخ میں دونوں قوموں کے اندر تفریق برتی جاتی رہی خاص کر بنی امیہ کے دور خلافت میں کہ انہوں نے ملازمتوں اور مناصب دینے میں عربی وغیر عربی کا فرق روا رکھا۔ لوگوں کے عام تصور میں عربوں کی فضیلت واضح تھی، اور بہت سی احادیث مبارکہ موجود ہیں (اگرچہ ان میں سے بعض ضعیف ہیں) جو کہ عربوں کی فضیلت اور نبی محمد ﷺ کے اپنے حسب اور نسب پر فخر کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں شیخ محمد صالح المنجد نے الاسلام آن لائن پر جو دین کے بارے میں سوال وجواب کی ویب سائٹ ہے: شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی رائے کا خلاصہ کیا ہے:

" سنیوں میں جس تصور کو ماناجاتا ہے اور جس چیز پر وہ عمل پیرا ہیں وہ یہ ہے کہ عرب نسل فارسی، عبرانی اور سریانی، رومی اور دیگر سب میں بہتر ہے، اور یہ کہ قریش عربوں میں سب سے بہتر ہیں، اور یہ کہ بنی ہاشم قریش میں سب سے بہتر ہے، اور رسول اللہ ﷺ بنی ہاشم میں سب سے بہتر ہیں، پس وہ سب سے افضل مخلوق ہیں روح میں، اور نسب میں ان میں سے بہتر ہیں۔ (واضح رہے کہ یہ ایک حدیث کا مفہوم بھی ہے)۔ اور عام طور پر علماء اس پر یقین رکھتے ہیں۔

عربوں کا اسلام کے پیغام کو لے کر دنیامیں جانا ان کی تاریخ کا سب سے بڑا واقعہ تھا، جس نے انہیں ایک متحد قوم بنادیا جس نے ان کو ایک سمت دی اور ایک متحد سیاسی وجود بنایا حالانکہ اس سے پہلے ان کی حیثیت باہم متحارب قبائل سے زیادہ نہ تھی اب انہوں نے

متحد ہو کر اپنے آس پڑوس کی سلطنتوں یعنی فارسی سلطنت اور رومی ایمپائر کو الٹ کر رکھ دیا اور خود ایک وسیع تہذیب وتمدن کی بناڈالی۔

4.4 بیسویں صدی کے آغاز میں عرب انجمنوں کا کردار

عرب قوم پرست انجمنوں اور تنظیموں کی سرگرمیاں 1908 عثمانی سلطنت میں انجمن اتحادوترقی کی قیادت میں ہونے والی بغاوت کے بعد شروع ہوئیں، اس ترک انجمن نے عرب مخالف نسل پرستی کا اظہار کیا اور عربوں کو ترکیانے (Turkanization) کی پالیسی نافذ ہوئی۔ چونکہ باب عالی (عثمانی دربارِ خلافت) نے ان عرب انجمنوں مثلاً الرابطۃ الاسلامیہ، الجامعہ العثمانیہ کو تحلیل کر دیا تھا، جن میں سے زیادہ تر عرب ترک بھائی چارے کا مطالبہ کر رہی تھیں، اس کے رد عمل میں اب عربوں نے انجمنوں کے ذریعے خفیہ کام کرنے کا سہارا لیا، جن میں سب سے اہم تھیں۔ الجمعیۃ العلمیہ، جمعیۃ العرب الفتاۃ، المنتدی الادبی السوری۔ انہوں نے 1913 میں پیرس میں پہلی عرب کانفرنس بھی منعقد کی۔

عربیت میں فخر قومی تحریکوں کے ساتھ پروان چڑھتا گیا جس کا مقصد استعمار سے آزادی حاصل کرنا تھا۔ اس خطہ کے مختلف ممالک میں جو آزادی کی تحریکیں چلیں ان میں نئی نسل کے اندر یہ جذبات بھی پروان چڑھائے گئے مثال کے طور لیبیا کے شیخ احمد الشائف نے لیبیا کے باشندوں کو اطالوی استعمار کے خلاف تحریک دیتے ہوئے کہا :

لاغرو ان يدعى الليبى ان له

مااللعروبة من مجدومن حسب

(یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ لیبیا کا باشندہ بھی دعویٰ کرے کہ اس کے پاس بھی وہی عربیت کی شان اور حسب ونسب ہے جو اور عربوں کے پاس ہے۔)

حوالہ کے لیے دیکھیے القومیۃ العربیۃ:

https://ar.wikipedia.org/wiki/%D9%82%D9%88%D9%85%D9%8A%D8%A9_%D8%B9%D8%B1%D8%A8%D9%8A%D8%A9

4.5 عرب قوم پرست فکر میں بڑے اور اہم فکری رجحانات:

1۔ بائیں بازو کا (یا سوشلسٹ) رجحان: اس کی نمائندگی کرنے والی تنظیموں میں عرب نیشنلسٹ موومنٹ، عرب سوشلسٹ بعث پارٹی، اور ڈیموکریٹک عرب سوشلسٹ یونین پارٹی شامل ہیں۔ عرب قوم پرست عربیت کو مذہب کی آزادی کے اصول کے علاوہ زبان، ثقافت اور تاریخ کے مشترکہ ورثے کے نتیجے میں ایک نظریے کے طور پر مانتے ہیں۔ عرب اتحاد ان عرب قوم پرستوں کا ہدف تھا۔

2۔ اسلامی مذہبی رجحان: اس کی نمائندگی عبدالرحمٰن الکواکبی، محمد عزۃ دروزہ، فہمی ہویدی، عبدالوہاب المسیری، محمد عابد الجابری، محمد سلیم العوا، اور منیر شفیق جیسے مفکرین کرتے ہیں۔ اس رجحان کی ترجمانی یوسف القرضاوی کا یہ قول کرتا ہے: ”جو کوئی عربیت اور اسلام کو الگ

کرنا چاہتا ہے وہ اس شخص کی طرح ہے جو روح اور جسم کو الگ کرنا چاہتا ہے"۔

۳۔ ترقی پسند جمہوری رجحان: ساطع الحصری، خیر الدین حسیب، اور عزمی بشارہ جیسے مفکرین کی نمائندگی اس میں نظر آتی ہے۔ اس سے قبل اس رجحان کی نمائندگی ناصری تحریک اور اس کی مختلف جماعتیں کرتی تھیں اور جمال عبد الناصر نے اپنے عہد میں یمن اور سیریا میں ان خیالات کو پھیلانے کی کوشش اقتدار کے ذریعہ کی تھی۔

جدید دور میں عرب قوم پرستی کا نظریہ نصیریت کی تحریک اور بعثی تحریک جیسے متشدد نظریات سے مجسم ہوا، جو عرب دنیا میں سب سے زیادہ عام اور طاقتور تھے، خاص طور پر بیسویں صدی کے وسط سے ستر کی دہائی کے آخر تک۔ مصر اور شام کے درمیان متحدہ عرب جمہوریہ کے قیام کے ذریعے اور بہت سی دوسری اتحاد کی کوششوں میں اس کے مظاہر دیکھے جاسکتے ہیں۔

4.6 انتہا پسندانہ اور معتدل عرب قوم پرستی

عرب قوم پرستی کے پہلے علمبردار اور بانی شام اور لبنان کے عیسائی تھے، جیسے کہ ناصف الیازجی، بطرس البستانی، نجیب ازوری، اور مشیل عفلق۔ کچھ محققین کا خیال ہے کہ اس کا بنیادی مقصد سلطنت عثمانیہ کو تباہ کرنا تھا۔ ان کے بارے میں مذہبی طبقات میں عام طور پر یہی سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ عیسائی قوم پرست کہتے تھے کہ ماضی میں ان علاقوں میں جو غیر مسلم تھے ان کے ساتھ مسلمان شہریوں سے نچلی سطح پر سلوک کیا گیا اور انہیں ریاست میں قیادت کے عہدوں سے محروم رکھا گیا۔

عرب قوم پرستی جو ساٹھ کی دہائی کے دور میں اور اسی کی دہائی تک رائج تھی، نے انضمام و اتحاد کو اپنایا لیکن انضمام و اتحاد کا نعرہ لگانے والی جماعتوں اور رہنماؤں کی ناکامی کے بعد قوم پرستوں نے عربیت کا ایک نیا تصور پیش کرنا شروع کیا۔ یعنی عربوں میں ایسا اتحاد جو یورپی یونین کے منصوبے کے قریب سمجھا جاتا ہے، یعنی ایک متحد خارجہ پالیسی اور اقتصادی وزن کے ساتھ ایک بلاک سے وابستگی کا مطالبہ، یہ اقتصادی انضمام، ایک متحد کرنسی، اور افراد اور سامان کے درمیان نقل و حرکت کی آزادی پر مبنی ہے۔ اس کا مطالبہ ہے کہ مختلف ممالک، ایک عرب یونین تک پہنچنے کے لیے عرب خطوں میں موجود سماجی یا ثقافتی خصوصیات کو محفوظ رکھتے ہوئے مشترکہ عرب دفاعی معاہدے کریں۔ عرب دنیا میں عرب لیگ، تیل پیدا کرنے والے ممالک کی تنظیم اوپیک کے علاوہ متحدہ عرب امارات بھی اسی احساس کے تحت پیدا ہوئی جس میں سات چھوٹی ریاستوں نے مل کر ایک وفاق بنایا ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ عرب قوم پرستی ابتدا میں ایک مذہبی تحریک تھی، پھر وہ سیکولر لبرل تحریک میں بدل گئی۔ عرب قوم پرستوں نے عام طور پر مذہب کو سیاسی شناخت کے بنیادی عنصر کے طور پر ماننے سے انکار کیا اور فرقہ وارانہ شناخت سے قطع نظر عرب اتحاد کو فروغ دیا۔ تاہم، حقیقت یہ ہے کہ زیادہ تر عرب مسلمان تھے، کچھ لوگوں نے ایک نئی عرب قومی شناخت کی تشکیل میں ایک اہم عمارت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ مثال کے طور پر عربیت قومیت کے سب سے بڑے نظریہ ساز میشال یا مائکل عفلق نے اسلام کو "عرب ذہانت" کا ثبوت سمجھا۔

اس کا نظریہ تھا کہ اسلام خالص عربی تحریک تھی غیر عربوں نے اس میں شامل ہو کر اس کو بگاڑ دیا۔ شام کی بعث پارٹی 1940 میں وجود پذیر ہوئی اور مائکل عفلق ہی اس کا بانی تھا۔ اس نے اعلی تعلیم فرانس میں حاصل کی تھی اور اسلامی تاریخ کا استاد تھا۔ 1949 میں وہ وزیر تعلیم بن گیا اور اس نے نظام تعلیم کے ذریعہ اور ہم خیال استادوں کے ذریعہ اپنے خیالات کی اشاعت کی۔ اس کے نظریات نے دروزی، نصیری اور عیسائیوں میں مقبولیت حاصل کر لی۔

اس کے خیالات کے مطابق چونکہ عربوں نے اسلام کی دعوت کے ذریعے عظیم رتبہ اور بڑی شان حاصل کی، اس لیے عرب لوگوں کی طرف سے اسلام کو ایک آفاقی پیغام اور سیکولر ذہانت کے اظہار کے طور پر دیکھا جانا چاہے۔ اسلام نے عربوں کو ایک "اندار ماضی" دیا جو "شرمناک حال" سے بہت مختلف تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ درحقیقت عربوں کا جو زوال ہوا ہے وہ عربوں میں عرب قومیت کے زوال کی وجہ سے ہوا ہے جو ان کی "کامل اور ابدی علامت" تھی۔ عربوں کو آج پھر سے اسی انقلاب کی ضرورت ہے۔ اس بارے میں بعثت کے بانی مشیل عفلق کہتے ہیں:

"ماضی میں عرب قوم کی پوری زندگی ایک آدمی (محمد ﷺ) میں سمٹی تھی، اور آج بھی ضروری ہے کہ اس قوم کی پوری زندگی، اپنی نئی نشاۃ ثانیہ میں، اس عظیم عرب انسان کی زندگی کی تفصیل بن جائے۔ محمد ہر اعتبار سے عرب تھے، لہٰذا آج کے تمام عربوں کو محمد ہی بن جانا چاہیے" حوالہ کے لیے دیکھیں، القومية العربية:

https://ar.wikipedia.org/wiki/%D9%82%D9%88%D9%85%D9%8A%D8%A9_%D8%B9%D8%B1%D8%A8%D9%8A%D8%A9

4.7 علاقائی رجحانات

متحدہ عرب قوم پرستی کی مخالفت مغرب سے تعلق رکھنے والے لبرل مفکرین کے ایک گروپ نے کی جنہوں نے قومی و علاقائی خود مختاری کے تحفظ پر زور دیا کہ ایک قومی شناخت یا شناخت کے تحفظ کی ضرورت ہے جو ماضی میں ان علاقوں میں تھی اور اب ناپید ہو گئی جیسے کہ فونیشین، فرعونی، کنعانی، بابلی، وغیرہ۔ یہ رجحان مصر اور لبنان میں اپنی مضبوط ترین شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر، کچھ مصری مصنفین جیسے احمد لطفی السید، طٰہ حسین، نجیب محفوظ، اور لوئس عواد نے دیکھا کہ مصر اور باقی عرب ممالک کے درمیان ثقافتی اختلافات ہیں تو انہوں نے دعویٰ کیا کہ مصر میں ایک الگ مصری ثقافت اور ایک مصری زبان ہے لہذا اس کی الگ قومی شناخت ہونی چاہیے۔ مصر کے صدر ناصر کے زمانہ میں اس رجحان نے بہت تقویت حاصل کی۔

وجہ یہ تھی کہ صدر جمال ناصر کی آمریت کے ساتھ صحافیوں، مصنفوں اور ادیبوں کی ایک پوری فوج تھی جو جمال عبد الناصر کو وحدت عربی کا سب سے بڑا نمائندہ، مغرب کا پامردی سے مقابلہ کرنے والا سپاہی اور عالم اسلام کا جلیل القدر قائد ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی تھی۔ حتیٰ کہ محمد حسین ہیکل جیسے بڑے مصنف و ادیب بھی اسی ناصری قومیت عربیہ کے سحر میں گرفتار ہو گئے تھے اور

انہوں نے محمد رسول ﷺ کی دعوتِ وحدت پر ناصری عربی اتحاد کی دعوت کو ترجیح دیدینے کی ناروا جسارت تک کر ڈالی تھی۔ حالانکہ حسین ھیکل سیرت نبویہ پر ایک بہترین کتاب کے مصنف ہیں۔

مصر میں اس علاقائی قوم پرستی نے اس قدر زور پکڑا کہ بہت سے لوگوں نے اس کو اختیار کر لیا یہاں تک کہ جمال عبد الناصر اور دوسرے مصری حکمرانوں نے اس کو اپنے ماضی کے ورثہ سے جوڑنے کی کوشش کی اور نحن اولاد الفراعنہ (ہم فرعونوں کی اولاد ہیں) کا نعرہ لگایا۔ اور ملک میں جگہ جگہ فرعونوں کے مجسمے استادہ کر دیے گئے۔ قدیم مصری ثقافت کی بازیافت کی جانے لگی۔ طٰہٰ حسین نے اپنی کتاب مستقبل الثقافہ فی مصر میں اس بات کی وکالت کی کہ مصر کو اپنا تعلق اسلام سے کاٹ کر یوروپ سے جوڑنا چاہیے۔ اسی تناظر میں لبنانی قوم پرستی کے بعض حامی لبنانی سامنے آئے، جیسے سعید عقل۔

بعض محققین کے نزدیک عرب قومیت یا عروبہ کا تصور بنیادی طور پر مغرب سے بر آمد شدہ اجنبی اور دخیل تصور ہے۔ جس کی ابتداء بنیادی طور پر ترک سلطنت، ترک قوم پرستی کے رد عمل میں ہوئی تھی۔ بعض مستشرقین اور مغربی ممالک کے آلہ کاروں نے عربوں میں یہ پروپیگنڈا کیا کہ ترک عربی زبان اور عرب کلچر کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ بلاشبہ ترکوں نے عربی زبان اور عرب کلچر سے بے زاری کا ثبوت دیا تھا لیکن اس کا سبب عرب دشمنی نہیں بلکہ یہ تھا کہ فاتح عثمانی ترک ایک سپاہیانہ قوم تھے علوم وفنون سے ان کو بہت کم دلچسپی تھی۔ ان کے اندر جابر بادشاہت کے تمام جراثیم سرایت کر گئے تھے۔ وہ فقہ حنفی کے متصلب پیرو تھے اور مختلف صوفیا کے حلقوں سے وابستہ تھے اس لیے اوہام وخرافات اور بدعات کا زبردست چلن عثمانی قلمرو میں جاری تھا جس کی وجہ سے عربوں کو ان سے جائز شکایات پیدا ہو گئی تھیں۔ بعض عثمانی حکام کے جابر رویوں اور استبدادی فیصلوں سے بھی ان شکایات کو جلا ملتی تھی۔ عرب قومیت کا خیال اسی سیاسی بے اعتمادی کی فضا میں پیدا ہونا شروع ہوا۔

اِس کو یوروپ کے نیشنل اسٹیٹ کے تصور نے اور جلا دی۔ بعد میں مسیحی عربوں نے اس تصور کو باضابطہ پروان چڑھایا۔ شریف حسین آف مکہ اور ہاشمیوں نے اس سے سیاسی فائدہ اٹھایا۔ لیکن اِس میں شدت بعثی نظریات سے آئی۔ عربوں اور ترکوں کی اس کشمکش کو پیدا کرنے میں لارنس آف عربیا کا بھی کردار ہے اور مغربی ذرائع ابلاغ کا بھی جو ترکی سلطنت کو کمزور کرنا چاہتے تھے۔

عرب قومیت کا آغاز مذہبی رہنماؤں اور علماء کے اصلاح پسند نعروں سے ہوا۔ اس سلسلہ میں شیخ عبدالرحمن الکواکبی نے ایک کتاب لکھی: طبایع الاستبداد اس کتاب میں عثمانی سلاطین کے استبداد اور مطلق العنانی اور جابرانہ پالیسیوں پر تنقید تھی۔ انہوں نے حکمرانی میں استبداد و مطلق العنانی کے نقصانات سے قوم کو آگاہ کیا تھا۔ اِس طرح سے یہ کتاب گرچہ ملوکیت پسندانہ رویوں پر نظر ثانی کی دعوت تھی مگر اس سے بالواسطہ پڑھے لکھے حلقے اور خاص کر علما کے درمیان غیر عرب حکومت اور اُس کی آمریت پسندی کے خلاف ایک احتجاجی لہر پیدا ہوئی تھی۔

تاریخی طور پر بغداد کی تباہی کے بعد سے عربوں کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ جب خلافت بھی عثمانی ترکوں کے ہاتھ میں چلی گئی تو کلچرل طور پر وہ بہت پیچھے ہوتے گئے۔ اب عربی زبان کی بالادستی بھی باقی نہ رہ گئی تھی۔ بلکہ فارسی اور ترکی اس کی دو حریف زبانیں

پیدا ہوگئی تھیں۔ مراکش کو چھوڑ کر بقیہ تمام عرب ممالک عثمانیوں کے زیر نگیں تھے۔ اِس لیے عربوں میں اب یہ خیال پیدا ہو چلا تھا کہ ان کے زوال کا ذمہ دار بھی عثمانی سلطنت ہے۔ یہ خیال بے بنیاد تو نہیں مگر مبالغہ آمیز ضرور تھا۔ عثمانی سلطنت اٹھارویں صدی کے اواخر میں خود بھی مالی ابتری کا شکار ہو رہی تھی۔ اس کے یوروپی مقبوضات میں بغاوتیں ہو رہی تھیں جس کو یوروپ کی نئی ترقی یافتہ مملکتیں مداخلت کر کے اور زیادہ بڑھاوا دے رہی تھیں۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ آغاز میں عرب قومیت پر مذہبی رنگ غالب تھا مگر بعد میں یہ اشتراکیت اور بعثیت کی علمبردار بن گئی۔

4.8 جدید عرب قوم پرستی کا آغاز

عرب نہضہ یا بیداری کی بنیاد میں ان مسیحی قلمکاروں کا بڑا ہاتھ ہے، جو لبنان و شام سے تعلق رکھتے تھے۔ کو اکبی جن کا ذکر اوپر آیا ہے بھی شام کے تھے۔ اس کے علاوہ مسیحی عرب مصنف ناصیف الیازجی، ابراہیم الیازجی اور بطرس البستانی سب عربی زبان کے بڑے لکھنے والے تھے۔ یہ سب شام کے تھے۔ ان لوگوں نے عربوں میں "العروبہ" یا عرب قوم پرستی کا بیج بویا۔ دوسری طرف ینگ ترکس Young Turks (ترکی نوجوانان) جو عثمانی خلافت میں بہت طاقتور تنظیم بن چکی تھی اور جو ترک قوم پرستی میں سرشار تھی، وہ عرب مخالف تھی۔ اس طرح دونوں قوم پرست تحریکوں کا ایک دوسرے پر ردعمل ہوا۔ شام و لبنان کے پڑھے لکھے عربوں کا ایک دھڑا جس کے سرخیل امیر البیان شکیب ارسلان تھے عثمانی سلطنت کا وفادار تھا اور وہ اسلام و مسلمانوں کی فلاح کے لیے بغاوت کو نقصان دہ تصور کرتا تھا اور پین اسلام ازم (عالمی متحدہ اسلام) کی تحریک میں پیش پیش تھا۔ جس کے اولین بنیاد گزار جمال الدین افغانی تھے اور ان کے شاگرد مفتی محمد عبدہ اور ان کے شاگرد سید رشید رضا تھے۔ البتہ یہ تینوں بھی عرب قوم پرست تحریک کے لیے نرم گوشہ رکھتے تھے اور اس کو مذہبی بنیادوں پر چلانا چاہتے تھے۔ بلکہ بعد میں رشید رضا تو جزیرۃ العرب کے آل سعود کے سرگرم ہمدردوں میں شامل ہو گئے تھے۔

4.8.1 عرب قوم پرست اور سیاسی بیداری

ابتدائی زمانہ کی مذہب سے مخلوط عرب قومیت کے تصور سے عام عرب لوگ اور مختلف ملکوں کے عوام بڑی تعداد میں اُس کی طرف متوجہ ہوگئے۔ مصر میں سیاسی بیداری آنے لگی، عرابی پاشا اور جمال الدین افغانی کے خیالات پڑھے لکھے نوجوانوں میں پھیلنے لگے۔ مصطفی کامل (1874 تا 1908ء) نے ایک سیاسی پارٹی الحزب الوطنی قائم کی۔ جس کا نصب العین مصر کی کامل آزادی تھا۔ انہوں نے سیاسی جدوجہد کے علاوہ تعلیم کے فروغ کی بھی کوشش کی۔ مصطفی کامل ترکی نواز تھے اور خلافتِ ترکیہ سے تعلق وابستہ رکھنا چاہتے تھے۔ مصری قیادت کا وہ گروہ جو انگریز نواز تھا جس میں مفتی محمد عبدہ جیسے بڑے لوگ بھی شامل تھے وہ مصطفی کامل اور ان کی پارٹی سے اختلاف کرتے تھے۔ لیکن جب مصطفی کامل کے بعد قیادت نوجوانوں کے ہاتھ میں آئی تو وہ بھی انگریز نواز گروہ کی بولی بولنے لگے۔

اب قوم پرستانہ جذبات شدت اختیار کر رہے تھے نوبت یہاں تک پہنچی کہ مصر میں ایسی سیاسی پارٹیاں وجود میں آئیں جن میں الحزب الوطنی بھی شامل ہو گئی جنہوں نے العزت للعرب (عربوں کی جے) کے نعرے لگائے۔ بعض نے اِس سے بھی آگے بڑھ کر اپنا تعلق

اسلام اور مسلمانوں اوران کی تاریخ سے توڑ کر اپنے ماضی بعید کی طرف مراجعت کی آوازیں بلند کیں اور نحن اولادالفراعنۃ کا نعرہ لگایا۔ بعض شاعروں نے اس عرب قومیت کو زبردست ہوادی چنانچہ ایک بڑے اور مشہور شاعر رشید سلیم الخوری جو مہجری ادباء میں الشاعر القروی کے نام سے مشہور ہیں نے یہاں تک کہ ڈالا:

سلام علی کفر یوحد بیننا وابلاوسہلا بعدہ بجہنم

(میں ایسے کفر کو سلام کرتاہوں جو ہم عربوں کو متحد کردے اوراس اتحاد کے بعد میں جہنم کو بھی خوش آمدید کہوں گا)

(شعر العرب من النہضۃ الی الانتفاضہ محمد ایوب تاج الدین الندوی ص124)

4.8.2 عرب قوم پرستی کے جھوٹے مظاہر

زیادہ تر عرب حکومتوں نے اب وہ نئے نعرے اپنالیے ہیں جو چھوٹی چھوٹی قومیتوں کو ابھارتے ہیں اور اسے ترجیحات میں سرفہرست رکھتے ہیں۔ یہ نعرہ ترقی اور معاشیات کے حوالے سے حکومتوں کی تباہ کن ناکامی، بے روزگاری میں اضافے اور تعلیم اور صحت کے مسائل کے بعد مزید نمایاں ہوئے۔ اس طرح مختلف حکومتوں نے اپنے ہی ممالک کے درمیان امتیازی سلوک اور دیواریں کھڑی کرنا شروع کر دیں۔ جن سے علیحدگی کے رجحانات کو اور تقویت ملی مثال کے طور پر آج عرب دنیامیں 'سب سے پہلے اردن' سب سے پہلے لبنان' سب سے اوپر سعودی عرب' وغیرہ کے نعرے ایک عام اور جانی پہچانی چیز بن چکے ہیں، اور ہر عرب حکومت کسی غیر عرب وابستگی کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہی ہے، خواہ اس کا تعلق غیر عرب ثقافت سے ہی کیوں نہ ہو۔یعنی فرعونی، فونیشین، افریقی وغیرہ۔ لیکن یہ تنگ نظری صرف قومی اور قومی سطح پر بدقسمتی ہی لے کر آئی۔ مصر، الجزائر، عراق، لبنان، اوریمن جیسے ممالک خونی تشدد یا فرقہ وارانہ تقسیم کا شکار ہوئے، جو بعض اوقات خانہ جنگیوں تک پہنچ جاتی ہے، اور زیادہ تر عرب ممالک جن کے پاس پیٹرول نہیں ہے بے روزگاری، غربت، جہالت، یا ناخواندگی کی بڑھی ہوئی شرح کو کم کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

4.8.3 عرب قوم پرستی اور سیاسی آزادی

جہاں تک عرب قوم پرستی اور سیاسی آزادی کا سوال ہے تو اس سے قبل یہ یہ بتایا جاچکاہے کہ جب ترکی میں مشروطیت یا دستوری نظام قائم ہوا اور خلافت کا نظام کمزور پڑ گیا تو عربوں میں ترکوں سے علیحدگی کی جو خفیہ تحریکیں چل رہی تھیں ان میں اور تیزی آگئی۔اِس میں شامل عراقی افسران نے "العہد" نامی خفیہ تنظیم قائم کی تھی جس کی شاخیں بصرہ، بغداد اور موصل میں تھیں۔1916 میں عربوں نے عثمانیوں کے خلاف بغاوت شروع کی۔اور نومبر 1918 تک عرب باغیوں کی مدد سے انگریز فوجیں پورے عراق پر قابض ہو گئیں۔

عربوں کو جھوٹے اور خفیہ معاہدوں میں انگریزوں نے پھنسایا تھا عربوں کی آنکھیں اُس وقت کھلیں جب 1920 میں دمشق میں انگریزوں کی مدد سے شریف حسین آف مکہ کے ایک بیٹے فیصل کو شام کا بادشاہ بنادیا گیا تو عراقی رہنماؤں نے شریف حسین کے دوسرے بیٹے امیر عبداللہ کو عراق کا حکمراں منتخب کیا۔ مگر انگریزوں نے اس کو تسلیم نہ کرکے عراق پر اپنا براہ راست کنٹرول قائم کرلیا۔اب عراقیوں کی سمجھ میں آیا کہ ان کے ساتھ دھوکہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کر دی۔اس طرح کافی جدوجہد کے بعد آزادی

حاصل ہوئی۔

انگریزی دور میں سوڈان مصر سے الگ ہوا۔اوراسی دور میں ملک کے نو فیصد قبطی عیسائی اس کی معیشت وتجارت وصنعت اور سرکاری ملازمتوں میں چھاگئے۔یہی صورت حال آج بھی برقرار ہے۔انگریزی دور میں مصر میں شراب اور جوئے خانے،نائٹ کلب اور قحبہ گیری کے اڈوں کو لائسینس مل گیا۔فلم ڈرامااورآرکیسٹرا وغیرہ وجود میں آئے۔اس کے علاوہ شرعی قوانین کو کالعدم کرکے مغربی قوانین رائج کیے گئے۔لارڈکرومرنے اسلام کے عائلی قوانین پر سخت تنقید کی۔انگریزوں اور ترکوں میں نفرت کو بڑھاوادیا۔انگریزوں نے جدید تعلیم یافتہ قوم پرست مصریوں میں اس خیال کو پروان چڑھایا کہ اسلام جدید دور کے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتا۔چنانچہ بعد میں مصری ادیب اور وزیر معارف(وزیر تعلیم)ڈاکٹر طہٰ حسین اوران کے حامیوں نے اس خیال کا پرچار کیا۔شیخ رفاعہ الطہطاوی جنہوں نے پیرس جاکر جدید تعلیم حاصل کی تھی وہ بھی فرانسیسی طرز تعلیم رائج کرناچاہتے تھے۔

4.9 مذہبی ظلم وجبر

مذہبی پرسی کیوشن کی بہت بڑی مثال جمہوریہ ترکیہ میں دیکھنے میں آئی جہاں ترک قوم پرستوں نے مصطفی کمال کی قیادت میں بیرونی محاذپر توجہ مرکوز کی اور 1911 میں طرابلس اوربلقان کی جنگ میں بھی انہوں نے شرکت کی ۔گیلی پولی یادرۂدانیال کی جنگ میں انہوں نے برطانیہ اور فرانس کی متحدہ فوج کوپسپاکردیا۔اُس کے بعد ان کی یونانیوں سے کئی اور محاذوں پر جنگ ہوئی۔نومتبر 1922 کو انہوں نے یونانیوں سے ازمیر بھی واپس لے لیا۔ان کی فتوحات کو دیکھ کر اتحادیوں نے استنبول بھی خالی کردیا۔آزادی کے بعد پنج سالہ منصوبہ کے تحت ترقیاتی کام شروع کیے۔یونان سے آبادی کی نقل مکانی کا معاہدہ کیاجس کی روسے چارلاکھ ترک یونان سے ترکی آئے اور کئی لاکھ مسیحی یونان گئے۔ملک میں داخلی استحکام پیداکیا۔

کمال اتاترک کے ان قابل تحسین کارناموں کے ساتھ ہی ترک قوم پرستوں نے مصطفی کمال کی قیادت میں سیکولرزم کی انتہاپسندانہ تعبیر کواختیار کیاتھاجس کا نتیجہ مذہب سے جنگ کی صورت میں نکلا۔چنانچہ انہوں نے ترکی زبان کا رسم الخط فارسی سے لاطینی کردیا۔جس کی وجہ سے ترکی کی نئی نسل کارشتہ اپنے ماضی کے بیش بہاعلمی سرمایہ سے کٹ گیا۔عربی زبان کی مخالفت کی۔اذان ترکی میں دی جانے لگی۔مذہبی تعلیم یک قلم موقوف ہوئی،درویشوں اور صوفیاء کے سلسلوں کومکمل طورپر بند کردیاگیا۔کیونکہ ان کورجعت پسندی کی علامت سمجھا گیاتھا۔عائلی قوانین اسلامی فقہ کی بجائے مغرب سے مستعار لیے گئے۔اوران چیزوں پر سختی سے عمل ہوا۔پردہ اور حجاب پرپابندی عائد کی گئی یوں عرب دنیاسے رشتہ کاٹ لیا۔اس طرح ایک انتہاپسندانہ ترک قوم پرستی ملک میں مسلط ہوگئی۔اُس سے اختلاف کرنے پر ہزارہامذہبی لوگوں کو جیلوں میں ٹھونس دیاگیااور بہت سوں کوپھانسی دیدی گئی۔ان سخت حالات میں شیخ بدیع الزماں سعید نورسی، ان کے شاگردوں اوررسائلِ نورنے ترکی میں اسلام کی شمع کو جلائے رکھا۔یہ انتہاپسندانہ ترک قوم پرستی تھی۔

4.10 مذہبی آزادی کا خاتمہ

لیکن انتہا پسند عرب قوم پرست بھی مذہب دشمنی میں پیچھے نہیں رہے۔ مثال کے طور پر یمن میں عرب قوم پرستی کی لہر میں یہاں بیرونی قوتوں کے عمل دخل سے سوشل ازم نے فروغ پایا الحادی نظریات کا بول بالا ہوا۔ روس نے اس کی امداد کی اور نتیجہ یہ ہوا کہ آزادی کے بعد شمالی یمن سے اِن کا کئی بار تصادم ہوا۔ انہوں نے اسلام پسندوں جماعت کی بیخ کنی کی کتنے ہی علما اور داعیوں کو مارڈالا اور کتنوں کو جان بچا کر دوسرے ملکوں میں پناہ لینی پڑی۔

جدید اسلامی تاریخ دانوں کے مطابق عربوں میں قوم پرستی کے تصور کو مقبول بنانے میں یہودی فری میسن تحریک کا بھی بڑا حصہ ہے۔ ترکوں کے تمام نامور جدید لیڈر فری میسن لاج سے تعلق رکھتے تھے۔ لبنان کے عیسائیوں نے 1857 میں الجامعۃ العلمیۃ السعودیۃ کے ایک خفیہ تنظیم قائم کی تھی اور اس میں مسلمانوں کو بھی شامل کیا گیا۔ اس تنظیم کے لوگوں کے بھی فری میسن لاجوں سے تعلقات تھے۔ (ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ جلد سوم، ص297)

بعث پارٹی خاص طور پر عراق و شام میں بہت دنوں تک حکمراں رہی مگر اس کا طرز عمل دونوں جگہ سخت مذہب دشمن رہا۔ عراق میں بعثیوں نے اپنے دورِ اقتدار میں اسلام پسندوں جبر و تشدد کا نشانہ بنایا اور سختی سے ان کو کچل دیا۔ اسلامی جمعیتوں اور جماعتوں کو کبھی پنپنے نہیں دیا گیا بلکہ ان کو رجعت پسند اور ارہابی (دہشت گرد) قرار دیا جاتا اور ذرا سے اختلاف پر قتل کر دیا جاتا۔

شام بھی قوم پرستوں کا گڑھ رہا ہے۔ انہوں نے پہلے فرانسیسی استعمار کے خلاف مسلح جدوجہد کی اور جب ان کی فوجی بغاوت کچل دی گئی تو انہوں نے پرامن طریقے پر دوسرے محاذوں پر کام کیا۔ قاہرہ، پیرس، جنیوا اور نیو یارک میں نشر و اشاعت کے ادارے قائم کیے جریدے نکالے جس میں شکیب ارسلان بہت آگے تھے۔ آخر میں قوم پرستوں نے ایک عام ہڑتال کر دی جو پچاس دن تک جاری رہی جس کے آگے حکومتِ فرانس کو آخر جھکنا پڑا۔ ستمبر 1936 میں عرب قوم پرستوں اور حکومتِ فرانس کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے شام کو متحد کر دیا گیا۔ لیکن آزادی کے بعد شام میں بعثی نصیری نظریہ اور کبھی کیمونسٹ عناصر اقتدار میں آتے رہے مگر ان سب نے نہ صرف مذہب پسندوں کا گلا دبایا بلکہ انہوں نے ملک میں بدترین آمریت قائم کیے رکھی۔ مثلاً کرنل حسنی زعیم، سامی الحفناوی، نورالدین الاتاسی، ادیب ششکلی، جنرل امین الحافظ اور حافظ الاسد یہ وہ ظالم و سفاک فوجی جنرل تھے جو سب بعثی یا کمیونسٹ رجحان رکھتے تھے لیکن ملک میں بار بار فوجی انقلاب لاتے رہے۔ انہوں نے بنیادی انسانی حقوق کو پامال کیا اور مؤخر الذکر نے شہر حماۃ میں ایک ہی دن میں دس ہزار اسلام پسندوں کو شہید کر دیا تھا۔

بالکل ایسا ہی عراق میں بعث پارٹی نے اپنے اقتدار کے دور میں کیا ۔

عراق میں قوم پرست جنرل عبدالکریم قاسم نے 14 جولائی 1958ء کو پہلا فوجی انقلاب عراق میں برپا کیا اور وزیر اعظم نوری پاشا، نوجوان شاہ فیصل ثانی اور خواتین سمیت ان کے خاندان کے تمام افراد کو بے رحمی سے قتل کر دیا۔ ان کے دور میں عراق کے شہری زندہ

رہنے کے حق سے بھی محروم ہوگئے۔ انہوں نے کمیونسٹوں کو آگے بڑھایااوران کو کھلی چھوٹ دے دی جنہوں نے فوج میں سے چن چن کر اسلام پسند افسران کو ہلاک کروادیا۔ موصل اور کرکوک میں 5 ہزار مسلمانوں کو ان کے خلاف آواز اٹھانے کے جرم میں ماردیا۔ کتب خانوں میں آگے لگادی۔ اس آمریت کے رد عمل میں فوج نے دوبارہ 8 فروری 1962 کو عبدالسلام عارف کی قیادت میں انقلاب برپا کر دیا۔ اور کچھ اصلاحات لائے۔

عبدالسلام کی اچانک موت کے بعد ان کے بھائی عبدالرحمن عارف صدر منتخب ہوئے مگر فوج میں جو بعثی افسران تھے انہوں نے 1968 کو میجر جنرل احمد حسن البکر کی قیادت میں پھر انقلاب برپا کر دیا۔ ان کے بعد صدام حسین نے احمد حسن البکر کو اقتدار سے الگ کرکے اپنے ہاتھ میں زمام اقتدار لے لی، ان کے زمانہ میں اوران سے پہلے بھی اسلام پسندوں پر زبردست پابندیاں لگی ہوئی تھیں۔ زبان بندی تھی حکومتِ وقت پر تنقید برداشت نہیں کی جاتی تھی اور ہزراوں لوگوں کو زندان میں ٹھونس دیا گیا تھا۔ سیریا کے بعثی نظام نے جواب بھی قائم ہے اپنے خلاف نعرہ بازی کرنے پر لاکھوں انسانوں کو بدترین تشدد کا نشانہ بنایا۔ بمباری کرکے پورے شہر کے شہر برباد کر دیے۔ ملینیوں لوگ جلاوطن ہوگئے اور ہزاروں اب بھی جیلوں میں بدترین تشدد جھیل رہے ہیں۔

اسی طرح الجزائر میں آزادی کی جنگ میں اسلام پسند اور لبرل ایک ہی پیج پر تھے مگر عرب قوم پرست حبیب بورقیبہ آزاد خیال اوراصلاح پسند تھے۔ انہوں نے روایتی بادشاہت کو ختم کرکے ملک کو جمہوریہ بنادیا۔ امریکی طرز کا صدارتی نظام پسند کیا۔ جس کے بعد وہ آمر مطلق بن گئے اور ہر بار انتخابات میں صرف وہی جیتنے لگے اور 1987 تک وہ اکیلے ہی صدر منتخب ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ جنرل زین العابدین بن علی نے فوج کی مدد سے اقتدار سے بے دخل کر دیا۔ غرض یہ کہ قوم پرست کسی بھی ملک میں سیاسی آزادی لوگوں کو فراہم نہ کرسکے وہ جس ملک میں بھی اقتدار میں رہے وہاں مسلسل عدم استحکام رہا۔ لیبیا میں عرب قوم پرستی، افریقیت اور سوشلزم کے ملغوبہ پر مشتمل جنرل معمر قذافی کی کتابِ اخضر کو نافذ کیا گیا۔ چار دہائیوں تک ملک میں ترقیاتی کام بھی ہوتے رہے لیکن بدترین آمریت بھی برپا رہی۔ انہوں نے مختلف ملکوں میں آزادی کی تحریکوں کی حمایت کی، مغربی استعمار کا مقابلہ کیا وہیں برادر اسلامی ملکوں کے اندرونی معاملات میں ٹانگ بھی اڑاتے رہے۔ عوام سے تمام بنیادی آزادیاں چھین لیں اور لیبیا کو عملاً ایک پولیس اسٹیٹ بنادیا۔ خلاصہ یہ ہے کہ عرب قوم پرستی اپنے سیاسی تجربات میں یکسر ناکام ثابت ہوئی۔

4.11 کلیدی الفاظ

عروبہ	:	عرب قوم پرستی	حسب ونسب	:	ماں باپ کی طرف سے رشتہ
مجسم	:	صورت میں	فصیح	:	فصاحت سے بولنے والا، زبان آور
تفریق	:	الگ الگ کرنا	مساوات	:	یکسانیت
مناصب	:	عہدے ذمہ داریاں	بعث	:	اٹھنا، انقلاب

آفاق	چاروں اطراف	اقتصادی انضمام	معاشی طور پر ایک ساتھ ہو جانا
وحدت عربی	عربوں کا اتحاد	مستشرق	مشرقی یعنی اسلامی و عربی علوم کا عالم
متصلب	سخت و شدید	بدعات	دین میں نئی بات نکالنا
زوال	انحطاط کا شکار ہو جانا	اوہام	وہم کی جمع جس چیز کی کوئی حقیقت نہ ہو
زیر نگیں	ماتحت	استبداد	صرف اپنی چلانا دوسرے کی نہ سننا
مداخلت	دخل دینا	مقبوضات	جن علاقوں پر قبضہ ہو گیا ہو
رد عمل	ری ایکشن	رجعت پسندی	دقیانوسی، قدامت پسندی
مخلوط	ملا جلا	العزة للعرب	عربوں کی جے ہو، عرب زندہ باد
مراجعت	واپس جانا	فلاح	کامیابی
قحبہ گیری	طوائف بازی	مستعار	ادھار لیا ہوا
تصادم	ٹکراؤ	عصبیتیں	تعصبات، کسی کے لیے بے جا حمایت
وطنی	وطن کا، قومی	مطلق العنانی	بس اپنی چلانا
جابرانہ	ظالمانہ	دخیل	بیرونی
ارہابی	دہشت گرد		

4.12 خلاصہ

عرب قومیت یا عروبہ کا تصور سادہ شکل میں تاریخ میں ہمیشہ پایا جاتا رہا۔ عہد اسلامی میں بھی اس کی مثالیں مل جاتی ہیں۔ مگر اس وقت مذہب اسلامی اور عربی زندگی کا بنیادی حوالہ تھا اس لیے معاشرہ قوم پرستی کے منفی اثرات سے بچ جایا کرتا تھا۔ بیسویں صدی میں جو عرب قوم پرستی پروان چڑھی وہ بنیادی طور پر مغرب سے برآمد شدہ اجنبی اور دخیل تصورات پر مبنی تھی۔ جس کی ابتدا بنیادی طور پر ترک سلطنت، ترک قوم پرستی کے رد عمل میں ہوئی تھی۔

بعض مستشرقین اور مغربی ممالک کے آلہ کاروں نے عربوں میں یہ پروپیگنڈا کیا کہ ترک عربی زبان اور عرب کلچر کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ بلاشبہ ترکوں نے عربی زبان اور عرب کلچر سے بے زاری کا ثبوت دیا تھا لیکن اس کا سبب عرب دشمنی نہیں بلکہ یہ تھا کہ فاتح عثمانی ترک ایک سپاہیانہ قوم تھے علوم وفنون سے ان کو بہت کم دل چسپی تھی۔ ان کے اندر جابر بادشاہت کے تمام جراثیم سرایت کر گئے تھے۔ وہ فقہ حنفی کے متصلب پیرو تھے اور مختلف صوفیاء کے حلقوں سے وابستہ تھے اس لیے اوہام وخرافات اور بدعات کا زبردست چلن عثمانی قلمرو میں

جاری تھا جس کی وجہ سے عربوں کو ان سے جائز شکایات پیدا ہو گئی تھیں۔

بعض عثمانی حکام کے جابر رویوں اور استبدادی فیصلوں سے بھی ان شکایات کو جلا ملتی تھی۔ عرب قومیت کا خیال اسی سیاسی بے اعتمادی کی فضا میں پیدا ہونا شروع ہوا۔ اِس کو یورپ کے نیشنل اسٹیٹ کے تصور نے اور جلا دی۔ بعد میں مسیحی عربوں نے اس تصور کو باضابطہ پروان چڑھایا۔ شریف حسین آف مکہ اور ہاشمیوں نے اس سے سیاسی فائدہ اٹھایا۔ لیکن اِس میں شدت بعثی نظریات سے آئی۔ عربوں اور ترکوں کی اس کشمکش کو پیدا کرنے میں لارنس آف عربیا کا بھی کردار ہے اور مغربی ذرائع ابلاغ کا بھی جو ترکی سلطنت کو کمزور کرنا چاہتے تھے۔

یہ بات صحیح ہے کہ عرب قومیت کا آغاز مذہبی رہنماؤں اور علماء کے اصلاح پسند نعروں سے ہوا۔ اس سلسلہ میں شیخ عبدالرحمن الکواکبی نے ایک کتاب لکھی: طبایع الاستبداد اس کتاب میں عثمانی سلاطین کے استبداد اور مطلق العنانی اور جابرانہ پالیسیوں پر تنقید تھی۔ انہوں نے حکمرانی میں استبداد و مطلق العنانی کے نقصانات سے قوم کو آگاہ کیا تھا۔ اِس طرح سے یہ کتاب گرچہ ملوکیت پسندانہ رویوں پر نظر ثانی کی دعوت تھی مگر بالواسطہ پڑھے لکھے حلقے اور خاص کر علما کے درمیان غیر عرب حکومت اور اُس کی آمریت پسندی کے خلاف ایک احتجاجی لہر پیدا ہوئی تھی۔ بعد میں اس میں مغربی اسکالروں کے دخل اور مستشرقین کے زیر اثر بڑی انتہا پسندی پیدا ہو گئی جس کی وجہ سے کہا جا سکتا ہے کہ آغاز میں عرب قومیت پر مذہبی رنگ غالب تھا مگر بعد میں یہ اشتراکیت اور بعثیت کی علمبردار بن گئی۔ جو تشدد کی قائل تھی اور جس کی وجہ عرب ممالک مستقل فوجی انقلابات کی زد میں رہتے تھے اور سیاسی عدم استحکام ان کا مقدر بن گیا تھا۔ اور کم و بیش آج بھی صورت حال یکساں ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ عرب قوم پرستی کے رجحانات نے عرب دنیا میں سیاسی بیداری پیدا کی اور انگریزوں اور فرانسیسی سامراج کے خلاف سیاسی آزادی کی مہم میں اس نظریہ نے بنیادی کردار ادا کیا۔ لیکن اس کا ایک منفی پہلو یہ نکلا کہ قوم پرستی کے ایک رجحان نے دوسرے رجحان کو برداشت نہیں کیا، عدم برداشت اور تشدد کا پورے عالم عربی میں وحشیانہ مظاہرہ ہوا خاص کر سیریا کی حالیہ سِول وار کے اندر۔

پنڈت نہرو نے لکھا ہے:

We have seen what a powerful force nationalism has been in binding togather and strenthening groups of people living in countries usually with a common language and traditons. While this nationiam binds together one such group, it marks it off and separeates it still further from othe groups. Glimpses of World History page 755 Oxford University press 1984

یعنی نیشنل ازم لوگوں کی ان جماعتوں کو جن کی زبان اور روایات ایک ہوں تو باہم جوڑ کر انہیں قوت بنا دیتا ہے مگر یہی نیشنل ازم اس گروپ کو انسانوں کے دوسرے گروپوں اور جماعتوں سے بہت دور بھی کر دیتا ہے "

چنانچہ عرب قوم پرستی جب انتہا کو پہنچنے لگی تو اب اس سے مختلف چھوٹی چھوٹی عصبیتیں اور مقامی وطنی رجحانات پیدا ہونے لگے جن

کو مختلف ممالک کی حکومتوں نے بھی تقویت دی اس طرح مختلف حکومتوں نے اپنے ہی ممالک کے درمیان امتیازی سلوک اور دیواریں کھڑی کرنا شروع کر دیں۔ جن سے علیحد گی کے رجحانات کو اور تقویت ملی مثال کے طورر آج عرب دنیامیں 'سب سے پہلے اردن' سب سے پہلے لبنان' سب سے اوپر سعودی عرب' وغیرہ کے نعرے ایک عام اور جانی پہچانی چیز بن چکے ہیں، اور ہر عرب حکومت کسی غیر عرب وابستگی کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہی ہے، خواہ اس کا تعلق غیر عرب ثقافت سے ہی کیوں نہ ہو۔یعنی فرعونی، فونیشین، افریقی، یا کچھ اور۔ لیکن یہ تنگ نظری صرف قومی اور قومی سطح پر بدقسمتی ہی لے کر آئی۔ مصر، الجزائر، عراق، لبنان، اور یمن جیسے ممالک خونی تشدد یا فرقہ وارانہ تقسیم کا شکار ہوئے، جو بعض اوقات خانہ جنگیوں تک پہنچ جاتی ہے۔

4.13 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- عرب قوم پرستی اور بعث کے نظریات کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔
- یہ معلوم کیا کہ جدید عرب قوم پرستی کے کیا رجحانات رہے ہیں۔
- آپ نے سیکھا کہ مذہبی علما نے عرب قوم پرستی کو بڑھانے میں کیا کردار ادا کیا۔
- فہمی ہویدی اور عبد الوہاب مسیری عرب قومیت کے کس رجحان کی نمائندگی کرتے ہیں یہ آپ کو بتایا گیا۔
- حافظ الاسد کے بعثی اقتدار میں کیا ہوا اس کی معلومات آپ کو دی گئیں۔
- عراق میں بار بار فوجی انقلابات آتے رہے اس کی وجہ جانی۔

4.14 نمونہ امتحانی سوالات

4.14.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. طبایع الاستبداد کس نے لکھی؟

(a). قاسم امین (b). طٰہٰ حسین (c). عبد الرحمن الکواکبی (d). سید قطب

2. عرب قوم پرستی کی سب سے بلند آواز کن تھے؟

(a). رشید رضا (b). رشید سلیم الخوری (c). میشال عفلق (d). امیر شکیب ارسلان

3. مصطفی کامل غیر مذہبی عربیت کے علمبردار تھے؟

(a). صحیح ہے (b). غلط ہے

(c). ان میں سے کوئی نہیں (d). وہ مصری سیاسی آزادی کے لیے کام کر رہے تھے

4. بعث کا تصور ہے؟

(a). عرب قوم پرستی

(b). مذہب دشمن عرب قوم پرستی

(c). اس کا نفاذ صدام حسین نے شام میں کیا

(d). اس کا نفاذ حافظ الاسد نے شام میں کیا

4.14.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. جاہلی دور میں عرب قوم پرستی کی کوئی مثال دیجیے۔
2. تاریخ اسلام میں یہ تصور زندہ رہا؟ آپ کیا سمجھتے ہیں لکھیے۔
3. اموی دور کو عربی عصبیت کا دور کیوں کہتے ہیں، بتائیے۔
4. العزۃ للعرب کے نعرے کا پس منظر بیان کیجیے۔
5. بیسویں صدی میں ممتاز عرب قومیت کی علمبردار انجمنوں کے نام لکھیے۔

4.14.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. عرب قوم پرستی کی تحریک نے عرب ممالک کو یوروپی سامراج سے آزاد کرانے میں مدد دی تشریح کیجیے۔
2. جدید دور میں عرب قومیت کا آغاز مذہبی رہنماؤں نے کیا تفصیل سے لکھیے۔
3. عرب قومیت پرستوں نے سیاسی آزادی کے لیے کام کیا مگر لوگوں کی بنیادی آزادیاں چھین لیں، وضاحت کریں۔

4.15 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ : ثروت صولت جلد سوم
2. ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ : ثروت صولت جلد چہارم
3. شعر العرب من النہضۃ الی الانتفاضۃ : محمد ایوب تاج الدین الندوی
4. القومیۃ العربیۃ: وکی پیڈیا
5. Philip K Hitti, History of the Arabs

اکائی 5: جدید ترکی اور سیکولر حکومت کا قیام

اکائی کے اجزا:

5.0 تمہید

5.1 مقاصد

5.2 تاریخی پس منظر

5.3 ترکی اور جنگ عظیم اول

5.4 سیکولر حکومت کا قیام

5.4.1 مصطفی کمال پاشا: حیات و خدمات

5.4.2 مصطفی کمال اور جنگ آزادی

5.4.3 جمہوری حکومت کا قیام

5.4.4 مصطفیٰ کمال کی اصلاحات

5.4.5 سیکولر اصلاحات

5.4.6 تعلیمی اصلاحات

5.5 عصمت اینونو

5.6 جلال بایار کا دور حکومت

5.7 حزب عدالت پارٹی

5.8 ملی سلامت پارٹی

5.9 نیا دستور اور سیاسی پارٹیاں

5.10 اکتسابی نتائج

5.11 نمونہ امتحانی سوالات

5.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
5.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
5.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
5.12 تجویز کردہ اکتسابی مواد

5.0 تمہید

جدید ترکی کی تاریخ انیسویں صدی عیسوی سے شروع ہوتی ہے اور اس صدی کے اختتام اور بیسویں صدی کی ابتداء پر اس میں ترقیاتی عناصر کے اجزاء زیادہ واضح نظر آتے ہیں۔ سلطنت عثمانیہ کے آخری دور میں دستوری حکومت اور پھر نوجوان ترکوں کی انجمن اتحاد و ترقی کی داغ بیل اور 1908ء میں انکا اقتدار میں آجانا یہ سب جدیدیت کے نقطہ نظر کا آغاز کہا جا سکتا ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر، یورپ کی اتحادی قوتوں نے عثمانی سلطنت کے مختلف علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا جس سے آزادی دلوانے کے لئے مصطفی کمال اتاترک نے 1919ء میں قومی تحریک کا آغاز کیا، جس نے نہ صرف ملک سے یورپی اتحادی قوت کا خاتمہ کیا بلکہ سلطنت عثمانیہ کی باقیات کو ختم کرکے ایک نئی جمہوری ریاست ترکی کے قیام کی راہ ہموار کی۔ 1923ء میں، ترکی نے جمہوریہ کا اعلان کیا، اور اتاترک نے اس ریاست کو ایک جدید، سیکولر، اور قومی ریاست میں تبدیل کرنے کی کوشش کی جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔ سیکولر حکومت کے قیام سے ترکی میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے جہاں مغربی تہذیب و تمدن اور سیاسی طرز حکومت کو ملک کی ترقی کا ضامن مانتے تھے۔ اسی لئے عثمانی خلافت کے خاتمہ میں ان عناصر کا بڑا اہم کردار رہا جو مغربی طرز زندگی اور بود و باش کو اختیار کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔

5.1 مقاصد

اس یونٹ کا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعہ طالب علم کو ترکی کے دور جدید کا علم ہو جائے، کہ کس طرح ترک نوجوانوں نے ملک کو ترقی یافتہ بنانے کے لئے مغربی افکار و نظریات کو اختیار کیا، نیز طلبہ کو اس بات سے متعارف کرایا جائے 6 کہ عثمانی سلطنت کے زوال اور جدید ترکی میں جمہوری حکومت کے قیام میں مصطفیٰ کمال کی شخصیت ملک کے ہیرو کی رہی۔ چہ جائے کہ انہوں قیام حکومت کے ساتھ ہی اسلامی شعائر اور شریعت محمدی کے نفاذ پر پابندی لگادی۔ ملک میں سیکولر اور جمہوری نظام کے قیام میں مصطفیٰ کمال کے نظریات کس اہمیت کے حامل ہیں۔

5.2 تاریخی پس منظر

جدید ترکی کی تاریخ کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ سلطنت عثمانیہ کے آخری دور کے واقعات و ملک کے حالات کا جائزہ لیا جائے

تبھی ترکی میں جدیدیت اور جدید ترکی کے نقطۂ آغاز کو سمجھا جاسکتا ہے۔ ترکوں میں جدید ترکی کا تصور انیسویں صدی کے آغاز سے ہی مغربی خیالات کے زیر اثر دکھائی پڑتا ہے جب عثمانیوں کی تہذیب و تمدن اور طرز معاشرت پر تبدیلی کے اشارے ملتے ہیں۔ یہ دور ترکی میں چھ سو سالوں سے قائم سلطنت عثمانیہ کے زوال کا دور ہے اور یہیں سے ترکوں میں جدید ترکی کے تصورات اور انہیں عملی جامہ پہنانے کی کوششیں شروع ہوتی ہیں۔ دراصل اس کی ابتداء سلطان عبد المجید اول کے دور سے ہوتی ہے، جن کے دور حکومت میں حکومت کے انتظامی، فوجی، سیاسی، سماجی اور مذہبی امور میں اصلاحات کا سلسلہ شروع ہوا جس میں انتظامیہ، تعلیم، اقلیتوں اور فوجی امور کے شعبے میں اصلاحات کی گئیں۔ یہ اصلاحات دراصل نئے ترک وزراء فواد پاشا، عالی پاشا اور مدحت پاشا کی کوششوں کا نتیجہ تھیں، اس عملی اقدام کو تاریخ میں تنظیمات کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اور یہ ترکی کی تاریخ جدید میں پہلی دستوری اصلاحات بھی تھی۔ دراصل ترکی میں اصلاحات کی یہ کوششیں ان نوجوان تعلیم یافتہ ترکوں کا پیش خیمہ تھیں جنھوں نے مغربی ممالک سے تعلیم حاصل کی اور مغربی افکار و نظریات اور طرز جمہوریت کے قائل تھے، وہ اسی انداز کو اپنے ملک کی فلاح و بہبود کی ضمانت سمجھتے تھے۔ نوجوان ترکوں کی انجمن 1860ء میں انجمن اتحاد و ترقی، اور نوجوان عثمانی کے نام سے قائم ہوئی تھی۔ وہ ملک میں سیکولر حکومت اور نظام کو قائم کرنا چاہتے تھے جس کے لئے انہوں نے سلطان عبد العزیز کو معزول کر دیا اور پھر قتل کرا دیا، تاکہ وہ سلطان مراد کے ذریعہ ملک میں مغربی اثر و رسوخ کو پروان چڑھا سکیں اور دستوری حکومت کی بحالی میں مدد لی جاسکے۔ لیکن سلطان مراد نوجوان ترکوں کی سازشوں کے اثرات سے نہ ابر سکا اور اسے بھی اپنے تخت سے معزول ہونا پڑا۔

اسی لئے جب سلطان عبد الحمید بر سر اقتدار آئے تو انہوں نے ان عناصر کی بیخ کنی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ انہوں نے اپنے والد اور چچا کو ان نوجوان ترکوں کی اصلاحات تنظیمات اور مغرفی افکار اور مغرب کی مداخلت، اور ان نوجوان ترکوں کی حکمت عملی نے انہیں اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ اپنا راستہ الگ کر لیں۔ چنانچہ اپنی تخت نشینی کے وقت سلطان عبد الحمید نے مدحت پاشا سے کئے گئے وعدے کے مطابق دستور اساسی کا اعلان کر دیا، جس سے عوام میں خوشی کا ماحول تھا۔ یہ دستوری پارلیمنٹ دو ایوانوں پر مشتمل تھی جس کا افتتاح 1877ء میں ہوا۔ اسلامی دنیا میں مغربی طرز کی یہ پہلی شوریٰ اور سلطنت عثمانیہ پہلی بادشاہت تھی جس نے دستوری اور آئینی پابندیوں کو قبول کیا۔ لیکن جلد ہی اس امر کا خاتمہ ہو گیا کیونکہ ابھی اس تقریب کو ایک ماہ ہی ہوئے تھے کہ روس نے اپریل 1877ء کو دریائے ڈینوب کے جنوبی حصہ پلونا کے مقام پر حملہ کر دیا، جس سے سلطان عبد الحمید کو موقع مل گیا اور انہوں نے غیر معمولی حالات کا بہانہ بنا کر دستور معطل کر دیا، پارلیمنٹ برخاست کر دی گئی اور مدحت پاشا کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس جنگ کے نتیجہ میں رومانیہ کو آزادی حاصل ہو گئی، بلغاریہ، سرویا، اور مونٹی نگرو میں خود مختار حکومتیں قائم ہو گئیں، نیز برطانیہ نے بھی اپنی ہمدردانہ مداخلت کے صلہ میں قبرص پر قبضہ کر لیا اور ساتھ ہی مصر بھی اس کے حصہ میں چلا گیا نیز فرانس نے بھی تونس پر اپنا قبضہ جما لیا۔

اٹھارہویں صدی کے آخر میں روس و ترکی کی جنگ سے حکومت عثمانیہ میں ایک نئی تاریخ کی ابتداء ہوئی اور وہ یہ تھی کہ ترکوں کا نظام حکمرانی مغربی فکر، سیاست اور فوجی نظام کے سامنے ماند پڑ گیا تھا۔ ترکی عوام پر قومیت کا غلبہ ہونے لگا تھا نیز مغربی تہذیب و تمدن کے اثرات نمایاں طور پر دکھائی دینے لگے تھے۔ سلاطین عثمانیہ کو ابھی بھی قدیم فوجی نظام پر بھروسہ تھا، وہ مغربی اقوام کی طرح روحانی ترقی پر

دنیاوی ترقی کو ترجیح دینے کے لئے تیار نہ تھے۔ سلاطین ایسی کسی اصلاح کے لئے تیار نہ تھے جس سے عوام میں آزادی فکر اور سماجی انقلاب کے آثار نمایاں ہوں۔ وہ صرف اپنی ذات سے متعلق تبدیلی و اصلاح کرنے کو تیار تھے، لیکن یہ کوئی ایسا قدم نہیں تھا جس سے عوام میں مغربی خیالات مقبولیت حاصل کر پاتے۔ چنانچہ انہوں نے سب سے پہلے فوجی اصلاحات کی طرف توجہ دی۔ فوج میں لازمی بھرتی اور طویل مدت ملازمت کو رواج دیا، نپولین کے فوجی افسروں کو فوج میں جگہ دی گئی لیکن یہ سارے امور بھی ترکوں میں مغربی طرز حکومت اور طرز معاشرت کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ اس لئے کہ سلطنت کو دیگر اداروں میں مناسب اصلاحات کئے بغیر ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سلاطین عثمانیہ نے اپنے اقتصادی اصولوں میں کسی طرح کی تبدیل نہیں کی تھی ملک کی آمدنی کا دارومدار صرف کسان تھے اور وہ فوجی اصلاحات کے نتیجہ میں بڑھنے والے اخراجات کو پورا کرنے سے ملک کا اقتصادی نظام قاصر تھا، اور یہی وجہ تھی کی فوجی اصلاحات کے باوجود ملک میں انقلابی تحریکیں اپنا قدم مضبوط کر رہی تھیں۔ ملک کی تجارت پر زیادہ تر مغربی تاجر حاوی تھے، یہاں تک کہ ملک کے حالات کو بہتر بنانے کے لئے سلاطین کو ان تاجروں سے قرض لینا پڑا جس سے نئی پریشانیوں نے سر اٹھایا۔

لیکن عوام ان سب باتوں سے بالاتر سیاسی آزادی حاصل کرنا چاہتی تھی، 1850 سے 1920 کے درمیان تین بڑی تحریکیں شروع ہوئیں جس میں اصلاحات و تنظیمات کا دور پھر دستوری دور اور اخیر میں تحریک آزادی جس کے بانی مصطفیٰ کمال اتاترک تھے نے کامیابی حاصل کی۔ ترک عوام پر پڑنے والے مغربی اثرات کے زیر اثر مدحت پاشا نے ملک کی اقتصادی، تعلیمی اور انتظامی حالات کی درستگی کا ذمہ اپنے سر لیا، اور ایک ایسی حکومت کا نظم قائم کرنا چاہا جس میں تمام قوموں کی نمائندگی کی جا سکے، لیکن ان کی یہ کوشش بھی ناکام ہوئی اور 1881ء میں وہ عبد الحمید کے ذریعہ شہر بدر کر دئے گئے۔ سلطان عبد الحمید کی تیس سالہ حکومت اپنے اختتام کو پہنچ چکی تھی کی 1908ء میں انقلاب کے بعد نوجوان ترکوں نے حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی تھی انہوں نے سلطان کو مجبور کیا کہ وہ دستوری آئین بحال کریں اور خود حکومت سے دست بردار ہو جائیں۔ اپریل 1909ء میں سلطان کو معزول کر کے محمد خامس کو سلطان بنا دیا۔

اسی دوران 1911ء میں جنگ طرابلس اور پھر جنگ بلقان نے ترکی کے مضافات میں مزید کمی پیدا کر دی ان جنگوں کے نتیجہ میں بلغاریہ، سرویا، مونٹی نیگرو، اور بلقان کی ریاست کے سارے علاقہ سلنطت عثمانیہ سے نکل گئے جس سے ملک مزید کمزور تر ہوتا گیا۔ ملک میں اسی دوران ریاست کی عوام میں آزادی ملک اور خود مختار حکومت قائم کرنے کا جذبا پروان چڑھا تھا لہٰذا ان ممالک کو روکنا اور ان کے ساتھ ساتھ ترکی کے باقی بچے علاقوں کا تحفظ بڑا مسئلہ تھا۔ کیوں کہ اس نازک موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے روس، فرانس، برطانیہ کے ساتھ ساتھ سرویا اور بلغاریہ کی متحدہ ریاستیں بھی ترکی کے باقی ماندہ خطوں پر اپنا قبضہ جمانے کے لئے کھڑی تھیں۔ ایسی صورت میں ملک میں اسلامی خلافت کی بقاء سے زیادہ ملک کی آزادی اور یورپی ممالک کی بڑھتی ہوئی طاقت کا مقابلہ کرنے کے لئے خود کو تیار کرنے کی ضرورت پر زور دینا تھا۔ اس لئے ملک کے برسر آوردہ لوگ جن میں انور بے، مدحت پاشا، طلعت پاشا، امیر علی پاشا، محمود شوکت پاشا، مصطفیٰ کمال اور عصمت پاشا جیسے مدبرین شامل تھے نے ملک کی آزادی اور خلافت کے نظام کو ختم کر کے ایک سیکولر اور جمہوری نظام حکومت قائم کرنے پر زور دیا اور اس کے لئے وہ ساری کوششیں کیں جس سے ترک عوام میں قومیت اور جمہوریت کا تصور قائم ہو جائے اور ترکی ایک جمہوری اور آزاد ملک کی

حیثیت سے تسلیم کیا جائے۔

5.3 ترکی اور جنگ عظیم اول

جنگ عظیم اول جو 1914 سے شروع ہوئی اور 1918ء تک جاری رہی۔اس جنگ میں برطانیہ اور فرانس کے ساتھ روس کی شمولیت تھی تو دوسری طرف جرمنی اور سرویا تھے۔جرمنی کی شدید خواہش تھی کہ اس جنگ میں ترکی اس کا ساتھ دے اور اس کے پیچھے اس کے مفاد پنہا تھے جیسے پان اسلامزم اور پان ترانزم کی طرح پان جرمن ازم کو پان سلاوزم کے مقابلہ میں فروغ حاصل ہو جائے۔اور اس کے ساتھ ساتھ ترکی یہ رول ادا کرے کہ اتحادیوں کی طاقت یوروپ کے جنگی محاذ سے ہٹ جائے نیز مشرق کی جانب ترکی کی پیش قدمی جرمنی کے اثرات کی توسیع میں معاون ثابت ہو۔ترکی اس جنگ عظیم سے خود کو دور رکھنا چاہتا تھا اور اس کے مدبرین کی بھی یہی رائے تھی لیکن نوجوان ترک جن کے ہاتھوں میں زمام حکومت تھی وہ اس جنگ میں جرمنی کا ساتھ دیکر برطانیہ اور فرانس و روس کے خلاف محاذ کھول کر اپنی حیثیت کا لوہا منوانا چاہتے تھے۔مصطفیٰ کمال اور کئی مدبرین نے ملک کو اس جنگ سے دور رہنے کی صلاح دی کیونکہ ملک خود ہی اپنے اندرونی معاملات اور بلقانی ریاست سے جنگ میں الجھا ہوا تھا لیکن ان نوجوان ترکوں نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی اور وہ چند ذیلی مقاصد کے ساتھ اس جنگ عظیم میں شریک ہو گئے۔

1. دولت عثمانیہ میں شامل علاقوں کو ترکی تہذیب و تمدن میں ضم کیا جائے۔
2. مصر و قبرص ترکی کو واپس دئے جائیں۔
3. قفقاز اور ترکستان کو روس سے آزادی دلا کر ترکی میں شامل کیا جائے،
4. اسلامی دنیا پر خلیفہ کی حاکمیت کا احیاء کیا جائے۔

ان مقاصد کے ساتھ ترکی نے جرمنی کے ساتھ معاہدہ کیا، چونکہ ترکی بھی روس کے مقابلہ مین جرمنی کی حمایت چاہتا تھا اس لئے یہ اس کے لئے مناسب وقت تھا کہ وہ اس جنگ میں صرف جرمنی کی روس کے مقابلہ میں مدد کریگا اور اسے برطانیہ و فرانس سے کوئی غرض نہیں رہے گی۔لیکن ترکی کا غیر جانبدار رہنے کا یہ عمل زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکا کیونکہ برطانیہ نے ہی اس پر دھاوا بول دیا جس کی وجہ سے ترکی کو اپنے دفاع میں جنگ میں اترنا پڑا، جس سے اس کی غیر جانبدار رہنے کی حکمت عملی کامیاب نہ ہو سکی۔ترکی نے برطانیہ اور فرانس کو روس کی مدد سے روکنے کے لئے آبنائے باسفورس اور دردانیال کو بند کر دیا تھا جس کی وجہ سے اتحادی افواج روس کی مدد نہیں کر سکتی تھیں۔اسی لئے ان اتحادی فوجوں نے دردانیال پر حملہ کر کے اسے توڑ دینا چاہا لیکن مصطفیٰ کمال اور انکی ساتھیوں کی حکمت عملی سے وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔اسی طرح اتحادی قوت نے دوسرا حملہ گیلی پولی کے ساحل سے دردانیال کے قلعوں پر پشت سے کیا گیا لیکن یہاں بھی اتحادی افواج کو مصطفیٰ کمال کی غیر معمولی بہادری اور مستعدی کی وجہ سے منھ کی کھانی پڑی۔لیکن مشرقی محاذ پر ترکوں کو کافی نقصان اٹھانا پڑا غزہ، یروشلم، بیت المقدس، بیروت، دمشق، طرابلس، حمص، حلب، شام، لبنان، عراق، اور عرب کے تمام علاقے ترکوں کے قبضہ سے نکل چکے تھے۔

دوسری طرف کرنل لارنس نے شریف مکہ کو ترکوں کی بغاوت پر آمادہ کر کے حجاز کی ان کی حکومت قبول کر لی تھی، جس سے عرب قومیت کو فروغ ملا اور ترک عرب دشمنی کا بیج کامیابی کے ساتھ بویا گیا۔ جس سے ترکی کو مزید کمزور کر دیا اور عرب کے تمام مضافات دھیرے دھیرے اس کے ہاتھ سے نکل گئے تھے۔ ایسے نازک موقع پر جب کہ اس کے حلیفوں کی کمر ٹوٹ چکی تھی اور وہ اب اس جنگ سے پیچھے ہٹنے لگے تھے ترکی نے بھی غنیمت سمجھا کہ اتحادیوں سے صلح کر لے۔ چناچہ مدرس کے مقام پر 1918ء کو اتحادیوں اور عزت پاشا کی کابینہ کے درمیان صلح نامہ پر دستخت کئے گئے، جس کی رو سے اتحادی فوجوں نے قسطنطنیہ، سیلشیا اور چناق پر قبضہ کر لیا۔ ترکی اور اتحادی افواج کے درمیان یہ پہلا معاہدہ تھا لیکن ان اتحادی طاقتوں نے آپس میں متعدد خفیہ معاہدے کر رکھے تھے جن میں انہوں نے ترکی کے مضافات کے حصہ بکھرے کر کے اپنا پانا حصہ حاصل کرنے کے لئے کوششیں شروع کر دی تھیں۔ ان معاہدوں میں معاہدہ قسطنطنیہ جو کہ 18 مارچ 1915ء میں فرانس، روس اور برطانیہ کے درمیان ہوا تھا، دوسرا معاہدہ 26 اپریل 1915ء کو لندن میں منعقد ہوا جس میں مذکورہ بالا ممالک کے علاوہ اٹلی کو بھی شامل کیا گیا تھا تاکہ اٹلی جنگ عظیم میں اتحادیوں کا ساتھ دے اس لئے اسے جزائر ڈوڈی کینز پر مکمل خود مختاری دی گئی۔ اگلا معاہدہ سائیکس پیکو معاہدہ کے نام سے مشہور ہے جو 16 مئی 1916ء میں منعقد ہوا جس میں ترکی کے خطوں کی بندر بانٹ کی گئی۔ معاہدہ سینٹ زان دی مارین اٹلی کے مقبوضات پر مہر ثبت کرنے کے کے لئے منعقد کیا گیا تھا۔ ترکی اس جنگ عظیم میں اپنے حلیفوں کے ساتھ شکست کھوردہ تھا اور اتحادی فوجوں نے اس کے اندر گھس کر بڑے بڑے شہروں پر قبضہ کر لیا تھا۔ وہ ملک جو چند برس پہلے دنیاء کی عظیم ترین سلطنت کا مالک تھا چند سالوں میں پے در پے جنگوں کے سلسلہ میں پس کر لاغر ولاچار دہانے پر کھڑا تھا۔ ملک اتحادی فوجوں کے نرغے میں تھا اس نے جنگ عظیم میں شکست ضرور کھائی تھی لیکن غلامی کی زنجیروں کو پہننے کے لئے امادہ نہ تھا، ترکوں میں ملک کی آزادی اور خودمختاری کے لئے آواز بلند ہونے لگی تھی۔ جنگ کے کاتمہ کے بعد انور بے، جمال پاشا، طلعت پاشا اور دیگر اراکین انجمن اتحاد و ترقی ملک کو تباہی سے نہ بچا سکنے کے خوف سے جرمنی بھاگ گئے، سلطان محمد سادس کو نیا خلیفہ بنایا گیا اور فرید پاشا وزیر اعظم کے عہدے سے سرفراز ہوئے۔

5.4 سیکولر حکومت کا قیام

5.4.1 مصطفیٰ کمال پاشا: حیات وخدمات

مصطفیٰ کمال اتاترک جدید ترکیہ کے بانی اور معمار ہیں جنہوں نے ایک صدی قبل جمہوریہ ترکیہ کی بنیاد رکھی اور ترکی اس کے بعد سے انہی کے متعین کردہ خطوط پر پوری سختی کے ساتھ گامزن ہے۔ انہوں نے ایک طرف یورپی ملکوں بالخصوص یونان کا مقابلہ کرتے ہوئے ترکی کی داخلی خودمختاری کی حفاظت کی اور بیرونی حملہ آوروں کو نکال کر ترکی کی وحدت کا تحفظ کیا جبکہ دوسری طرف خلافت عثمانیہ کا خاتمہ کر کے ترکی کو عالم اسلام سے بھی الگ کر لیا۔ وہ ترک قوم پرستی کے علمبردار تھے اور انہوں نے اس بنیاد پر ترک قوم کو بیدار کرنے اور اس کے جداگانہ تشخص کو دنیا کے نقشے پر نمایاں کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا جس کی وجہ سے انہیں اتاترک کا خطاب ملا اور وہ تاریخ میں ترک قوم

کے ہیرو کی شکل اختیار کر گئے۔

مصطفیٰ کمال 1881ء میں سلونیکا میں پیدا ہوئے، 1886ء میں والد کا انتقال ہو گیا، اور تعلیم و تربیت کا دور والدہ اور ننھیال کی سرپرستی میں بسر کیا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد 1895ء میں ناستر کے فوجی کالج میں داخلہ لیا، 1899ء میں استنبول کے مدرسہ حربیہ میں اور 1902ء میں فوجی اکیڈمی میں داخل ہوئے۔ تعلیم و تربیت کے مراحل سے گزر کر 1905ء میں سیکنڈ لفٹیننٹ کے طور پر فوجی خدمات کا آغاز کر دیا۔

یہ سلطان عبد الحمید ثانی کی خلافت کا دور تھا جب یورپ کے صنعتی اور فکری و ثقافتی انقلاب سے متاثر ہو کر ترکی میں ترک قومیت کے رجحانات کے ساتھ ساتھ جمہوری طرز زندگی اختیار کرنے کا ذوق بھی ابھر رہا تھا۔ اور خلافت عثمانیہ کے نظام کو، جس نے سیاسی طور پر خاندانی بادشاہت کی حیثیت اختیار کر لی تھی، جمہوری اصولوں کے دائرہ میں لانے اور کسی باضابطہ دستور کا پابند بنانے کے لیے مختلف اطراف سے کوششیں ہو رہی تھیں۔ ان کوششوں میں ایسے افراد اور حلقے بھی شریک تھے جو خلوص دل سے یہ چاہتے تھے کہ خلافت کا نظام خاندانی بادشاہت کے دائرہ سے نکل کر ایک باضابطہ دستوری نظام کی حیثیت اختیار کر لے تاکہ وہ زیادہ استحکام اور اعتماد کے ساتھ عالم اسلام کی قیادت کر سکے۔ جبکہ ایسے افراد و گروہ بھی اس میں سرگرم تھے جو ان قومی رجحانات کی آڑ میں یورپ کے سیاسی فلسفہ و ثقافتی ڈھانچے کو مکمل طور پر ترکی میں کار فرما دیکھنے کے خواہشمند تھے۔ چنانچہ اس ماحول میں مصطفیٰ کمال نے فوجی خدمات کے آغاز میں ہی "جمعیۃ وطن و حریت" کے نام سے ایک خفیہ تنظیم قائم کر لی اور ہم خیال فوجی افسروں کے ساتھ رابطے شروع کر دیے۔ مصطفیٰ کمال کو اس مہم کی وجہ سے قید کر لیا گیا اور اس تنظیم پر پابندی لگا دی گئی۔ لیکن جلد ہی سلطان کے حامئین میں سے بہتوں نے مصطفیٰ کمال کے جوشیلے انداز و بہادری کے کارناموں سے فائدہ اٹھانے کے لئے انہیں دمشق کے بلوائیوں کی سرکوبی کے لئے منتخب کر کے رہا کر دیا گیا۔

مصطفیٰ کمال نے دمشق میں اپنی فوجی صلاحیت کا نظارہ پیش کیا بہت جلد ہی وہ اپنے مشن میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن طبیعت میں انقلاب پسندی اور وطن پرستی نے انہیں دمشق میں بھی سکون سے نہ بیٹھنے دیا اور مصطفیٰ نے دمشق میں جمیعۃ وطن و حریت کی ایک شاخ قائم کر کے کام کرنا شروع کر دیا۔ اور چند ماہ کی محنت سے پورا کا پورا شام انقلاب پسند ہو گیا۔ مصطفیٰ کمال کی ان سرگرمیوں کا علم سلطان کو ہوا تو انہیں سالونیکا بھیج دیا گیا۔ جہاں قوم کے دیگر لیڈران نے انجمن اتحاد و ترقی کے نام سے ایک نئ تنظیم قائم کر لی تھی جس میں انور بے، جمال پاشا، نیازی بے، طلعت پاشا، وغیرہ شامل تھے۔ مصطفیٰ کمال نے اس تحریک میں شمولیت کی لیکن ان کے ہم خیال ساتھیوں سے تصادم کی وجہ سے جلد ہی وہ اس سے الگ ہو گئے دراصل اس تحریک کے مقاصد بین الاقوامی نوعیت کے حامل تھے جب کہ مصطفیٰ کمال کو صرف ملک کے حالات سے دلچسپی تھی۔ انجمن اتحاد و ترقی کے زیر اثر عوام نے انقلاب کا پرچم بلند کیا اور جلد ہی سلطان کو مجبور ہو کر اپنی حکمت عملی اور طرز حکومت بدلنا پڑا انور بے، جمال پاشا، طلعت پاشا اور جاوید پاشا کو وزارت کے عہدے سے سرفراز کیا گیا انقلابیوں کی دلجوئی کی گئی، لیکن ملک کو ایک ایسے مدبر کی ضرورت تھی جو مستقبل میں حکومت کی باگ ڈور سنبھال سکے اور موجودہ حالات کا بخوبی مقابلہ کر سکے۔ اسی تگ و دو میں اتحاد و ترقی کے لیڈران میں تصادم رونما ہوا اور نیازی بے کو جان گوانی پڑی۔ کسی طرح انور بے نے اس حالات کو سنبھالا اور ملک کو صحیح سمت عطاء

کیا۔ مصطفیٰ کمال ان سارے معاملات سے دور ایک فوجی کی حیثیت سے ملک کے حالات کا جائزہ لے رہے تھے۔ یہ دور تھا جب ترکی پر متعدد اطراف سے حملے ہو رہے تھے اور ملک ان حالات سے دو چار تھا، ایسے میں مصطفیٰ کمال نے صرف ملک کی آزادی کے خاطر اپنی پوری صلاحیتیں صرف کیں، ٹریپولی مانٹی نیگرو، یونان اور بلگاریہ وغیرہ سے جنگوں میں اپنے کارنامہ دیکھائے اور ملک کو اس صورتحال سے نجات دلانے مین بڑا کلیدی کردار اداء کیا۔

پہلی عالمی جنگ میں خلافت عثمانیہ نے جرمنی کا ساتھ دیا تھا اس لیے جرمنی کی شکست کے اثرات اس پر بھی پڑے اور یورپی قوتوں نے شکست خوردہ ممالک کے حصے بخرے کیے تو اسی بندر بانٹ میں استنبول پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس وقت کے عثمانی خلیفہ سلطان عبدالوحید تھے، مصطفیٰ کمال نے قابض متحدہ فوجوں کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا اور یورپی ملکوں سے مطالبہ کیا کہ ان کی فوجیں ترکی کی حدود سے باہر نکل جائیں اور ترکی کی خود مختاری اور وحدت و آزادی کو تسلیم کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے مصطفیٰ کمال نے یونان کے ساتھ دوبدو جنگ بھی لڑی اور اس مہارت کے ساتھ ترک فوجوں کی کمان کی کہ یونانی فوج کو پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ یوں مصطفیٰ کمال اتاترک قوم کے نجات دہندہ اور آزادی کی علامت کے طور پر ترک قوم کے ہیرو بن گئے۔ پہلی عالمی جنگ کے دوران مصطفیٰ کمال کی فوجی خدمات نے انہیں ملک کا ہیرو بنا دیا تھا اب انہیں پاشا کا لقب مل گیا تھا، لیکن ملک کو ابھی سکون میسر نہیں ہوا تھا جنگ عظیم کے بعد ملک پر اتحادی افواج کا قبضہ تھا، ایسے نازک حالات میں مصطفیٰ کمال نے شکست نہ مانی، انور بے، جمال پاشا، طلعت پاشا سبھی ملک چھوڑ کر بھاگ گئے تھے صرف مصطفیٰ کمال ہی تھے جنہیں ملک کی آزادی اور ترکی کو غیر ملکیوں سے بچانے کے اپنے حتمی ارادے کے ساتھ ملک میں فوج جمع کر رہے تھے جبکہ ترکی کے مضافات پر برطانیہ، فرانس، اور دیگر اتحادی اقوام کا قبضہ ہو چکا تھا۔ قسطنطنیہ پر قبضہ ہو چکا تھا، استنبول پر فرانسیسی قابض تھے، مصر، شام، فلسطین، عرب ممالک کو سلطنت عثمانیہ سے الگ کر لیا گیا تھا۔ ترکی اندرونی اعتبار سے بھی دشمنوں سے گھرا ہوا تھا، لیکن مصطفیٰ کمال کے عزم واستقلال میں کوئی کمی نہ آئی۔

5.4.2 مصطفیٰ کمال اور جنگ آزادی

ترکی میں جنگ عظیم کے فوراً بعد جنگ آزادی کا جو بگل بجا اس کی اصل وجہ یونانیوں کے ذریعہ سمرنا میں کی گئی سرکشی تھی۔ یونان نے اتحادیوں کو ورغلا کر سمرنا کا خطہ اپنے مقبوضات میں شامل کرا لیا تھا جس پر اٹلی کا حق تھا۔ یونانیوں نے سمرنا پر اپنی جارحیت کا آغاز کر دیا اور ترک عوام کو بے دریغ قتل کیا گیا۔ ترک حکومت اتحادیوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنی ہوئی تھی اس لئے اس نے اپنی تمام فوج کو ملک کے دیگر مقامات میں منتشر کر دیا، تاکہ وہ سمرنا میں یونان اور اس کے اتحادیوں کے خلاف کوئی کاروائی نہ کر سکیں۔ مگر ترک عوام کے جذبات اس حملہ سے مشتعل ہو گئے اور انہوں نے کسی کی پرواہ کئے بغیر یونانیوں کے حملوں کا جواب دینا شروع کیا ان کی فوج کسان، پہاڑی لوگ اور عورتوں پر مشتمل تھی۔ ان کسانوں کی بہادری دیکھ کر ملک کے بہت سے فوجی افسران نے اپنے چھوٹے چھوٹے فوجی دستے تیار کئے اور ان کے ذریعہ مزاحمت شروع کی۔ ان رضاکارانہ امداد نے یونانیوں کے لئے آگے بڑھنے کے سارے راستہ بند کر دئے تھے، ان حالات سے نجات کے لئے اتحادی فوج نے سلطان سے درخواست کی کہ وہ ان رضاکار مزاحمتوں کا کوئی بندوبست کریں اور خود ہی انہوں نے مصطفیٰ کمال کا نام بھی پیش

کیا کہ انہیں جنرل ملٹری انسپکٹر بنا کر مشرقی اناطولیہ بھیج دیا جائے تاکہ وہ ان فوجوں کو منتشر کرنے کی ذمہ داری ادا کریں، جس پر ان کو بعد میں افسوس کرنا پڑا۔ مصطفیٰ کمال نے اناطولیہ پہنچ کر فوج کو اپنے اعتماد میں لے لیا اور جب سلطان کی طرف سے انکی برطرفی کا حکم پہنچا تو انہوں نے حکم کی تعمیل کرنے سے منع کر دیا۔ مصطفی کمال نے ان عوام پر مبنی طاقت کو یکجا کر کے ان کی جسمانی طاقت کو بروئے کار لانا شروع کیا جس کے مفید نتیجہ برامد ہوئے۔ مصطفی کمال یہ بھی جانتے تھے کہ مختلف عوامی گروہوں کی گوریلا جنگ کی تنظیم و تربیت اس وقت تک کارآمد نہیں ہو سکتی جب تک کہ اتحاد و ترقی کے اراکین کے روپوش ہونے سے پید اخلاء کو پر نہ کیا جائے۔ قوم کو متحد کرنا، سبھی کو ایک خیال اور مرکزیت عطاء کرنا نہایت ضروری امر تھا، تبھی جدجہد آزادی کامیابی سے ہمکنار ہو سکتی تھی۔ انہوں نے اس موقع کا خوب فائدہ اٹھاتے ہوئے دو جلسہ منعقد کئے جس میں ترکی عوام کے مفاد کو سامنے رکھتے ہوئے یہ طے کیا گیا کہ ترکی کا کوئی خطہ بھی غیر ملک کے قبضہ میں نہیں رہنے دیا جائے گا، ترکی کی سرحدوں کی زمہداری کی جائے گی، قومی مسائل کا فیصلہ کرنے کے لئے ایک قومی مجلس کا قیام عمل میں لایا جائے اور ایک قومی معاہدہ مرتب کیا جائے۔ اور مشرقی اناطولیہ کو سلطان کی حکومت سے علیحدہ کر دیا گیا۔

5.4.3 جمہوری حکومت کا قیام

مصطفیٰ کمال نے انقرہ کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا اور نومنتخب پارلیمنٹ کا پہلا اجلاس 23اپریل 1920ء کو دستور ساز اسمبلی کی حیثیت سے شروع ہوا جسے مجلس ملی کبیر کی حیثیت سے جاناجاتا ہے۔ اسی مجلس نے مصطفیٰ کمال کو صدر منتخب کیا اور نئ حکومت کا عارضی دستور مرتب کیا جانے لگا۔ اسمبلی ہی سے حکومت کے اراکین چنے گئے۔ اس طرح اس مجلس ملی کبیر کی حیثیت ایک عارضی انقلابی حکومت کی ہو گئی۔ مصطفیٰ کمال نے اناطولیہ میں ملک کے باغیوں اور انقلاب پسندوں کو جمع کر کے ایک منظم فوج قائم کی جس نے ایک طرف سلطان کی فوج کو شکست سے دوچار کیا تو دوسری طرف اٹلی اور یونانیوں کے ہزیمت دی نیز انگریزوں کو زیر کیا۔ انہوں نے اس بات کا عزم کر لیا تھا کہ ترکی میں ایک ایسی حکومت قائم ہو جو سراپا جدید رنگ مین ڈوبی ہوئی، غیر ملکی اثرات سے پاک جمہوری انداز و طرز کو اختیار کرے، جس کا صرف اور صرف مقصد اناطولیہ کو ترکوں کی فلاح و بہبود کے علاوہ کچھ نہ ہو۔ ایسے حالات میں انہیں روس کی باشویک تحریک سے بڑی مدد ملی جو کہ چند سال پہلے ہی وجود میں آئی تھی جس کا نصب العین بھی تقریباوہی تھا جو مصطفیٰ کمال کا تھا یعنی ملک کو دیرینہ اور ناکارہ نظام حکومت سے اور دوسری طرف بیرونی طاقتوں سے نجات دلانا۔ کمال پاشا نے دو سال کی مختصر سی مدت میں اپنی عارضی حکومت کے تحت یونانیوں اور پھر اتحادیوں سے جنگ کر کے انہیں اپنے ملک سے باہر نکال دیا تھا، اس دوران نومبر 1922ء میں ترکی کے بارے میں فیصلہ کرنے کے لیے یورپی ملکوں کی کانفرنس ہوئی جس میں مصطفیٰ کمال اتاترک کی طرف سے عصمت اینونو نے شرکت کی۔ اس کانفرنس میں برطانوی وفد کے لیڈر لارڈ کرزن نے ترکی کی آزادی اور خود مختاری کو تسلیم کرنے کے لیے چار شرائط پیش کیں۔

1. خلافت کے نظام کو مکمل طور پر ختم کیا جائے۔
2. خلیفہ کو ملک بدر کر دیا جائے۔
3. خلیفہ کے تمام اموال قومی تحویل میں لیے جائیں۔

4. ترکی کے سیکولر ریاست ہونے کا اعلان کیا جائے۔

اس وقت عصمت اینونو ان شرائط کو تسلیم کیے بغیر کانفرنس سے واپس آ گئے۔ مگر بعد میں ترکی کی نئی قومی لیڈر شپ نے ان تمام شرائط کو تسلیم کر لیا اور جولائی 1923ء کو اتحادیوں اور انقرہ کی حکومت کے درمیان صلح نامہ لوزان طے ہوا جس کی رو سے حکومت انقرہ کو ترکی کی جائز حکومت تسلیم کیا گیا۔ اس طرح ترکی میں ایک دستوری وجمہوری حکومت کی بنیاد پڑی جس کے بانی مصطفیٰ کمال اتاترک تھے۔

5.4.4 مصطفیٰ کمال کی اصلاحات

مصطفیٰ کمال نے تین مارچ 1924ء کو خلافت کا نظام ختم کر کے خلیفہ کے خاندان کو جلاوطن کر دیا اور جمہوریہ ترکیہ کے قیام کا اعلان کر کے اسے سیکولر ریاست بنانے کے لیے جو اہم اقدامات کیے گئے وہ درج ذیل ہیں:

1. دستور سے سرکاری مذہب اسلام کی شق خارج کر دی گئی۔
2. ملک بھر میں دینی مدارس اور خانقاہوں پر پابندی لگا کر مذہبی تعلیم کو ممنوع قرار دے دیا گیا۔
3. عورتوں کو تمام معاملات میں مردوں کے مساوی قرار دے کر پردہ کو قانوناً جرم قرار دے دیا گیا۔
4. یورپی لباس پہننا اور ننگے سر رہنا ضروری قرار دے دیا گیا۔
5. پیری مریدی ممنوع قرار دی گئی اور مزاروں پر جانے اور دعائیں مانگنے پر پابندی لگا دی گئی۔
6. ہجری تقویم ختم کر کے شمسی کیلنڈر رائج کر دیا گیا۔
7. جمعہ کی چھٹی ختم کر کے اتوار کی چھٹی کا اعلان کیا گیا۔
8. عربی زبان میں قرآن کریم کی اشاعت پر پابندی لگا دی گئی اور ترکی زبان کا عربی رسم الخط منسوخ کر کے رومن رسم الخط اختیار کر لیا گیا۔
9. نماز، دعا اور قرآن کریم کی تلاوت ترکی زبان میں لازمی قرار دے دی گئی۔

مصطفیٰ کمال اتاترک نے پیپلز پارٹی کے نام سے سیاسی جماعت 1923ء میں قائم کر لی تھی جس کے ذریعے وہ اقتدار میں آئے اور 29 اکتوبر 1923ء کو جمہوریہ ترکیہ کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔ انہوں نے جدید ترکی کے راہنما اور حکمران کی حیثیت سے پندرہ برس تک آمرانہ طرز کی حکومت کی اور 10 نومبر 1938ء کو اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔

5.4.5 سیکولر اصلاحات

اتاترک کی قیادت میں، ترکی نے متعدد اہم سیکولر اصلاحات کیں، جنہوں نے ملک کی سماجی، سیاسی، اور قانونی ساخت کو بنیادی طور پر تبدیل کیا، یہ اصلاحات کمالزم کے طور پر مشہور ہیں جن کی بنیاد کمال پاشا کی چھ نکات پر مبنی ہے۔

1. جمہوریت
2. قومیت

3. عوامیت

4. مداخلت

5. لادینیت

6. انقلابیت

انقرہ کے قومی معائدہ، آئین اور مصطفیٰ کمال کے ان چھ نکات نے ترکی اقوام کے لئے زندگی گزارنے اور قانونی و نظریاتی معاملات کو برتنے کے لئے ایک اساس فراہم کر دیا تھا۔ انہیں نکات کو بنیاد بنا کر اصلاحات کی گئیں۔ جن کا مقصد یہ تھا کہ ترکی عوام کو قدیم ایشیائی، عربی تہذیب و تمدن کے دائرے سے نکال کر مغربی رنگ میں ڈھال دیا جائے۔ جس کے لئے سب سے پہلے خلافت کا خاتمہ کیا گیا اور دارالحکومت کو قسطنطنیہ سے بدل کر انقرہ کر دیا گیا۔ شرعی اداروں محکموں اور قوانین شریعت کو منسوخ کر کے سوئزرلینڈ کا قانون دیوانی، اٹلی کا قانون فوجداری، جرمنی کا قانون بین الاقوامی تجارت نافذ کیا گیا۔ خانقاہوں کو بند کر دیا گیا اور ساتھ ہی تصوف کے سلسلے بھی بند کر دئے گئے۔ تعدد ازدواج پر پابندی لگا دی گئی، ہجری کیلنڈر کی جگہ شمسی کیلنڈر اختیار کیا گیا، عورتوں کے پردے کو خلاف قانون قرار دیا گیا۔ ترکی ٹوپی کی ممانعت ہوگئی۔ نکاح اور طلاق سے متعلق اسلامی قانون کو منسوخ کر کے مغربی قوانین نافذ کئے گئے۔ عربی زبان میں اذان اور تکبیر خلاف قانون قرار پائے۔

5.4.6 تعلیمی اصلاحات

تعلیمی نظام کی تجدید: مصطفیٰ کمال کے نظریہ مغربیت اور جمہوری اصلاحات کی تشہیر میں سب سے زیادہ اہم کردار تعلیمی نظام کی تبدیلی نے ادا کیا۔ دراصل مصطفیٰ کمال نے گاؤں گاؤں میں تعلیم کا نظام متعارف کرایا اور وہاں پڑھانے کے لئے اساتذہ کا تقرر کیا جو کہ زیادہ تر ملی قومی پارٹی کے رکن ہوا کرتے تھے، وہ طلباء میں جدید فکر اور مغربی طرز معاشرت کی افادیت کا احساس پیدا کرتے تھے۔ جس کے لئے عام تعلیم سے مذہبی اثرات کو ختم کر کے جدید تعلیمی نظام کا ارتقاء عمل میں لایا گیا۔ مذہبی مدارس کے بجائے جدید تعلیمی ادارے قائم کیے گئے۔ سائنسی اور سماجی علوم کو نصاب میں شامل کیا گیا اور مذہبی تعلیم کو سیکولر تعلیم سے الگ کر دیا گیا۔

بنیادی اور ثانوی تعلیم: حکومت نے عوامی تعلیم کو فروغ دیا اور لازمی تعلیمی قوانین نافذ کیے 7 سال سے لیکر 12 سال تک مفت تعلیم کا نظام قائم کیا گیا، جس سے تعلیمی معیار میں بہتری آئی اور تعلیمی مواقع میں اضافہ ہوا۔ تجارت، جنگلات اور کامرس سے متعلق اسکول قائم کئے گئے۔ اسی طرح استنبول یونیورسٹی کی بنیاد پڑی۔

رسم الخط کی تبدیلی: تعلیم کو بہتر بنانے کے لئے رسم الخط میں تبدیلی عمل میں لائی گئی۔ جس سے عثمانی عوام زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کر سکے، چونکہ قدیم عربی و ایرانی رسم الخط میں مشکلات کی وجہ سے ترک زیادہ تر تعلیم سے محروم ہی رہتے تھے اور یہ رسم الخط اسلامی شناخت اور عربی تہذیب کی باقیات میں سے تھی اس لئے اس نئی جمہوری حکومت نے اس شناخت کو ختم کرنے اور ترک عوام کو مغربی تہذیب و معاشرت سے زیادہ بآور کرانے کے لئے اس کی تبدیلی کی۔

1. قانونی اصلاحات

عصری قوانین کا نفاذ: ترک جمہوریہ نے سیکولر حکومت کے نفاذ کے ساتھ ہی اصلاحات کے نام پر جو تبدیلیاں کیں ہیں ان میں قانونی نظام میں تبدیلی بھی ایک اہم جز ہے۔ اس سلسلہ میں ترکوں کی فلاح و بہبود کے لئے اسلامی قوانین کی جگہ جدید قانونی نظام کو اپنایا گیا، جیسے کہ ترک مدنی کوڈ، جو سوئزرلینڈ کے مدنی قانون سے متاثر تھا۔ شرعی اداروں محکموں اور قوانین شریعت کو منسوخ کر کے سوئزرلینڈ کا قانون دیوانی، اٹلی کا قانون فوجداری، جرمنی کا قانون بین الاقوامی تجارت نافذ کیا گیا۔ عدلیہ کی آزادی کو یقینی بنانے کے لیے اصلاحات کی گئیں، جس سے قانون کی حکمرانی کو فروغ ملا۔ لیکن ساتھ ہی میں شیخ الاسلام کا سب سے بڑا عہدہ بھی ختم کر دیا گیا۔ عربی زبان میں اذان اور نماز پڑھنے پر پابندی عائد کی گئی۔

2. سماجی اصلاحات

خواتین کے حقوق: عثمانی معاشرتی نظام اسلامی نظام پر مبنی تھا، مذہبی شناخت کو ہر جگہ اہمیت حاصل تھی، جبکہ مصطفیٰ کمال کے دور حکومت میں اس میں بڑی تبدیلیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ انہوں نے عورتوں کے اسکارف کو ترقی اور مساوات کا مخالف سمجھ کر پابندی عائد کر دی۔ خواتین کو ووٹ کا حق دیا گیا اور انہیں تعلیمی اور پیشہ ورانہ مواقع فراہم کیے گئے۔ جدید دور کے لباس اور سماجی رسوم و رواج کو فروغ دیا گیا۔

مذہبی علامات پر پابندی: عوامی مقامات پر مذہبی علامات کی جگہ سیکولر علامات کو اپنایا گیا، اور اسلامی قوانین کو عوامی زندگی سے الگ کیا گیا۔ ترکی ٹوپی لگانے، اسلامی شناخت کو اختیار کرنے اور عربی تہذیب کی کسی چیز کو اختیار کرنے کو جرم قرار دیا گیا۔

3. اقتصادی اصلاحات

صنعتی ترقی: مصطفیٰ کمال اتاترک کی اس نئی حکومت نے ترکی میں صنعتی ترقی کو فروغ دینے کے لیے مختلف منصوبے شروع کیے، جن میں بنیادی ڈھانچے کی ترقی اور مقامی صنعتوں کی حمایت شامل تھی۔ انہوں نے کسانوں پر پڑنے والے ٹیکس میں کمی کی، نیز بلقانی ریاست میں جہاں سب سے زیادہ زرعی زمینیں تھیں کسانوں کی بڑی تعداد کو آباد کیا تاکہ ان سے کاشتکاری کو فروغ ملے اور ملک کی اقتصادی حالت بہتر ہو۔ تجارت کے نئے قوانین بنائے گئے جس سے ملک میں تجارت کو آسان بنا جا سکے۔

زرعی اصلاحات: زرعی زمین کی تقسیم اور جدید زرعی تکنیکوں کا نفاذ کیا گیا تاکہ دیہی علاقوں کی معیشت کو مستحکم کیا جا سکے۔ مغربی اصولوں کو بروکار لاتے ہوئے زرعی اصلاحات کی گئیں جن سے ملک میں زرعی پیداوار میں اضافہ کیا جا سکے مزید کسانوں اور ان سے جڑی ضرورتوں کو پورا کرنے کے مناسب حل تلاش کئے گئے۔

5.5 عصمت اینونو

مصطفیٰ کمال پاشا کے انتقال کے بعد 1938ء میں عصمت اینونو ترکی کے دوسرے صدر کی حیثیت سے ملک کی ذمہ داری کی باگ

ڈور سنبھالی۔ عصمت اینونو مصطفیٰ کمال کے معتمد خاص تھے۔ ازمیر (سمرنا) میں 1880ء میں پیدا ہوئے اور مدرسہ حربیہ سے فراغت کے بعد 1907ء میں فوج میں کپتان کے عہدے پر فائز ہوئے۔ 1911ء میں اٹلی کے خلاف جنگ میں عصمت اینونو، انور پاشا کے ساتھ رہے۔ عالمی جنگ میں قفقاز، فلسطین اور شام کے جنگی محاذوں پر اپنی خدمات انجام دی۔ پھر جنگ آزادی میں بھی آپ نے برابر شرکت کی اور مصطفیٰ کمال کے دست و بازو کی حیثیت سے ملک کو جبر واستبداد سے نجات دلانے کے لئے بھرپور ساتھ دیا۔ لوزان کانفرنس میں ترکی وفد کی قیادت کی۔ اسی لئے جب مصطفیٰ کمال ترکی کے صدر بنے تو عصمت اینونو کو وزیر اعظم کے عہدے سے سرفراز کیا۔ چودہ سال تک اس عہدے پر فائز رہے اور پھر مصطفیٰ کمال کے انتقال کے بعد 1938ء میں ترکی دوسرے صدر بنے اور 1950ء تک اس عہدے کے فرائض انجام دئے۔ فوجی انقلاب کے بعد دوبارہ وزیر اعظم کی ذمہ داری ادا کی۔ نیز دس سالوں تک حزب اختلاف کی نمائندگی کرتے رہے اور 1974ء کو انقرہ میں اس دار فانی کو خیر آباد کہا۔ اس بارہ سالہ دور حکومت میں اینونو نے کئی اہم کارنامے انجام دئے ہیں جن میں مصطفیٰ کمال کے ذریعہ جلاوطن کئے گئے قومی رہنماؤں کی ترکی میں واپسی اہمیت کی حامل ہے۔ عصمت اینونو کی خارجہ پالیسی ہمیشہ مسلمانوں کی طرف سے مزمت کا شکار رہی اس کی وجہ 1948ء میں فلسطینی مقبوضات پر قابض اسرائیل کی یہودی مملکت کو ترکی کے ذریعہ تسلیم کیا جانا ہے۔

عصمت اینونو کے دور کا ایک اور اہم کارنامہ ملک میں ایک سیاسی جماعت کا نظم جسے مصطفیٰ کمال اتاترک نے قائم کیا تھا کا خاتمہ کر کے مختلف سیاسی جماعتوں کو فروغ دینا ہے جو کہ جمہوریت کے نفاذ میں بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ اسی بناء پر ڈیموکریٹک پارٹی کا وجود عمل میں آیا جو اس وقت کی مقبول ترین سیاسی جماعت میں سے ایک تھی۔ اس وقت ترکی میں ملت پارٹی، ڈیموکریٹک پارٹی، اور برسر اقتدار ریپبلکن پیپلز پارٹی، سیاست میں برسرپیکار تھیں۔ لیکن جمہوری پارٹی کا اثر عوام پر دن بہ دن بڑھتا جارہا تھا5 اس کی خاص وجہ اس سیاسی جماعت کے رہنماؤں نے عوام کو مذہبی آزادی دلانے کا وعدہ کیا تھا اور دوسری وجہ صنعتی اداروں کو قومی ملکیت کی بجائے نجی ملکیت مین چلانے کی اجازت کی حمایت تھی۔

5.6 جلال بایار کا دور حکومت

1950ء کے انتخابات میں جمہوری پارٹی نے زبردست کامیابی حاصل کی اور جلال بایار صدر اور عدنان مندریس وزیر اعظم منتخب ہوئے۔ جلال بایار پہلے مصطفیٰ کمال کے ساتھ قومی تحریک میں شامل تھے انہوں نے لوزان کانفرنس میں ترکی وفد کے مشیر کی حیثیت سے شرکت کی۔ 1923ء میں ازمیر سے مجلس کبیر ملی کے رکن منتخب ہوئے۔ عصمت اینونو سے اختلاف کی وجہ سے عدنان مندریس کے ساتھ مل کر جمہوری پارٹی کی بنیاد ڈالی اور 1950ء کو ترکی کے صدر منتخب ہوئے اور 1961ء تک اس عہدے کی ذمہ داریاں ادا کرتے رہے۔ ساتھ ہی عدنان مندریس نے وزیر اعظم کی ذمہ داری ادا کی۔

جمہوری پارٹی کی حکومت سے ترکی میں ایک انقلابی دور کا آغاز ہوا جسے سفید انقلاب کہا جاتا ہے۔ جس میں جمہوریت بحال ہوئی اور عوام میں خوش حالی آئی، نیز اسلامی شعائر پر لگی پابندیاں ختم ہو گئیں۔ اس سلسلہ میں عدنان مندریس کی خدمات نہایت اہم اور نمایاں ہیں اسی

وجہ سے انہیں ترکی جمہوریت کا اصل معمار مانا جاتا ہے۔ عدنان مندریس کا ایک اور اہم کارنامہ محکمہ امور مذہبی کا قیام ہے جس نے اسلامی علوم کی توسیع واشاعت اور عوام میں اسلامی روح پیدا کرنے میں اہم کردار اداء کیا۔

5.7 حزب عدالت پارٹی

ترکی میں 1961ء کی فوجی انقلاب کے بعد ایک مخلوط حکومت قائم ہوئی جس میں حزب عدالت پارٹی کی نمایاں کارکردگی شامل تھی۔ آگے چل کر اس جماعت نے 1965ء میں دوبارہ انتخابات میں حصہ لیا اور کثیر نشستیں حاصل کیں اور انتخابات میں کامیابی حاصل کی نیز اس جماعت کو سعید نورسی اور طلبہ کی سرپرستی حاصل تھی جس کی وجہ سے یہ پارٹی عوام میں مقبول تھی۔ اس کی مقبولیت کی ایک وجہ صدر اعظم دیمیرل کی حکومتی پالیساں تھیں، جس نے ترک عوام میں جمہوریت اور آزادی مذہب کا مستند نقشہ کھینچ دیا تھا۔

5.8 ملی سلامت پارٹی

1973ء کے انتخابات میں نجم الدین اربکان کی ملی سلامت پارٹی نے ترکی سیاست میں قدم رکھا۔ اس انتخاب میں ملی سلامت پارٹی نے 48 نشستیں حاصل کر تیسری بڑی پارلیمانی پارٹی کا درجہ حاصل کر لیا۔ اور نجم الدین اربکان اس میں نائب وزیر اعظم مقرر ہوئے، پھر 1975ء میں سلیمان دیمیریل کی نئی حکومت میں بھی آپ ہی وزیر اعظم کے عہدے پر فائز رہے۔ ترکی کی سیاست میں ابھی تک جن پارٹیوں کو اقتدار حاصل ہوا تھا ان میں سے ہر کسی نے اپنے شعور اور فہم کے مطابق مذہب اور جمہوریت کے نفاذ میں دلچسپی لی تھی لیکن ملی سلامت پارٹی اور نجم الدین اربکان دونوں کو پچھلی تمام جماعتوں پر یہ فوقیت حاصل ہے کہ انہوں نے زیادہ واضح انداز میں مذہب اور سیکولرزم کے درمیان تطبیق دی اور اس کے نفاذ میں اہم کردار اداء کیا۔ ملی سلامت پارٹی کا منشور یہ تھا کہ ملک کی مادی و معاشی ترقی سے پہلے اخلاقی ارتقاء اور مذہبی احیاء ناگزیر ہے، نجی ملکیت، ترکی معاشرہ کی تاریخ و اقتدار کے تحفظ اور بنیادی انسانی حقوق اور آزادی کی حفاظت پر زور دیا گیا۔ ملک کے لئے صدارتی طرز حکومت کو بہتر مانا گیا۔ ان تمام اصولوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اس پارٹی نے مخلوط حکومت میں اپنی خدمات انجام دیں اور 1975ء سے لیکر 1977ء تک نجم الدین اربکان وزیر اعظم اور نائب وزیر اعظم کے عہدے پر فائز رہے۔ اسی دوران 1977ء کے انتخاب میں بھی یہی شکل باقی رہی البتہ پارٹی کے منتخب امیدواروں کی گنتی میں کمی واقع ہوئی۔

5.9 نیا دستور اور سیاسی پارٹیاں

1980ء میں ایک بار پھر فوجی بغاوت ہوئی جس میں جنرل کنعان ایورن نے سیاسی نظام کا خاتمہ کر کے اقتدار سنبھالا نیز سیاسی جماعتوں پر پابندی لگادی اور نجم الدین اربکان کو سیاسی مقاصد کے لئے اسلام کو استعمال کرنے کے جرم میں قید میں ڈال دیا گیا۔ اس کے علاوہ ترکی عوام کے بہتر مستقبل کے لئے نیا دستور پیش کیا گیا۔ جس کی منظوری عوامی بحث کے بعد ریفرینڈم کے ذریعہ دی گئی اور دستور کی حمایت میں 91 فیصد ووٹ پڑے۔ اس ریفرینڈم کے تحت جنرل کنعان ایورن نئے صدر منتخب ہوئے۔ اس نئے دستور میں صدارتی اختیارات کو بہت

زیادہ وسیع کر دیا گیا تھا اسے عدالتی، قانونی اور انتظامی اختیارات حاصل ہو گئے تھے جو کہ اس سے پہلے کے دستوروں میں نہیں تھے۔ اس نئے دستور کا مقصد با اختیار اور مستحکم حکومت کا قیام تھا جس سے ملک میں امن اور قانون کی بحالی پر قابو پایا جا سکے۔ اسی سلسہ میں ملک میں نئی سیاسی جماعتوں کی تشکیل عمل میں آئی، جنرل کنعان کے مطابق ملک میں قائم سیاسی جماعتوں پر پابندی کے خاتمہ کے بعد سیاسی جماعتیں قائم ہو نگی لیکن وہ موجودہ صورت میں باقی نہ رہ سکیں گی۔ اس لئے 1983ء میں پابندی ختم ہونے کے بعد ملک میں 15 نئی سیاسی جماعتوں کا وجود عمل میں آیا۔ جن مین نیشلسٹ ڈیموکریٹک پارٹی، پاپولسٹ پارٹی، مدر لینڈ پارٹی، ٹروپاتھ پارٹی، سوشل ڈیموکریٹک پارٹی، رفاہ پارٹی، وغیرہ شامل تھیں۔ 1983ء میں عام انتخابات منعقد ہوئے جس میں مدر لینڈ پارٹی نے اکثریت حاصل کی۔ اسی طرح 1987ء میں بھی مدر لینڈ پارٹی کو ہی اکثریت حاصل رہی تھی اور ترگت اوزال ملک کے صدر منتخب ہوئے۔ 1994ء کے بلدیاتی انتخابات میں نجم الدین اربکان کی رفاہ پارٹی کو بڑی کامیابی ملی۔ چونکہ اس پارٹی کا نصب العین مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی بحالی تھا اس لئے ملک میں اس نے اپنی جڑیں مضبوط کر لی تھیں۔ اس نے ترکی میں بڑی تعداد میں صنعتوں کی ترقی کرنے کا اعلان کیا تھا جس سے ترکی اپنے افرادی وسائل اور صلاحیتوں کا صحیح استعمال کر سکیں۔ اس نے اپنے منشور میں انصاف پر مبنی ایسے معاشی نظام قائم کرنے کی بات کی جس میں سود کو دخل نہ ہو گا اور کسی فرد واحد پر ٹیکس کی ادائیگی واجب نہ ہو گی۔ ان اعلانات کے ساتھ رفاہ پارٹی نے 1995ء کے پارلیمانی انتخابات میں حصہ لیا۔ ترگت اوزال کی ناگہانی موت کے بعد سلیمان دیمریل ملک کے صدر بنے انہوں نے رفاہ پارٹی کی کامیابیوں کو کم کرنے کے لئے ملک کے اسلام پسند طبقہ پر "سیکولر اسلام" کا ایسا تصور پیش کرنا چاہا جس سے ان کی سیاسی بساط باقی رہے اور ترک عوام رفاہ پارٹی کے احیائے اسلامی پروگرام سے انحراف کیا جائے۔ اس سلسلہ میں "حقیقت اسلام" کے نام سے ایک کتاب شائع کی گئی جس میں مختلف مذاہب و مکاتب فکر اور فرقوں کے درمیان جنگ و جدل سے گریز کرنے کی نصیحتیں شامل تھیں۔ اسی کے ساتھ ترک بازاروں میں مصحف فاطمہ کے نام سے قرآن کا ایک نسخہ بھی بازاروں میں موجود تھا، جس کے ذریعہ رفاہ پارٹی کی کامیابیوں کو ناکام بنانا تھا۔ دراصل حکومت مذہب کو آڑ بنا کر رفاہ پارٹی کے کارکنان اور اسلام پسند عناصروں پر پابندی لگانا چاہتی تھی۔ قرآن کی تفسیر میں بڑی جسارت کے ساتھ فتنہ انگیزی کی گئی تھی۔ ان سبھی مکر و فریب کے باوجود رفاہ پارٹی نے 1995ء کے انتخابات سے پہلے اپنا جو منشور پیش کیا اس سے ترک عوام خود بخود ان کی طرف کھینچی چلی آئی اور اس عام انتخاب میں رفاہ پارٹ کا خاطر خواہ کامیابی ملی اور نجم الدین اربکان نے وزیر اعظم کی حیثیت سے حلف اٹھایا۔ اربکان نے بڑی دانشمندی، فراست اور دور اندیشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے حکومتی حکمت عملی تیار کی، لیکن ملک میں ابھی اسلام کو غلبہ حاصل نہیں ہوا تھا لہٰذا جلد ہی اربکان کی اسلام پسند تعلیمات کے خلاف مختلف حلقوں میں چہ مگوئیاں ہونے لگیں۔ اور اربکان کو اپنے عہدے سے استعفیٰ دینا پڑا۔ اس کے بعد ملک میں "جماعت انصاف و ترقی" پارٹی کو حکومت میں اقتدار حاصل ہوا اور یہ پارٹی 2002, سے موجودہ حکومت تک اقتدار میں ہے۔ اس کے سربراہ رجب طیب اردگان ہیں۔ 2007ء میں ہوئے صدارتی انتخابات میں اس پارٹی نے نمایاں کامیابی حاصل کی اور عبد اللہ گل اس کے نئے صدر بنے۔ اس کے بعد 2014 کے عام انتخابات میں رجب طیب اردگان صدر منتخب ہوئے اور موجودہ حکومت کے صدر ہیں۔

5.10 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- جدید ترکی اور سیکولر حکومت کا قیام ایک اہم تاریخی اور سماجی تبدیلی کی علامت ہے۔ مصطفی کمال اتاترک کی قیادت میں کی گئی اصلاحات نے ترکی کو ایک جدید اور سیکولر ریاست میں تبدیل کیا، مگر ان اصلاحات کے اثرات آج بھی مختلف چیلنجز اور مسائل کی صورت میں موجود ہیں۔ ترکی کا مستقبل اس بات پر منحصر ہے کہ وہ کیسے اپنے جمہوری اصولوں، سیکولر اقدار، اور اقتصادی ترقی کے درمیان توازن برقرار رکھتا ہے۔

5.11 نمونہ امتحانی سوالات

5.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. 2007ء کے انتخابات میں کون صدر بنا؟

(a). محمد عدنان ندریس (b). نجم الدین اربکان (c). عصمت انونو (d). عبداللہ گل

2. ملی سلامت پارٹی کے سربراہ کا نام بتایئے؟

(a). جمال گرسیل (b). مصطفیٰ کمال (c). نجم الدین اربکان (d). رجب طیب اردوان

3. خلافت عثمانیہ کا خاتمہ کس سن عیسوی میں عمل میں آیا؟

(a). 1933ء (b). 1920ء (c). 1926ء (d). 1924ء

4. عربی رسم الخط کی جگہ تعلیم حاصل کرنے کے لئے کون سا رسم الخط اختیار کیا؟

(a). لاطینی (b). ترکی (c). رومن (d). فارسی

5. مصطفیٰ کمال کی جائے پیدائش ہے؟

(a). انقرہ (b). سالونیکا (c). استنبول (d). اسکی شہر

6. عصمت انونو کا دور حکومت کیا تھا؟

(a). 1938-1950ء (b). 1938-1960ء (c). 1950-1960ء (d). سب غلط

7. جنگ عظیم اول میں ترکی کس ملک کا حلیف تھا؟

(a). جرمنی (b). برطانیہ (c). فرانس (d). روس

8. ان میں سے کس کا تعلق انجمن اتحاد و ترقی سے تھا؟

(a). مدحت پاشا　(b). طلعت پاشا　(c). انور پاشا　(d). سبھی کا

9. مصطفیٰ کمال اتاترک نے جمہوری حکومت کا دارالخلافہ کس شہر کو بنایا؟

(a). استنبول　(b). اناطولیہ　(c). انقرہ　(d). ان میں سے کوئی نہیں

10. 1983ء کے انتخابات میں کس پارٹی کو اکثریت حاصل ہوئی؟

(a). مدر لینڈ پارٹی　(b). ڈیموکریٹک پارٹی　(c). رفاہ پارٹی　(d). پاپولسٹ پارٹی

5.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. 1973ء کے انتخابات میں ملی سلامت پارٹی کی کارکردگی پر روشنی ڈالئے۔
2. عصمت انونو کے دور حکومت کا جائزہ لیجئے۔
3. جدید ترکی کے تصور میں نوجوان ترک کی کوششوں پر نوٹ تحریر کیجیے۔
4. جنگ عظیم میں ترکی کے کردار پر بحث کیجیے۔
5. مصطفیٰ کمال کی اصلاحات میں سے تعلیمی اصلاحات کو بیان کیجیے۔

5.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. کمال اتاترک کی تحریک آزادی پر تفصیلی نوٹ تحریر کیجیے۔
2. جدید ترکی کے پس منظر پر مضمون لکھیے۔
3. مصطفیٰ کمال کی اصلاحات کا تفصیلی جائزہ لیجئے۔

5.12 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش : از، خالدہ ادیب خانم، کمتبہ جامعہ لیمٹیڈ، نئی دہلی
2. جدید ترکی : از، اطہر علی بی اے، منشی نول کشور، لکھنؤ
3. جدید ترکی : از، مولانا صدیق حسن پبلیشر سلطان حسین، بھنڈی بازار، ممبئی
4. جدید ترکی، جنگ عظیم اول سے 20ویں صدی تک : از، ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر، قرطاس، کراچی
5. ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ : از، ثروت صولت، اسلامک پبلی کیشنز لمٹیڈ، لاہور

اکائی 6: ترکی میں اسلامی احیاء

اکائی کے اجزا:

6.0 تمہید
6.1 مقاصد
6.2 تاریخی پس منظر
6.3 ترکی میں مذہبی اقتدار کا خاتمہ
6.4 ترکی میں اسلامی بیداری
6.5 شیخ بدیع الزماں سعید نورسی
6.5.1 رسائل نور اور احیائے اسلام
6.6 کثیر جماعتی نظام اور احیائے اسلام
6.7 نجم الدین اربکان اور ترکی میں اسلامی بیداری
6.8 ترکی میں اسلامی بیداری اور اردگان
6.9 اکتسابی نتائج
6.10 نمونہ امتحانی سوالات
6.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
6.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
6.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
6.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد

6.0 تمہید

ترکی کم و بیش پانچ سو برس تک عالم اسلام کا بازوئے شمشیر زن رہا ہے، وہ خلافتِ عثمانیہ کا مرکز تھا جس نے صدیوں تک عالمِ اسلام کی قیادت کی ہے۔ خلافتِ عثمانیہ کا یہ تسلسل موجودہ صدی کی تیسری دہائی تک قائم رہااور حرمین شریفین اور بیت المقدس سمیت کم و بیش تمام عرب علاقوں پر خلافتِ عثمانیہ کا جھنڈا لہراتا رہا۔ یورپین اقوام کو ملتِ اسلامیہ کی یہ مرکزیت ہمیشہ سے کھٹکتی چلی آرہی تھی، چنانچہ مسلسل سازشوں کے نتیجے میں 1924ء میں خلافتِ عثمانیہ کو ختم کرکے ترکی میں سیکولر جمہوریت کے نفاذ کا اعلان کر دیا گیا۔ مصطفیٰ کمال اتاترک نے نہ صرف خلافت کے خاتمہ کا اعلان کیا بلکہ عدالتوں میں نافذ اسلامی قوانین بھی ختم کر دیے، اسلامی تعلیم کے مدارس بند کر دیے، عربی زبان ممنوع قرار دے دی، حتیٰ کہ عربی میں اذان اور قرآن کریم کی تلاوت و اشاعت بھی شجرِ ممنوعہ قرار پائی، مغربی لباس لازمی قرار دے کر عورتوں کے لیے برقع اور مردوں کے لیے ٹوپی کے استعمال کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا، اور اس طرح کے دیگر اقدامات کے ذریعے قانون اور حکومت کی طاقت سے خلافت بلکہ اسلام کے اثرات کو سوسائٹی سے ختم کرنے کی ایک وسیع مہم چلائی گئی، اور آئین میں ترک فوج کو سیکولرازم کے ان اقدامات و روایات کا محافظ قرار دے دیا گیا۔

6.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ طلباء اس کے ذریعہ ترکی میں سیکولرزم کے بڑھتے اثرات اور مغربی نظریات کو پروان چڑھانے میں حکومتی اداروں کے کردار کو سمجھیں نیز ان کے ذریعہ ملک میں اسلام یا مذہبی امور سے متعلق قوانین کا بھی جائزہ لیا جائے۔ ترکی میں کثیر جماعتی نظام سیاست کی وجہ سے ملک میں مختلف الجہات نظریات کا سامنا رہا جس سے سیاسی پارٹیوں کو اپنے منشور میں دیگر امور کے ساتھ ساتھ اسلامی نظریات کے فروغ کو بھی جگہ دینی پڑی جس سے ملک میں اسلام کی فضاء قائم ہوئی اور یہی فضاء آگے چل کر ملک سے لادنیت اور سیکولرزم کے خاتمہ کا باعث بنی۔

طلباء کو اس بات سے باور کرایا جائے کہ جدید ترکی میں احیائے اسلامی میں بدیع الزماں سعید نورسی کی اہم خدمات رہی ہیں۔ نیز ان کی تصانیف نے بھی ترک عوام میں اسلامی بیداری پیدا کرنے میں اہم کردار اداء کیا ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی واضح رہے کہ ملک میں اسلامی نظریات کو فروغ دینے میں شیخ نورسی کے شاگردوں میں پروفیسر نجم الدین اربکان اور پھر بعد میں رجب طیب اردگان کا خاصہ حصہ رہا ہے۔

6.2 تاریخی پس منظر

جب سے سلطنت عثمانیہ کی داغ بیل ترکی کی سرزمین پر پڑی اور مسلمانوں کا اناطولیہ کی اس سرزمین پر قدم پڑا تبھی سے یہ خطہ اسلام اور اسلامی تعلیمات کا گہوارا رہا ہے۔ اسی نسبت سے عثمانی خلافت کی بنیادیں بھی مذہب و سیاست کے اصول کو بروئے کار لاتے ہوئے رکھی گئی تھی۔ تاکہ خلیفہ کی ذات مذہبی و سیاسی دونوں امور کی سربراہ رہے۔ ان سلاطین کی نظر میں اسلام کا یہ پیغام بھی پیش نظر تھا کہ

حفاظت اسلام اور شریعت کے نفاذ کے لئے ریاست ناگزیر ہے۔ سلاطین عثمانیہ نے تقریباً سوا چھ سو سالوں تک اسی اصول پر عمل پیرا رہے اور انہوں نے سیاست کے ساتھ ساتھ مذہب کو بھی اولیت کے درجہ میں رکھا۔ لیکن عثمانی سلطنت کے آخری دور میں تنظیمات کے ذریعہ سیاست کی بالادستی غالب ہوئی جب سلطان عبدالمجید اول 1823ء تا 1861ء نے فرمان ''خط گلھین'' جاری کیا۔ اور یہ سلسلہ 1880ء تک جاری رہا، مختلف مواقع سے سلاطین نے اپنی حکومت کو بہتر بنانے یا یوں کہیں کہ حکومت بچانے کے لئے عوامی دباؤ میں ان اصلاحات کو نافذ کیا جن کا مقصد دستوری قوانین کا نفاذ اور رائج قانون میں تبدیلی تھا۔ اسی طرح ''خط ہمایوں'' کے ذریعہ نئے قوانین کو پیش کیا گیا جس کے ذریعہ ملک میں غیر ملکی عناصر وافکار کی آمیزش نیز انکی بالادستی نمایاں تھی۔ 1839ء کے بعد رشید پاشا نے صوبوں کا جو نظم قائم کیا اس میں بھی فرانسیسی اثرات نمایاں تھے۔ تعلیم میں بھی خاطر خواہ اصلاحات کی گئیں لیکن مذہبی تعلیمی نظام سے اس کا ٹکراؤ ہونے کی صورت میں اس کے نفاذ میں زیادہ زور صرف نہیں کیا گیا پھر بھی عوام غیر ملکوں میں جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکتی تھی۔ یہ ساری تبدیلیاں نوجوان ترکوں کی مرہون منت تھیں کیوں کہ وہ ملک سے اسلامی قوانین و شریعت کو ختم کر کے ایک جمہوری و دستوری نظام چلانا چاہتے تھے جس کے لئے انہوں نے سلاطین کو اصلاحات کا طریقہ اختیار کرنے پر مجبور کیا تھا۔ عثمانیوں کی یہ اصلاحات اتنا غیر اسلامی بھی نہیں تھی لیکن اس کے نفاذ میں غیر اسلامی و مغربی طرز حکومت و معاشرت کا اثر تھا جس کا مطلب تھا کہ ترک عوام جو اسلام کے پاسدار اور محافظ تھے اب نئے سماجی ڈھانچے اور قوانین میں غیر اسلامی اداروں کو اختیار کرنے پر مجبور ہوں گے۔

تنظیمات کی تحریک کی مخالفت عوام اور علماء دونوں کی طرف سے ہوئی جس کی خاص وجہ یہ تھی کہ وہ شرعی امور میں اپنے اختیارات سے محروم کر دئے گئے تھے۔ نیز اس تحریک نے اسلامی قوانین کی متعدد دفعات پر بھی ضرب لگائی تھی۔ اس سلسلہ میں مجلس معارف کے صدر احمد جودت پاشا بھی چہ جائے کہ اصلاحات قوانین و ترقیات علمیہ کے حامی تھی لیکن وہ اس بات کو پسند نہ کرتے تھے کہ اسلامی شریعت کی جگہ فرانسیسی قوانین کا نفاذ عمل میں لایا جائے۔ ان کا خیال تھا کہ جامد ترکی کو تحریک دینے کے لئے صنعتی و تکنیکی میدان نیز فوجی اور عسکری زاوئے سے جدت کاری اختیار کرنی چاہئے، تاکہ ترک معاشرہ کی تعمیر میں اسلام کا مرکزی کردار باقی رہے۔

سلطان عبدالحمید ثانی کا دور خلافت اس نوعیت سے بہتر تھا کہ ان کے دور حکومت میں جدید ترقیات کے ساتھ ساتھ اسلامی قوانین اور شریعت کا نفاذ بھی عمل میں آیا، لیکن نوجوان ترکوں کی نظر میں مذہب اور شریعت کا استعمال صرف ذاتیات تک ہی محدود ہے عوام پر اس کو نافذ کرنا یا اس کا فائدہ اٹھانا غیر قانونی اور غیر انسانی ہے۔ عبدالحمید کے دور حکومت میں ایسے متعدد عناصر ترکی کی سیاست میں موجود تے جنہوں نے اپنے طرز عمل سے ملک میں غیر اسلامی شعائر اور مغربی تہذیب کو بہت فروغ دیا تھا، نیز کچھ ایسے عناصر بھی تھے جن کی اسلام مخالف نظریات کی وجہ سے خلافت اسلامی کا خاتمہ کر دیا گیا، اور ترکی میں دھیرے دھیرے لادینیت کا زور بڑھتا گیا۔ ایک طرف خلافت کا خاتمہ تھا تو دوسری طرف ملک کے نوجوان مغرب کی بڑھتی ہوئی طاقت اور تہذیب و تمدن و مادی اقدام و افکار کے سامنے اپنے گھٹنے ٹیک دئے۔ انہوں نے دین و مذہب کا قلادہ اپنے جسم سے اتار کر پھینک دیا۔

6.3 ترکی میں مذہبی اقتدار کا خاتمہ

لادینیت اور دستوری وجمہوری نظام حکومت کے تصورات کے ساتھ مصطفیٰ کمال اتاترک کی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ مصطفیٰ کمال جدید ترکی کے بانی ہیں۔ انہوں نے ترک عوام میں قومیت کی حمیت پیدا کر کے ملک کو مغربی اتحادی افواج سے نجات دلانے میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ لیکن ان کی تجدید پسندی، مذہب بیزاری، اور لادینت کے تصور نے ترکی جیسے اسلام محافظ اور اسلام کی سربلندی میں سرگرداں رہنے والے ملک میں نہ صرف اسلام پر پابندی لگادی بلکہ اسلامی شعائر کو بھی ختم کر دیا۔ مصطفیٰ کمال نے ملک کی عوام کو مذہب و روحانیت سے دور کر کے ملک کو سیکولر اسٹیٹ میں تبدیل کر دیا۔ کمال اتاترک نے 29 مئی 1923ء کو ایک آئینی ترمیم کے ذریعے ترکی کو جمہوریہ قرار دیا جس کے تحت خلافت کا خاتمہ کر دیا گیا، شرعی اداروں، محکموں اور قوانین شریعت کو منسوخ کر کے سوئزرلینڈ کا قانون دیوانی، اٹلی کا قانون فوجداری، اور جرمنی کا قانون بین الاقوامی تجارت نافذ کیا گیا۔ پرسنل لا کو یورپ کے قانون دیوانی سے بدل دیا گیا۔ دینی تعلیم ممنوع قرار پائی نیز، پردہ کرنے پر پابندی لگادی گئی مغربی طرز کی آئینی وپارلیمانی حکومت کا قیام عمل میں لایا گیا، علماء کے اختیارات کا خاتمہ کر دیا گیا، مغربیت کو مکمل طور پر اختیار کر لیا گیا، عوام کو یہ بات ذہن نشین کرائی گئی کہ اقتدار اعلیٰ کا سرچشمہ عوام ہیں، جزبہ قومیت کو ابھارا گیا، مغربی ممالک کے ساتھ بہتر تعلقات کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا گیا، وزارت مذہبی امور واوقاف کا خاتمہ کر دیا گیا اور 1928ء کے آئین میں ترکی کو ایک سیکولر ریاست قرار دے دیا گیا، اس طرح اسلام ریاست کا سرکاری مذہب نہ رہا اس پر ستم یہ کہ وقت کے ساتھ ساتھ دین بیزاری بڑھتی چلی گئی 1932ء میں ترک حکومت نے فیصلہ کیا کہ اذان عربی کی بجائے ترکی زبان میں دی جائے گی اذان کے الفاظ ترکی زبان میں ڈھالے گئے اور 1933ء میں عربی زبان میں اذان دینا جرم قرار دے دیا گیا، علماء کے مذہبی لباس اور سرکاری ریڈیو سے قرآن کریم کی تلاوت پر پابندی لگادی گئی اسی طرح مدرسوں اور تصوف کے سلسلوں پر پابندی لگادی گئی، ترک زبان سے عربی اور فارسی کے الفاظ نکالنے کے لیے بھرپور جدوجہد کی گئی، ترک زبان کے لیے لاطینی حروف تہجی کو اختیار کیا گیا، نوجوان نسل میں اس نظریہ کو راسخ کرنے کی کوشش کی گئی کہ ترک کوئی جنگجو نسل نہیں بلکہ دنیا کو تہذیب سکھانے والی قوم ہے پھر اس بات کے لیے بھرپور زور آزمائی گئی کہ ترکوں کو اسلام سے جدا کر دیا جائے اور قومیت کو ذہنوں میں پختہ کر دیا جائے یہ وہ اقدامات تھے جس نے ترک معاشرہ کے ہر فرد کو فکر و پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا۔

6.4 ترکی میں اسلامی بیداری

1938ء میں مصطفیٰ کمال کے انتقال کے بعد سے 1950ء تک ملک میں ری پبلکن پیپلز پارٹی کا غلبہ رہا اور عصمت انونو نے ملک میں کمالی نظریات کو خوب فروغ دیا اور کمالی طرز حکومت کو اختیار کئے رکھا، لیکن وہ ترک مسلمانوں کو ان تمام تر ریشہ دوانیوں اور سازشوں کے باوجود اپنا رشتہ اسلام سے جوڑنے سے نہ روک سکے۔ سیکولر اثرات کے خاتمہ کے لیے نصف درجن سے زائد ایسی جماعتیں میدان عمل میں اتریں جنہوں نے سیکولر اصلاحات کے منفی اثرات کے خاتمے کے لیے بھرپور جدوجہد کیں۔ کمالی پالیسیوں کو منوانے کے لیے شدید مزاحمت

کا سامنا رہا، ہزاروں علماء نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔

مصطفیٰ کمال کے سیکولر نظریات و مغربی طرز حکومت کے مقابلہ میں ترکی میں احیائے اسلام کی ایک کمزور مگر حرارت ایمانی سے معمور اور روحانیت سے سرشار آواز بلند ہوئی۔ یہ آواز اگرچہ کمالی الحاد و نظریات کے سمندر کو تو نہ روک سکی مگر ترک عوام کے دلوں میں اسلام کی روشنی ضرور پیدا کر گئی۔ تربیت و تزکیہ نفس کے مستحکم نظام کے ذریعہ ترکی عوام کے دلوں میں سیکولر افکار و اقدار کو حاوی نہ ہونے دیا۔ رسائل، خطبات و بیانات اور اجتماعی جدوجہد کے ذریعہ عوام میں مذہب اسلام کا شعور بیدار رکھا، نیز انہیں قرآن کے آفاقی احکامات سے مستفیض ہونے کے لئے آمادہ کیا۔ یہ آواز

.. ترکی کے جلیل القدر عالم شیخ سعید نورسی کی تھی جن کی علمی قابلیت اور خداداد صلاحیت کی بناء پر بدیع الزماں کے خطاب سے نوازے گئے۔ شیخ بدیع الزماں سعید نورسی کی دعوتی، اصلاحی اوراسلامی خدمات کو ترکی جمہوریہ میں تحریک اسلامی کی اساس قرار دیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ آپکے رسائل واصلاحی اقدام نے ہی مصطفیٰ کمال کے الحاد کا مقابلہ کیا۔

6.5 شیخ بدیع الزماں سعید نورسی

شیخ بدیع الزماں سعید نورسی کی پیدائش 1873ء میں صوبہ تیلس کے قصبہ بیزان کے ایک گاؤں نرس کے کرد خاندان میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گاؤں میں ہی حاصل کی پھر استنبول میں اعلیٰ تعلیم کے لئے سفر کیا اور اٹھارہ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے آپ کا شمار ترکی کے ممتاز علماء میں ہونے لگا تھا۔ آپ کو اسی زمانہ سے قرآن کی تعلیمات کو عام کرنے اور اسکے محاسن کی توضیح سے دلچسپی تھی جو آگے چل کر رسالہ نور کی بنیاد بنی۔ آپ نے اسلامی تعلیمات کی تشہیر کے لئے وان کا رخت سفر باندھا اور تقریبا 15 سالوں تک وہاں علم کی خدمت کرتے رہے۔ ایک مدرسہ جامعۃ الزہرا کے نام پر قائم کیا جس میں عربی، کردش اور ترکی تینوں زبانوں میں تعلیم دی جاتی تھی۔ شیخ اپنے علمی منصوبوں کو پورا کرنے کے لئے وان شہر کو خیر آباد کہ کر استنبول میں سکونت اختیار کر لی یہ سلطان عبد الحمید ثانی کا دور تھا، اور انجمن اتحاد و ترقی سلطان کے خلاف سرگرم عمل تھی۔ شیخ کی ہمدردیاں انجمن اتحاد سے وابستہ ہو گئیں اور آپ 1908ء کے انقلاب اور دستوری حکومت کے نفاذ میں انجمن اتحاد و ترقی کے ساتھ رہے۔ لیکن پھر سعید نورسی کو جلد ہی احساس ہو گیا کہ نوجوان ترکوں کے اس عمل سے مغربی افکار و اقدار کی برتری ترک معاشرہ میں انتشار برپا کر رہی ہے لہٰذا سعید نورسی نے اس کے مقابلہ کے لئے "انجمن اتحاد محمدی" قائم کی اور وحدت، آزادی اور اصلاح معاشرہ اس انجمن کا بھی منشور قرار پایا لیکن اس کے ساتھ ساتھ شریعت کا نفاذ بھی انجمن کے پروگرام میں شامل تھا۔ اس کا مقصد وحدت اسلامی کا فروغ تھا، اور اس کا ترجمان اخبار "ولکان" تھا۔ اس اخبار کے ذریعہ شیخ نے مغربیت اور الحاد کے خلاف اپنے مضامین نشر کئے تا کہ ترک عوام کو انجمن اتحاد و ترقی کے ملحدانہ خیالات سے آزاد کرایا جا سکے اور یورپ کی تقلید کا مقابلہ کیا جا سکے۔

1909ء میں البانوی فوج میں بغاوت پھوٹ پڑی اور عوام کی ایک بڑی جماعت بھی اس میں شریک ہو گئی جن کا مقصد شریعت محمدی کا نفاذ تھا۔ چونکہ ترکی پر اب نوجوان ترکوں کی حکومت تھی اور انکا مطمح نظر مغربی تقلید اور الحاد پرستی تھا۔ لہٰذا انجمن اتحاد و ترقی کے فوجی

کمانڈر محمود شوکت پاشا کی قیادت میں اس بغاوت کو کچل دیا گیا۔ شیخ سعید نورسی کی تحریک انجمن اتحاد محمدی کے بعض افراد نے بھی اس میں شرکت کی تھی، لیکن شیخ اس میں عملی طور پر شامل نہیں تھے اس لئے ان پر مقادمہ چلا اور جلد ہی ثبوتوں کے فقدان کی وجہ سے رہا کر دئے گئے۔ اس بغاوت کو شیخ نے ایک دستوری جدوجہد قرار دیا جس کے ذریعہ شریعت کی تنفیذ عمل میں آسکتی تھی۔ سعید نورسی اس بات میں کوشاں رہے کہ انجمن اتحاد و ترقی کے رہنماؤں میں فکری تبدیلی آجائے اور مطلق العنانی، استبداد اور بادشاہت کا نظام ختم ہو جائے۔ جنگ عظیم اول میں آپ نے رضاکارانہ طور پر حصہ لیا اور روسیوں کے ہاتھوں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ کسی طرح وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہوئے اور جرمنی، ویانا، اور بلغاریا ہوتے ہوئے استنبول واپس آگئے۔

جنگ عظیم کے بعد شیخ نے ترکی کے حالات کا بغور مطالعہ کیا اور خود کے لئے نیا لائحہ عمل اختیار کیا جو پچھلے لائحہ عمل سے الگ تھا۔ آپ نے خود کو سیاسی دائرہ عمل سے باہر رکھنے کا فیصلہ کیا نیز اختلاف و کشمکش سے گریز کرنے کا بھی فیصلہ کیا۔ اور آپکا مقصد ملک میں قرآنی تعلیمات کو عام کرنا اور قرآن سے استفادہ اور افادہ کی جدید تحریک شروع کی جس نے رسائل نور کا قالب اختیار کر لیا۔ آپ استنبول سے وان شہر منتقل ہو گئے آپ کو متعدد حکومتی عہدے پیش کئے گئے لیکن آپ نے کسی طرح کا کوئی عہدہ قبول نہیں کیا۔ 1925ء میں کمالی حکومت کے خلاف بغاوت ہوئی جس کی قیادت نقشبندی رہنما شیخ سعید پیر اں کے ہاتھ میں تھی۔ سعید نورسی کا اس بغاوت سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن باوجود اس کے انہیں گرفتار کر کے وان سے اناطولیہ کے ایک گاؤں میں جلاوطن کر دیا گیا۔ جلاوطنی، قید و بند اور دار و گیر کا یہ سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ شیخ کو نظر بند کر دیا گیا لیکن شیخ نے رسائل نور کی تصنیف اور عوام کی تربیت کا خفیہ کام جاری رکھا۔ 1934ء میں آپ پر ترکی جمہوریہ کی بنیادیں کمزور کرنے اور خفیہ مذہبی تنظیم قائم کرنے کا الزام لگایا گیا اور دیگر طلبہ کے ساتھ آپ کو چھ مہینے قید کی سزا سنائی گئی۔ اسی طرح آپ کی زندگی قید و بند اور جلاوطنی کا منبع بن گئی۔ یہاں تک کہ 1950ء میں عدنان مندریس نے انتخابی جلسوں میں ملک کو مسلمان بنانے اور اسلام کے مطالبات کی تکمیل کا اعلان کیا تو اسلامی حلقوں میں مصطفیٰ کمال کے استبدادی سیکولر نظام کے خاتمہ ہونے کی امیدیں جگ اٹھی اور اسی دوران شیخ سعید نورسی نے عدنان مندریس کو ملک کا ہیرو قرار دے دیا۔ اسی اعلان کا اثر تھا کہ عدنان مندریس کو اس انتخاب میں کامیابی ملی اور وہ ملک کے وزیر اعظم بنے۔ سعید نورسی نے انہیں حکومتی معاملات میں اسلامی اصولوں کو اختیار کرنے کی تاکید کی۔ شیخ سعید نورسی کو پورے پچیس سالوں کے بعد آزادانہ نقل حرکت کرنے کا موقع ملا۔ لیکن یہ خیالات بھی جلد ہی رفو ہو گئے جب عدنان مندریس نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد اسلامی اقدار کے لئے کوئی قابل ستائش کام نہیں کیا اور 1952ء میں ان کی حکومت نے شیخ نورسی اور ان کے رفقاء کو گرفتار کر لیا گیا۔ یہاں تک کہ رسائل نور کی تشہیر پر بھی پابندی لگادی گئی۔ آپ پر مقدمہ چلا لیکن ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے انہیں بری کر دیا گیا۔ اور اسپارٹا کے ایک گاؤ بارلا میں آپ نے سکونت اختیار کر لی یہ وہی مقام تھا جہاں سے آپ نے رسائل نور کا آغاز کیا تھا۔

6.5.1 رسائل نور اور احیائے اسلام

رسائل نور شیخ بدیع الزماں سعید نورسی کا وہ کارنامہ ہے جس نے کمال اتاترک کے لادینی نظریات و سیکولر افکار اور عوام پر پڑنے

والے مغربی اثرات کے زور کو کم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ رسائل دراصل قرآن کے رموز و معارف کی متصوفانہ تشریح تھی۔ شیخ نورسی نے قرآن کی باضابطہ تفسیر لکھنے کے بجائے قرآن کے مفاہیم و مطالب کو اپنے اندر پیدا ہوئے تصورات تجربات اور اثرات کی روشنی میں پیش کیا۔ یہ طریقہ واسلوب قرآن کے اعجازانہ پہلوؤں کو بہتر انداز میں پیش کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ شیخ نورسی نے اس اسلوب کا استعمال کرتے قلبی واردات وخواطر اور نفسی کیفیات کی صوفیانہ توضیحات کیں مگر تہذیب جدید اور مادی علائق سے فرار اور رہبانی تزکیہ کی تعلیم نہیں دی بلکہ ترکی کے معاشرہ میں پیدا ہو رہے بگاڑ اور سیکولر نظریات پر زبردست تنقید کی۔ شیخ نے اپنی وفات تک 130 رسائل تصنیف کئے تھے جن کی اشاعت منظر عام پر آچکی تھی۔

شیخ نورسی کے ذہن میں جدید مادیت اور سیکولر نظریات کے مقابلہ میں قدیم علم کلام کے بجائے جدید علم کلام اور قرآن کی نئی طرز تعبیر کی ضرورت واہمیت مسلم ہو چکی تھی چنانچہ آپ نے اسی جدید علم کلام اور تزکیہ نفس سے متعلق بھی غور و فکر کیا تھا جس کے لئے متعدد صوفیائے کرام شیخ محمد کفردی نقشبندی، سید نور قادری اور شیخ فہیم نقشبندی وغیرہم کی خدمت میں حاضری بھی دی تھی۔ لیکن انکا نظریہ یہ تھا کہ جدید مادیت کے خلاف نئے علم کلام کو بروئے کار لایا جائے۔ یہ فکر ان میں جوانی کے دنوں سے موجزن تھی، چنانچہ جنگ عظیم کی خوفناکیوں کے بعد جب سعید الجدید کا سفر شروع ہوا تو آپ نے اسی نقطہ کو مد نظر رکھا اور قوم کی ذہنی و فکری تربیت کے لئے رسائل نور کو اساس بنایا۔

شیخ نورسی کا سب سے عظیم کارنامہ یہی ہے کہ انہوں نے ترکوں کا سرمایا ایمان بچانے کے لئے اپنی زندگی وقف کری، پہلے انہوں نے سیاسی طور پر اسے بچانے کی کوشش کی پھر جب انہیں محسوس ہوا کہ دین و ایمان کا وہ سرمایاہی خطرے میں پڑ چکا ہے جس پر اسلامی سماج اور اسلامی حکومت کی عمارت قائم ہے۔ مغربی فکر والحادی نظریات نے ترک نوجوانوں میں اسلامی عقائد و نظریات کے بارے میں شک وشبہ اور ارتیاب میں مبتلا کر دیا ہے۔ ان ہی امور کی وجہ سے آپ سیاست کے میدان کو چھوڑ کر اسلامی عقائد و تعلیمات کی موثر تعبیر و ترجمانی کے لئے خود کو فارغ کر لیا اور اپنے رسائل و مکتوبات کے ذریعہ اس نئی نسل کی اصلاح و تبلیغ نیز تعلیم و تزکیہ کا زبردست کام لیا، اور ترک عوام کو لادینیت اور الحاد سے نکال کر ایمان کے چراغ تلے جمع کر دیا نیز اسلامی عقائد واحکام پر اعتماد بحال کر دیا۔ بلاشبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ شیخ نورسی ترکی میں دور الحاد وزندقہ کے بعد اسلامی نشاۃ ثانیہ کے بانی ہیں۔ آپ کے تلامذہ نے اسی انداز و اسلوب کو اختیار کرتے ہوئے ترکی میں اسلامی شریعت کا جذبہ ترک عوام میں پیدا کر دیا۔

6.6 کثیر جماعتی نظام اور احیائے اسلام

دوسری جنگ عظیم کے بعد 1947ء میں کثیر جماعتی نظام سیاست کا التزام عمل میں آیا جو ترکی کی تاریخ میں احیائے اسلامی کے لئے اہم موثر ثابت ہوا۔ اس نظام کے قیام کے ساتھ ہی ریپبلیکن پیپلز پارٹی کا اقتدار کمزور پڑ تا گیا جو کمالزم کی نمائندگی کرنے والی پارٹی تھی اور ترکی کی سیاست میں اس نے دو دہائی تک مضبوط پکڑ بنائی تھی لیکن کثیر جماعتی نظام سیاست میں 1950ء کے عام انتخابات میں ڈیموکریٹک

پارٹی نے کامیابی حاصل کی اور "جلابایار" نئے صدر بنے۔ اگرچہ وہ پہلے کمال اتاترک کی ری پبلکن پارٹی میں رہے لیکن وہ کمال اتاترک کی سیکولر اصلاحات کے مخالف تھے اور حکومت کی غلط پالیسیوں کو شدید تنقید کا نشانہ بناتے ڈیمو کریٹک پارٹی حکومت کی مذہبی معاملات میں مداخلت کے خلاف تھی ڈیمو کریٹک پارٹی نے اپنے دور حکومت میں اماموں اور خطیبوں کے لیے سرکاری طور پر تعلیم کا بندوست کیا پرائمری اسکولوں میں مذہبی تعلیم کو رائج کرنے کی ابتدائی کوششیں کی گئیں ڈیمو کریٹک پارٹی کی کوششوں سے اذان پھر سے عربی زبان میں دی جانے لگی، سیکنڈری سطح پر مذہبی تعلیم کے کورس نصاب میں شامل کرائے گئے ،انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک سٹڈیز کا قیام عمل میں لایا گیا1960ء میں فوجی انقلاب کے بعد ڈیمو کریٹک پارٹی پر پابندی عائد کر دی گئ 1961ء میں ریٹائرڈ جرنیل راغب گوموس پالہ نے جسٹس پارٹی کی بنیاد رکھی جس نے ڈیمو کریٹک پارٹی کی طرز پر کام کیا جسٹس پارٹی،ڈیمو کریٹک پارٹی کی جانشین تصور کی جاتی رہی راغب گوموس پالہ کی وفات کے بعد پارٹی کی قیادت سلیمان ڈیمرل نے سنبھال لی "دیانت" کے نام سے ایک تنظیم کا قیام عمل میں لایا گیا اس کے قیام کا مقصد ملک میں اسلامی فکر کی ترویج کرنا تھا اس ادارہ کے تحت اماموں اور خطیبوں کی تربیت کی جاتی تمام مئوذنوں اوراماموں کو تنخواہیں اسی تنظیم کے تحت ادا کی جاتیں۔ اس تنظیم نے مدارس کا ایک جال بچھادیا۔ترکی میں چار مقامات پر اسلامی تحقیق کے بڑے بڑے ادارے قائم کیے گئے تمام ہائی اسکولوں میں مسلمانوں کے لیے دینی تعلیم لازمی قرار دی گئی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ 1969ء کے الیکشن کے بعد مغرب نواز پالیسیوں کی وجہ سے سلیمان ڈیمریل کو سخت مخالفت کا سامنا بھی رہا۔ اسی دور میں نیشنل سالویشن پارٹی نے زیادہ کھل کر اسلامی فکر کی ترویج کے لیے کام کیا کھل کر سیکولرازم ،کیمیونیزم اور صہونیت کی مخالفت کی۔ پارٹی کے اسلامی رجحان اور ترغیب نے دوسری پارٹیوں کو بھی مجبور کر دیا کہ وہ اسلام کے حوالے سے اپنی جماعتوں کے منشور پر غور کریں اوراپنے پروگراموں کو اسلامی سانچے میں ڈھالیں۔

6.7 نجم الدین اربکان اور ترکی میں اسلامی بیداری

شیخ بدیع الزماں نورسی کے بعد ترکی میں انفرادی حیثیت میں اسلامی بیداری پیدا کرنے یا اس میں مزید ترقی عطاء کرنے میں اگر کوئی نام اہمیت کا حامل ہے تو وہ نجم الدین اربکان کا نام ہے۔ نجم الدین اربکان پیشہ سے استنبول یونیورسٹی کے پروفیسر تھے اور نوجوانوں کو روزگار فراہم کرانے کے لئے متعدد صنعتی ادارے قائم کئے اور اسی نسبت سے چیمبر آف کامرس انڈسٹریز کے صدر بنے۔ آپ نے سیاسی میدان میں بھی قسمت آزمائی، آپ چونکہ جسٹس پارٹی کے ممتاز ممبر تھے اور اسی نسبت سے 1969ء کے ایلکشن میں حصہ لینا چاہتے تھے لیکن سلیمان دمریل نے آپ کی درخواست قبول نہیں کی کیونکہ آپ پر اسلامی رجحانات رکھنے اوراسلامی عقائد کی ترجمانی کرنے کا الزام تھا۔ لہٰذا آپ شہر قونیہ سے آزاد امیدوار کی حیثیت سے لڑے اور ایلکشن میں جیت کے ساتھ ہی پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوگئے۔ ایوان میں بہت سے ممبران اسلامی مزاج اور اسلام سے ہم آہنگی رکھتے تھے نجم الدین اربکان نے ان ہی افراد کو جوڑ کر ایک نئی سیاسی پارٹی "ملی نظام پارٹی" کی بنیاد رکھی۔ ملی نظام پارٹی اپنے اسلامی نظریات اور ملکی فلاح و بہبود کے ذریعہ بہت جلد عوام میں مقبول حاصل کرلی، جسکے نتیجہ میں سیکولر پارٹیوں کو خطرہ لاحق ہوااور ملک کی فوج جو خود کو ملک میں سیکولر اور لادینیت کے فروغ کا اہلکار سمجھتی تھی نے مل کر ملی نظام پارٹی کے خلاف اسلامی شریعت کا پروپگنڈہ کرنے کے الزام میں مقدمہ دائر کر دیا کیونکہ یہ سیکولر عناصر کے خلاف ہے۔ چنانچہ عدالت نے نجم الدین اربکان

کی اس پارٹی پر پابندی عائد کر دی۔

6.7.1.1. ملی سلامت پارٹی

نجم الدین اربکان نے مسلسل جہد جاری رکھی اور 1972ء میں ملی سلامت پارٹی کی بنیاد رکھی، اس پارٹی کی سربراہی سلیمان عارف کے سپرد کی اور 1973ء کے عام انتخابات میں حصہ لیا اور آپ کی پارٹی نے 48 نشستیں حاصل کیں جو ترک عوام میں اسلام سے محبت و عقیدت کا ثبوت پیش کر رہی تھی۔ سلیمان عارف نے انتخاب میں کامیابی کے بعد اپنے عہدے سے استفادے دیا اور نجم الدین اربکان کو عہدہ صدارت تفویض کر دیا۔ پروفیسر اربکان کی اس تنظیم کو متعدد عام انتخابات میں عوام کا ساتھ حاصل رہا اور وقتی صورت حال سے فائدہ اٹھا کر ریپبلکن پارٹی اور جسٹس پارٹی کے ساتھ مل کر مخلوط حکومت میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس حکومت میں ملی سلامت پارٹی کو سات وزارتیں حاصل ہوئیں جن میں وزارت داخلہ، انصاف، تجارت، صنعت وغیرہ اہم تھیں۔ نیز نجم الدین اربکان نائب وزیر اعظم کے منصب پر فائز ہوئے۔ اسی طرح 1975ء کی حکومت سازی میں جسٹس پارٹی کے سربراہ سلیمان دمریل کے ساتھ مل کر ملی سلامت پارٹی دوبارہ حکومت اور وزارت میں شامل ہوئی۔ اس بار کی حکومت میں نجم الدین اربکان نے ملک میں اسلامی اقدار کے فروغ دینے میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ اس دور میں نئے مدارس دینیہ شروع کئے گئے نیز ائمہ مساجد و خطیب کو ملک میں اسلامی تعلیمات کی اشاعت کے لئے سرکاری طور پر مامور کیا گیا۔ نیز میڈیا کا سہارا لیکر مغربی تہذیب و تمدن اور لادینت کے خلاف حملہ کئے گئے۔

نجم الدین اربکان کی ان کوششوں کے نتیجے میں ترکی میں اسلام کی فضاء ساز گار ہونے لگی تھی کہ پھر ملک میں موجود سیکولر نظریات کے حاملین نے ملی سلامت پارٹی کے اسلام موافق پالیسیوں کے خلاف آواز بلند کرنا شروع کر دیا۔ ترک فوج نے ملی سلامت پارٹی کی اسلامی حکومت قائم کرنے کے مطالبے کی مخالفت میں ملک میں انقلاب برپا کر دیا اور 12 ستمبر 1980ء کو فوج نے حکومت پر قبضہ کر لیا، تمام سیاسی پارٹیوں پر پابندی لگا دی گئی۔ اور ان کے سربراہان کو قید کر دیا گیا۔ یہ پابندی تقریبا تین سالوں تک قائم رہی اور جنرل کنعان ایفریں اس دوران ملک کے صدر رہے اور انہوں نے 1983ء میں سیاسی پارٹیوں کو از سر نو اپنی پارٹی تشکیل دینے کی اجازت دے دی۔ اس بار سبھی سیاسی تنظیموں نے اپنے منشور میں اسلام اور شریعت کے لئے نرم رویہ اختیار کیا۔ اور یہ ملی سلامت پارٹی کی طرف سے رکھی گئی اسلامیت اور مذہبیت کا ثمرہ تھا کہ ہر پارٹی نے عوام کو اپنی طرف راغب کرنے کے لئے تنظیموں کے دستور میں اسلامی پسند عناصر کو شامل کیا۔

6.7.1.2. رفاہ پارٹی

نئی تنظیموں کی تشکیل میں ایک نیا نام رفاہ اسلامی پارٹی کا بھی شامل تھا جس کے سربراہ ایڈوکیٹ علی تورکان تھے۔ اس تنظیم کی تشکیل نو ہوتے ہی ملی سلامت پارٹی کے ارکان و ممبران بڑی تعداد میں اس تنظیم میں شامل ہوئے۔ نجم الدین اربکان اس تنظیم کے صدر بنے اور پھر آپ نے ملک میں اسلامی بیداری لانے کی اپنی کوششیں جاری رکھیں یہاں تک کہ 1995ء کے عام انتخابات میں رفاہ پارٹی کو مجموعی طور پر 21 فیصد ووٹ حاصل کر ملک کی سب سے بڑی پارٹی کی شکل میں ظاہر ہوئی اور نجم الدین اربکان ملک کے وزیر اعظم بنے۔ آپنے ملک میں اسلامی امور کی انجام دہی کو عام کیا جس سے ملک کی فوج اور سیکولر محافظوں نے ان امور کو خلاف دستور قرار دیکر نجم

الدین اربکان سے مملکت ترکی کے سیکولر نظریات کی حفاظت کے لئے اٹھارہ مطالبات کئے۔ جن کا پورا کرنا نجم الدین اربکان کے لئے ممکن نہ تھا، کیوں کہ اس کے نتیجہ میں آپ کی سالہا سال کی محنت ومشقت پر پانی پھر جاتا۔ مطالبات کا خلاصہ یہ تھا کہ ملک ترکی میں اسلامی شریعت کی تنفید پر پابندی لگادی جائے، حجاب ممنوع قرار دیا جائے، دینی سیاسی محرکات کو جرم قرار دیا جائے، ملک میں مساجد کی تعمیرات کو بند کر دیا جائے، اور مدارس دینیہ پر پابندی عائد کر دی جائے نیز اسلامی رجحانات کے حاملین کو حکومت سے برطرف کر دیا جائے۔ نجم الدین اربکان کے لئے ان مطالبات کا پورا کرنا محال تھا لہٰذا انہوں نے حکومت سے استعفیٰ دے دیا۔

6.7.1.3. فضیلت پارٹی

نجم الدین اربکان کے استعفے کے بعد فوج نے حکومت پر قبضہ کر لیا اور ''سفید انقلاب'' کے نام پر رفاہ پارٹی پر مکمل پابندی لگادی گئی اور نجم الدین اربکان کو پانچ سالوں تک سیاسی سرگرمی سے روک دیا گیا۔ نیز فوج کی عہدیداروں نے ملک سے اسلامی شعائر کو ختم کرنے کے لئے بڑی جدجہد کی، حجاب پہن کر تعلیم حاصل کرنے پر پابندی لگادی گئی، ائمہ وخطیب مساجد کے پروگراموں میں جانے پر پابندی لگی، نیز لازمی تعلیم کی مدت پانچ سال سے بڑھا کر آٹھ سال کر دی گئی۔ اسی دوران نجم الدین اربکان اور انکے ماننے والوں نے ''فضیلت پارٹی'' کے نام سے ایک نئی سیاسی تنظیم تشکیل دی، نجما سلین اربکان پر سیاسی پابندی تھی اس لئے اس بار ''فضیلت پارٹی'' کی سربراہی رجائی قوتوں کے سپرد کی گئی۔ اور 1999ء کے الیکشن میں اس پارٹی نے بڑی کامیابی حاصل کی۔ لیکن اندرونی طور پر پارٹی میں حکمت عملی کے برتنے میں تھوڑا بہت اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ نوجوان طبقہ کا اس بات پر زور تھا کہ اس پارٹی کو اپنی حکمت عملی میں نرمی لانے کی ضرورت ہے اور اسے تمام مطالبات کو منوانے کے لئے فوج اور سیکولرزم کے حاملین کے ساتھ تصادم کوئی حل نہیں ہے۔ ابھی یہ معاملہ طے بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ نجم الدین اربکان اور انکی پارٹی پر اخباروں میں لادینی سیکولر طبقے کی طرف سے حملے شروع ہو گئے۔ جس کے نتیجہ میں عدالت نے نجم الدین اربکان کو ایک سال کی قید اور عمر بھر سیاست سے دست بردار رہنے کا فیصلہ سنا دیا۔ تو دوسری طرف فضیلت پارٹی کو 2001ء میں تحلیل کر دیا گیا۔ اس طرح نجم الدین اربکان کی سیاسی زندگی کا اختتام عمل میں آیا۔ جنہوں نے ترکی میں اسلامی بیداری اور اسلام کی مؤثر نمائندگی میں بڑا کردار ادا کیا۔

6.8 ترکی میں اسلامی بیداری اور اردگان

رجب طیب اردگان نے ستّر کی دہائی میں میدان سیاست میں قدم رکھا جو کہ مذہب وملت سے محبت رکھنے والی شخصیت ہیں۔ نجم الدین اربکان کی رفاہ پارٹی سے سیاست کا آغاز کیا اور استنبول کی میئر شپ حاصل کی استنبول کا میئر بننے کے بعد طیب اردوگان نے گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ اردگان نوجوانوں کی اس جماعت کے ساتھ تھے جو نجم الدین اربکان سے اختلاف رکھتے تھے اور ملک میں اسلامی شریعت کے نفاذ میں نرمی برتنے کے حامی تھے، آگے چل کر اردوگان نے انہیں نوجوانوں کے ساتھ مل کر ''جسٹس اینڈ ڈویلپمنٹ پارٹی ''(آق پارٹی) کی بنیاد رکھی۔ یہ پارٹی پہلی بار 2002ء کے پارلیمانی الیکشن میں شریک ہوئی اور 34 فیصد سے زائد ووٹ حاصل کئے۔ آق پارٹی نے اقتدار حاصل کیا طیب اردگان نے اپنے دور حکومت میں میڈیا پر سے مذہبی پروگرام دکھانے پر سے پابندی کا خاتمہ کیا۔ اردگان کے دور

حکومت سے پہلے اسکارف اوڑھنے پر بچیوں سے تعلیم کا حق چھین لیا جاتا تھا اسکارف پر سے پابندی کا خاتمہ کیا گیا۔ مختلف مواقعوں پر مغربی حکمرانوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر کے دینی غیرت و حمیت کا ثبوت دیا۔ اسی طرح 99 سالہ ان پابندیوں کا خاتمہ کیا گیا۔ جس میں ترکی کے سیکولر آئین کے تحت فوج میں خواتین اہلکاروں پر ڈیوٹی کے دوران حجاب کرنے اور مرد اہلکاروں پر داڑھی رکھنے پر پابندی تھی اس پابندی کو حکومت نے ہٹاتے ہوئے تمام سویلین مرد و خواتین اہلکاروں کو اسلامی عقائد کے مطابق حجاب کرنے اور داڑھی رکھنے کی اجازت دے دی ہے۔

رجب طیب اردگان نے ملک کی سیاسی حالت کو بہتر بناتے ہوئے ان مسائل کی طرف توجہ مبذول کی جس سے ملک کی ترقی ہو اقتصادی بہتری آئے، نیز حکومت پر سے فوج کا کنٹرول ختم کرنے کی طرف بھی توجہ دی جو ملک میں اسلامی نظریات کی اشاعت میں مانع تھے۔ اردگان نے دھیرے دھیرے ملک کے قانون میں تبدیلی کر کے حکومتی عہدوں سے فوج کے افسران کو آزاد کر دیا۔ رجب طیب اردگان کی پارٹی نے 2007ء کے پارلیمانی انتخاب میں اکثریت سے حکومت بنائی اور ملک میں اسلامی نظریات و شریعت کے نفاذ میں نہایت اہم رول ادا کیا۔

6.9 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- ترکی میں اسلامی احیاء ایک متحرک اور متنوع عمل ہے جو مختلف سطحوں پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جو ماضی کی وراثت کو جدید دنیا کے تقاضوں کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اگرچہ اس کے ساتھ چیلنجز بھی ہیں، لیکن ترکی کی قوم اپنے اسلامی تشخص کو برقرار رکھتے ہوئے ترقی کی راہوں پر گامزن ہے۔ یہ احیاء نہ صرف ترکی بلکہ دنیا بھر میں اسلامی شناخت کی بحالی کا ایک اہم مثال پیش کرتا ہے، جس میں روایات، ثقافت، اور جدیدیت کے مابین توازن تلاش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔
- جس طرح کمال اتاترک کے ذریعہ ترکی میں لادینیت اور سیکولر نظریات کو پروان چڑھایا گیا تھا اسی طرح اسلام کی تخم کاری کے لئے بھی اللہ نے سعید نورسی، نجم الدین اربکان اور طیب اردگان جیسے افراد پیدا کر کے ترکی میں اسلامی بیداری کی روح پھونک دی۔

6.10 نمونہ امتحانی سوالات

6.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. بانی تبلیغ جماعت کا تاریخی نام کیا تھا؟

(a). محمد الیاس (b). اختر الیاس (c). احمد الیاس (d). الیاس اختر

2. تبلیغی جماعت کا آغاز کس علاقہ سے ہوا؟

(a). نوح (b). میوات (c). لکھنؤ (d). مئو

3. تبلیغ کی پہلی جماعت کب نکلی تھی؟

(a). 1933ء (b). 1920ء (c). 1926ء (d). 1940ء

4. تبلیغی جماعت کے سالانہ اجتماعات کہاں ہوا کرتے تھے؟

(a). نوح (b). میوات (c). لکھنؤ (d). دہلی

5. درج ذیل میں سے تبلیغی جماعت کے اصولوں میں کیا شامل نہیں ہے؟

(a). نماز (b). اکرام مسلم (c). تبلیغ ودعوت (d). مشورہ

6. امیر ثالث مولانا انعام الحسن کاندھلوی کی امارت کا دورانیہ کیا تھا؟

(a). 1970-1997ء (b). 1960-1992ء (c). 1965-1995ء (d). سب غلط

7. درج ذیل تبلیغی جماعت کے امیروں کی کون سی ترتیب درست ہے؟

(a). محمد الیاس، محمد انعام الحسن، محمد یوسف (b). محمد یوسف، محمد الیاس، محمد انعام الحسن

(c). محمد الیاس، محمد یوسف، محمد انعام الحسن (d). سب غلط

8. 1995ء میں تشکیل دی گئی سہ رکنی مجلس شوریٰ میں مولانا محمد اظہار الحسن اور مولانا محمد زبیر الحسن کے ساتھ تیسرے فرد کون تھے؟

(a). مولانا محمد سعد (b). مولانا محمد عمر پالن پوری (c). حاجی محمد عبدالوہاب (d). مفتی زین العابدین

9. عوام کے علم کے نصاب میں کیا داخل نہیں ہے؟

(a). فضائل نماز (b). حکایات صحابہ (c). قرآن کریم (d). کتاب الفتن کا مطالعہ

10. تبلیغی جماعت کے کل اصول کتنے ہیں؟

(a). آٹھ (b). چھ (c). پانچ (d). دس

6.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. ترکی میں اسلامی بیداری کا تاریخی پس منظر بیان کیجیے۔
2. ترکی میں سیکولرزم کے ذریعہ اسلامی بنیادوں کے خاتمہ پر روشنی ڈالیے۔
3. ترکی میں اسلامی بیداری میں رسائل نور کی اہمیت پر نوٹ تحریر کیجیے۔
4. کثیر جماعتی نظام سیاست نے اسلامی بیداری میں کیا اثر ڈالا بیان کیجئے۔

5. رجب طیب اردگان اور ان کی خدمات کا جائزہ لیجئے۔

6.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. شیخ سعید بدیع الزماں نورسی اور ترکی میں اسلامی بیداری پر مضمون لکھیے۔
2. نجم الدین اربکان کے ذریعہ ترکی میں اسلامی بیداری کی تخم کاری پر مضمون لکھیے۔
3. ترکی میں احیائے اسلام کا عمومی جائزہ لیجیے۔

6.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد

.1	ترکی میں مشرق ومغرب کی کشمکش	:	از، خالدہ ادیب خانم، کمتبہ جامعہ لیمٹیڈ، نئی دہلی
.2	جدید ترکی	:	از، اطہر علی بی اے، منشی نول کشور، لکھنؤ
.3	جدید ترکی	:	از، مولانا صدیق حسن پبلیشر سلطان حسین، بھنڈی بازار، ممبئی
.4	جدید ترکی، جنگ عظیم اول سے 20ویں صدی تک	:	از، ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر، قرطاس، کراچی
.5	ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ	:	از، ثروت صولت، اسلامک پبلی کیشنز لمٹیڈ، لاہور
.6	دولت عثمانیہ اور ترکی کی تاریخ	:	از، مولانا عتیق احمد بستوی، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ

اکائی 7: جدید ایران (مغربی تہذیب کے اثرات)

اکائی کے اجزا:

7.0 تمہید

7.1 مقاصد

7.2 ایران: دور جدید کی طرف پیش قدمی

7.3 قاجار خاندان کی حکومت

7.3.1 قاجار خاندان کا تاریخی تناظر

7.3.2 سیاسی ڈھانچہ اور حکمرانی

7.3.3 سماجی واقتصادی حالات

7.3.4 ثقافتی ترقیات

7.3.5 قاجار اتھارٹی کولاحق خطرات

7.3.6 آئینی انقلاب

7.3.7 مذہبی رہنما اور سماجی تبدیلی

7.4 پہلوی دور حکومت

7.4.1 طاقت کی مرکزیت

7.4.2 معاشی اصلاحات

7.4.3 سماجی اصلاحات

7.4.4 علم وادب کا رجحان وترقی

7.4.5 قومیت اور شناخت

7.4.6 مغرب سے مرعوبیت

7.4.7 چیلنجز اور مخالفت
7.4.8 دوسری جنگ عظیم اور ایران کی دستبر داری
7.5 ایران میں مغربی تہذیب اور اس کے اثرات: قاجاری اور پہلوی حکومت کا تقابلی مطالعہ
7.5.1 گورننس اور سیاسی ڈھانچہ
7.5.2 جدیدیت اور اصلاح
7.5.3 ثقافتی شناخت اور قوم پرستی
7.5.4 غیر ملکی تعلقات
7.5.5 سماجی تبدیلیاں
7.6 بیسویں صدی میں واقع تبدیلیوں کی جھلک
7.6.1 ریاستی ڈھانچے میں تبدیلی
7.6.2 لسانی تبدیلیاں
7.6.3 مذہبی وفکری تبدیلی
7.7 اکتسابی نتائج
7.8 نمونہ امتحانی سوالات
7.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
7.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
7.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
7.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

7.0 تمہید

ایران کی تاریخ میں بیسویں صدی ایک اہم دور کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس دور میں ملک ایران میں زبردست تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ایرانی سماج نے دیہی معاشرے سے ایک صنعتی معاشرہ کارخ اختیار کرلیا۔ اس اکائی میں ان تبدیلیوں کی تفصیلات فراہم کی جائے گی

تا کہ ہم ایران کی جدید تاریخ، سیاست اور معاشرے کی پیچیدگیوں کو سمجھ سکیں۔

اس صدی کے آغاز میں، ایران کی زیادہ تر آبادی زراعت سے وابستہ تھی لیکن صنعتی ترقی کے زیر اثر اسٹیل ملز اور آٹو موبائل کی صنعتیں ابھر کر سامنے آئیں۔ حکومت نے مختلف پالیسیوں کے ذریعے ملک کی تشکیل نو کی، جس نے معیشت، ماحول، ثقافت اور سماجی ڈھانچے پر گہرا اثر ڈالا۔ اس اکائی میں سامراجی مداخلت، تیل کی دریافت اور مختلف سیاسی حکومتوں کے اثرات کا بھی جائزہ لیا جائے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ علماء کا کردار بھی اہم ہے، جو مذہبی اور قانونی معاملات میں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس اکائی میں جدید ایران کی تاریخ کے حوالے سے قاجار خاندان اور پہلوی دور کا احاطہ کیا گیا ہے۔ تا کہ ہم جدید ایران کی تاریخ کی ایک مکمل تصویر پیش کر سکیں۔

7.1 مقاصد

ایران میں بیسویں صدی کی تبدیلی کو سمجھنا:

ایران کے دیہی معاشرے سے ایک صنعتی اور اہم ملک بننے کے سفر کو سمجھنا۔

ریاست کے کردار کا مطالعہ کرنا:

یہ دیکھنا کہ حکومت نے کیسے مختلف پالیسیوں اور اقدامات سے ایران کی تشکیل نو کی اور معیشت، ثقافت اور سماجی ڈھانچے پر کیا اثر ڈالا۔

بیرونی اثرات کا جائزہ لینا:

سامراجی مداخلت، نو آبادیاتی دور، سرد جنگ اور تیل کی دریافت جیسے عوامل کے ایرانی سماج پر اثرات کو جانچنا۔

ریاست اور معاشرے کے تعلقات کا تجزیہ کرنا:

ایران میں حکومت اور سماجی گروہوں کے درمیان تعلقات کی نوعیت اور عوام کی جدوجہد اور انقلابی طاقت کو سمجھنا۔

7.2 ایران: دور جدید کی طرف پیش قدمی

ایران میں بیسویں صدی میں کس طرح کی تبدیلیاں رونما ہوئیں؟ ایسی ہمہ جہت تبدیلی جس نے ملک کو دیہی شناخت سے مشرق وسطیٰ کے ایک اہم ملک کی حیثیت تک پہنچایا۔ اس سوال کو سمجھنے کے لئے جدید ایرانی تاریخ، سیاست اور معاشرے کی پیچیدگیوں کو سمجھنا لازم ہے۔

جدید ایران کا سفر بیسویں صدی پر محیط ہے۔ اس صدی کے آغاز اور اس کے اختتام میں ایرانی سماج میں واضح تبدیلیاں نمایاں ہوئیں۔ انیسویں صدی اولین دہائیوں میں ایران بنیادی طور پر دیہی شناخت رکھتا تھا۔ ملک کی زیادہ تر آبادی زراعت کے پیشے سے وابستہ تھی۔

لوگ لکڑی کے ہل اور بیل جیسے روایتی اوزار استعمال کرتے تھے۔ تاہم صدی کے اختتام تک ایران میں اسٹیل ملز اور آٹوموبائل کی بڑھتی تعداد نمایاں صنعتی تبدیلی کی تصویر پیش کرتی ہے۔ یہ تبدیلی صرف اقتصادی نہیں تھی بلکہ اس میں سماجی، ثقافتی اور سیاسی تبدیلیاں بھی شامل تھیں۔ یہ ہمہ جہت تبدیلی اس بات کی عکاسی کرتی ہے کہ معاشرہ کن بنیادوں پر جدید دور کی طرف بڑھتا گیا۔

اس تبدیلی میں حکومت کا مرکزی کردار رہا ہے۔ ریاست نے مختلف پالیسیوں اور اقدامات کے ذریعے ملک کی تشکیل جدید کا کام انجام دیا۔ جدید ایران کے مطالعہ میں ریاست پر توجہ مرکوز کرنا اس لئے بھی ضروری ہے کیونکہ ریاست کے اقدامات نے نہ صرف معیشت بلکہ ماحولیات، ثقافت اور سماجی ڈھانچے کو بھی بڑے پیمانے پر متاثر کیا ہے۔ ریاست کی توسیع میں کئی ایک سوچے سمجھے اقدامات کیے گئے تھے لیکن دیگر حالات جیسے کہ احتجاجی تحریکیں اور سیاسی انقلابات، غیر متوقع تھے جنہوں نے مزاحمت کو جنم دیا۔

جدید ایران کی بحث کو تاریخی تناظر میں دیکھنا بھی ضروری ہے۔ جس میں عالمی منظر نامے پر سامراجی مداخلت، تیل کی دریافت اور مختلف سیاسی حکومتوں کا عروج وزوال شامل ہے۔ غیر ملکی طاقتوں کے اثر ورسوخ، خاص طور پر نوآبادیاتی اور سرد جنگ کے ادوار میں ایران کے سماجی وسیاسی منظر نامے پر دیرپا اثرات مرتب ہوئے۔ ایرانی معاشرے کی اندرونی حرکیات کو سمجھنے کے لئے ان بیرونی اثرات کو سمجھنا ضروری ہے۔

جدید ایرانی تاریخ میں علماء اور مذہبی اسکالرز کا کافی اثر ورسوخ رہا۔ جو مذہبی اور قانونی دونوں معاملات میں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ بنیادی طور پر مذہبی اداروں کے مالیات کے انتظام، مساجد اور اسکولوں کی دیکھ ریکھ اور معاشرتی اصلاح میں ان کی کارکردگی نظر آتی ہے۔ مذہبی معاملات میں رہنما (معراجِ تقلید) اور امام کے نمائندے (نائبِ امام) کے طور پر وہ معاشرے میں ایک مضبوط اور اہم ترین حیثیت رکھتے ہیں۔ ساتھ ہی ملکی امور سے بھی انہوں نے خود کو الگ نہیں رکھا۔ اس لحاظ سے علماء اور حکومت کے درمیان تعلقات کی پیچیدگی بھی نظر آتی ہے۔ بعض اوقات علماء نے حکومت کی حمایت کی اور بعض دفعہ حالات کے پیشِ نظر اس کی مخالفت کی۔ خاص طور پر 1979ء کے انقلاب جیسے بڑے واقعہ کے دوران علماء نے پہلوی حکومت کی مخالفت کے لئے عوام کی رائے ہموار کرنے اور انہیں اکٹھا کرنے میں مرکزی کردار ادا کیا۔

اس تاریخ میں ریاست اور معاشرے کے درمیان تعلقات کی نوعیت اور باریکی کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔ جدید ایران میں حکومت کی بنیاد نہ صرف اختیارات اور طاقت رہی بلکہ اس کا سماج سے گہرا ربط رہا۔ اس قریبی تعلق نے ایک منفرد سیاسی کلچر کو جنم دیا ہے جہاں ریاست بیک وقت ترقی کا محرک بھی رہی اور تنازعات کی جڑ بھی رہی۔ اشرافیہ، دانشوران اور متوسط طبقے سمیت مختلف سماجی گروہوں نے اقتدار کے لئے مسلسل جدوجہد کی۔ جو ایرانی معاشرے کے اندر متنوع اور مختلف مفادات کی عکاسی کرتے ہیں۔

ایرانی عوام کی قوت کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے جنگوں، انقلابات اور سماجی تبدیلیوں سے بھری ایک صدی میں اپنا کردار ادا کیا ہے۔ ان چیلنجوں کے باوجود ایرانی عوام نے بڑی طاقت کا اور حالات کے مطابق خود کو ڈھالنے کی صلاحیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ ایک بات واضح رہے کہ جدید ایران کی پوری بحث کی جڑیں قاجار دور حکومت کے آخری زمانے سے جاکر ملتی ہیں۔

7.3 قاجار خاندان کی حکومت

قاجار خاندان کی حکومت کا زوال 1925ء میں ہوا۔ جدید ایران کی تاریخ میں قاجار حکومت کا آخری دور اہمیت کا حامل ہے۔ کیونکہ اسی دور میں اس نے روایتی طرز حکمرانی سے زیادہ مرکزی ریاستی ڈھانچے کی طرف منتقلی اختیار کی۔ اس دور حکومت میں قبل از اسلام ثقافتی ورثے کے احیاء کے ذریعہ قومی شناخت کے احساس کو فروغ ملا۔ اس دور میں حکومت قاجار نے اہم سیاسی چیلنجوں کا سامنا بھی کیا جس میں 1905ء-1911ء کا آئینی انقلاب اہم ہے۔ اس انقلاب نے جس نے بادشاہی طاقت کو محدود کرنے کی کوشش کی۔ اس دور میں برطانیہ اور روس کی غیر ملکی مداخلت بھی ہوئی۔ اس مداخلت نے ایران کی خود مختاری اور علاقائی سالمیت کو متاثر کیا۔ جب کہ سماجی و اقتصادی تبدیلیوں نے روایتی طرز زندگی کو تبدیل کر دیا اور ایک نئے متوسط طبقے (مڈل کلاس) کے ابھرنے کا باعث بنا۔ قاجار دور کی مطلق العنان حکمرانی اور مذہبی حکام کے ساتھ پیچیدہ تعلقات نے ملک کے مستقبل پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اس دور نے مستقبل کی آمرانہ حکومتوں کی حالت اور اسلام پسندوں کے سیاسی اقدامات کی راہیں ہموار کیں۔ یہ دور سیاسی، سماجی، اقتصادی حرکیات اور مختلف سماجی گروہوں کے رد عمل کو بھی اجاگر کرتا ہے۔ قاجار دور کا یہ باب معاصر ایرانی سماج اور سیاست کی تاریخی جڑوں کو سمجھنے میں ایک لازمی جز بن گیا۔

7.3.1 قاجار خاندان کا تاریخی تناظر

قاجار خاندان ایران کے وسیع تر تاریخی تناظر کا حصہ ہے۔ قاجار، صفوی خاندان کے زوال کے بعد اقتدار میں آئے، جس نے شیعہ مذہب کو ریاستی مذہب کے طور پر قائم کیا۔ قاجار حکمرانوں نے ابتداء میں قبائلی رہنماؤں کے ذریعہ اپنی طاقت کو مستحکم کرنے اور ایک مرکزی ریاست قائم کرنے کی کوشش کی۔ آخری دور میں قاجار خاندان کو بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑا جس نے حکومت کو کمزور کر دیا۔ ملک کے اندر خاندانی قبائلی دشمنیوں، علاقائی آزادی کی کوششوں اور مختلف سماجی گروہوں کے مطالبات کے تنازعات نے مرکزی حکومت کی طاقت کو کم کر دیا۔ قاجار حکومت ان اندرونی چیلنجز سے نمٹ بھی نہ پائی تھی کہ غیر ملکی مداخلت خاص طور پر روس اور برطانیہ کی مداخلت نے اسے مزید خراب کر دیا۔ اس مداخلت نے نہ صرف حکومت کو کمزور کیا بلکہ غیر منصفانہ معاہدوں پر بھی مجبور کیا جس سے ملک کی سالمیت کو خطرہ لاحق ہوا۔ قابل ذکر تنازعات میں سے ایک روس-فارس جنگ (1826ء-1828ء) تھی۔ اس جنگ کا خاتمہ 1828ء میں ترکمانچائے کے معاہدے کے ساتھ ہوا۔ اس معاہدے نے ایران کو جنوبی قفقاز کے اہم علاقوں بشمول جدید دور کے آرمینیا اور آذربائیجان کے کچھ حصے دینے پر مجبور کیا۔ قاجار ریاست کے وسائل اور اختیار پر مزید دباؤ ڈالتے ہوئے بھاری مالی معاوضے لگائے گئے۔ ایک واقعہ اینگلو-فارسی جنگ (1856ء-1857ء) ہے۔ جس کا اختتام پیرس کے معاہدے 1857ء میں ہوا۔ اس معاہدے نے نہ صرف ہرات پر برطانوی کنٹرول کو مان لیا بلکہ ایران کو برطانوی ہندوستان (جب ہندوستان میں برطانیہ قابض تھا) اور روسی علاقوں کے درمیان ایک مخلوط ریاست کے طور پر بھی پیش کیا۔ ایران کی خود مختاری کو محدود کیا اور ملکی معاملات میں غیر ملکی اثر و رسوخ کو مزید بڑھایا۔ ان معاہدوں کا نفاذ، جن پر اکثر دباؤ کے تحت دستخط کیے جاتے تھے، قاجار خاندان کی کمزور پوزیشن کی واضح مثال ہے۔ ان واقعات کے زیر اثر ایرانیوں میں یہ تاثر پیدا ہوا کہ ان کی حکومت غیر ملکی طاقتوں کے تابع ہے۔ علاقائی سالمیت اور خود مختاری کو لاحق خطرات نے عوام میں بڑے پیمانے پر عدم اطمینان پیدا

کر دیا۔ جس کے زیر انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں قاجار حکومت نے جدید اصلاحات کی طرف قدم بڑھایا۔ حکومت کو جدیدیت کی ضرورت اس وقت محسوس ہونے لگی جب ایران کے ارد گرد کی دنیا تیزی سے بدل رہی تھی۔ قاجار حکومت نے مغربی ممالک سے تعلقات استوار کرنے کے لئے اپنی انتظامیہ، فوجی طاقت اور بنیادی ڈھانچے کو بہتر بنانے کے لئے جدوجہد شروع کر دی۔ اس گہما گہمی نے وسیع پیانے پر سیاسی تبدیلی کی راہ ہموار کر دی۔ جس کا نتیجہ بالآخر 1905ء-1911ء کے آئینی انقلاب کی صورت میں نکلا۔

7.3.2 سیاسی ڈھانچہ اور حکمرانی

قاجار حکومت کا سیاسی ڈھانچہ روایتی طرز اور جدید کوششوں کے امتزاج تھا۔ شاہ بیک وقت سیاسی رہنما اور مذہبی شخصیت دونوں رکھتا تھا۔ قاجار حکومت نے اپنے کنٹرول کو برقرار رکھنے کے لئے اپنی سرپرستی قائم رکھی۔ جس کے تحت مختلف علاقوں میں اپنے اختیارات کو نافذ کرنے کے لئے مقامی اشرافیہ اور قبائلی رہنماؤں پر انحصار کیا۔

7.3.3 سماجی و اقتصادی حالات

ایران کے سماجی و اقتصادی حالات بڑی حد تک زراعت پر مبنی تھے۔ آبادی کا ایک بڑا حصہ کھیتی باڑی میں مصروف تھا۔ ایرانیوں کی اکثریت دیہی علاقوں میں رہتی تھی جو اپنی روزی روٹی کے لئے زراعت پر انحصار کرتے تھے۔ وہ کاشتکاری کے روایتی طریقوں کو استعمال کرتے تھے۔ جس میں گندم، جو اور چاول جیسی فصلیں اہم ہیں۔ تاہم آخری دور حکومت میں معیشت کو جدید زرعی تکنیکوں اور بنیادی ڈھانچے کی کمی نے بھی نشان زد کیا، جس نے پیداواری صلاحیت اور اقتصادی ترقی کو محدود کر دیا۔

اس عرصے میں غیر ملکی تجارت نے ایرانی معیشت کو بنانے میں غیر معمولی کردار ادا کیا۔ جس میں برطانیہ اور روس کے ساتھ تجارت قابل ذکر ہے۔ قاجار حکومت کے محل وقوع نے اسے تجارتی راستوں کا مرکز تو بنایا لیکن اس نے ایران کو اقتصادی ذرائع سے لاحق حکومتی خطرات کے سامنے بھی لا کھڑا کیا۔ معاہدہ ترکمانچا (1828) اور معاہدہ پیرس (1857) کے نتیجے میں نہ صرف علاقائی نقصان ہوا بلکہ منڈیوں اور بازاروں کو غیر ملکی اشیاء کے لئے کھول دیا گیا۔ جس سے یورپی مصنوعات کی آمد شروع ہوئی۔ برطانوی اور روسی تاجروں کا تجارت پر غلبہ تھا، جو اکثر مقامی صنعتوں کو نقصان پہنچاتا تھا۔ غیر ملکی مراعات اور سہولیات کی آمد نے ملک کے معاشی انحصار کو مزید بڑھا دیا۔ مثال کے طور پر، برطانوی صنعتوں نے تمباکو کی صنعت جیسے اہم شعبہ پر کنٹرول حاصل کر لیا۔ جس کے نتیجے میں 1891ء-1892ء تمباکو پروٹسٹ کا آغاز ہوا، جہاں ایک برطانوی کمپنی کو دی گئی اجارہ داری اور عوام کے استحصال کے خلاف بڑے پیانے پر عوامی مخالفت پیدا ہوئی۔ اس احتجاج نے مقامی تاجروں اور کاریگروں کے درمیان ناراضگی کو اجاگر کیا۔ مزید برآں، یورپی سامان کے تعارف نے روایتی دستکاری اور مقامی پیداوار کو بھی متاثر کیا۔ کاریگروں اور مقامی صنعت کاروں نے یورپ سے سستی، بڑے پیانے پر تیار کی جانے والی اشیاء کے مقابلہ میں کمزوری محسوس کی۔ جس کی وجہ سے مقامی صنعتوں میں کمی واقع ہوئی۔ غیر ملکی طاقتوں پر معاشی انحصار نے ایرانی عوام میں ناراضگی کا احساس پیدا کیا، خاص طور پر تاجروں اور کاریگروں میں جو غیر ملکی اثر و رسوخ کو اپنی معاش اور ثقافتی شناخت کے لئے خطرہ سمجھتے تھے۔

بیسویں صدی کے اختتام تک، ایران میں غیر ملکی سرمایہ کاری تقریباً 60 ملین ڈالر تک پہنچ چکی تھی جو کہ اہم ہونے کے باوجود، ایرانی معیشت پر بے لگام غیر ملکی کنٹرول کو ظاہر کرتی ہے۔ زرعی انحصار، غیر ملکی استحصال، اور مقامی عدم اطمینان کے اس معاشی منظر نامے نے آئینی انقلاب کے دوران ابھرنے والی وسیع تر سماجی و سیاسی تحریکوں کے لئے راہیں ہموار کیں۔ کیونکہ ایرانیوں نے اپنی معاشی خود مختاری کا دوبارہ دعویٰ کیا۔

7.3.4 ثقافتی ترقیات

قاجار دور میں ادب، فن اور فن تعمیر کے شعبہ میں پیش رفت ہوئی۔ فارسی شاعری کو فروغ ہوا ساتھ ہی فارسی ادب کے سلسلہ میں نئی ادبی روایات بھی قائم ہوئیں۔ جو روایتی فارسی ورثہ اور جدیدیت دونوں کی عکاسی کرتی ہے۔ اسی زمانے میں مرزا غلام حسین فارسی اور سید علی اکبر دہخودا جیسے قابل ذکر شاعر ابھرے۔ غزل اور مثنوی جیسی نئی ادبی صنفوں نے مقبولیت حاصل کی۔ جس میں محبت، تصوف اور سماجی مسائل کے موضوعات کو تلاش کیا گیا۔ اس دور میں نثری ادب کی ترقی ہوئی، اس حوالے سے جلال احمد اور صادق ہدایت کے نام نمایاں ہیں۔ اس دور میں فن کو بھی فروغ ملا۔ خاص طور پر مصوری میں جہاں محمد غفاری (کمال الملک) جیسے فنکاروں نے روایتی طریقوں کو مغربی طرز کے ساتھ ملایا۔ فوٹوگرافی، جو ناصر الدین شاہ کے دور میں متعارف کرائی گئی، نے بصری فنون کو ایک جدید طرز پر ڈھالا۔ اسے ایک سیاسی ٹول کے طور پر بھی استعمال کیا گیا۔ قاجار حکمرانوں نے تہران میں گلستان محل جیسی متاثر کن عمارتیں تعمیر کیں، جس میں ٹائلوں کو استعمال کرکے عمارتوں کو مزین کیا گیا اور خوبصورت باغات قائم کئے جو ایک باوقار آرٹ ہے۔ ایران کے قومی عجائب گھر اور تہران گرینڈ بازار جیسی عوامی عمارتیں بڑھتے ہوئے شہروں کے تحت بنائی گئی۔ 1851ء میں قائم ہونے والے دارالفنون جیسے ثقافتی اداروں نے سائنس اور فنون میں جدید تعلیم کی حوصلہ افزائی کی۔ ثقافت میں اس پیش رفت نے نہ صرف قاجار کے عزائم کو ظاہر کیا بلکہ 20ویں صدی کے ایران کی ثقافتی تحریکوں کی تشکیل میں بھی مدد کی۔

7.3.5 قاجار اتھارٹی کو لاحق خطرات

قاجار حکومت کے بادشاہی انداز نے سیاسی و سماجی سطح پر بڑے مسائل پیدا کئے۔ خاص طور پر دانشوروں اور شہری متوسط طبقے کے درمیان بڑھتے ہوئے قوم اور وطن کی سالمیت کے جذبات نے اسے مزید ہوا دی۔ مرزا ملکوم خان جیسے کلیدی مصلحین نے 1880ء کی دہائی میں اپنے اخبار "کاوہ" کے ذریعے جمہوریت اور شہری حقوق کے بارے میں نظریات پھیلاتے ہوئے جدیدیت اور آئین سازی پر زور دیا۔ ایک اور بااثر شخصیت سید جمال الدین افغانی نے عالمی سطح پر وحدت اسلامی اور اصلاح کو فروغ دیا جس سے بہت سے لوگوں کو تبدیلی کے لئے تحریک ملی۔ آئین ساز اور سوشل ڈیموکریٹس جیسے سیاسی گروہوں نے آئین اور پارلیمنٹ سازی پر زور دیا۔ تاجروں اور علماء نے بھی کلیدی کردار ادا کیا، بازار سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا اور مذہبی رہنما آئین سازی کی حمایت کے لئے متحد ہو گئے۔ اس تحریک نے ایران کے سیاسی منظر نامے میں ایک اہم تبدیلی پیدا کی۔ جو قاجار طاقت کے زوال کی طرف پیش قدمی تھی۔

7.3.6 آئینی انقلاب

1905ء-1911ء کا آئینی انقلاب ایرانی تاریخ کا ایک بڑا واقعہ ہے۔ جو آمریت، معاشی بحران، اور غیر ملکی مداخلت کے خلاف عوامی رد عمل کے طور پر سامنے آیا۔ قاجار بادشاہت کے وارثین مظفر الدین شاہ اور محمد علی شاہ کے دور اقتدار میں ملک بد عنوانی، بد انتظامی اور بھاری غیر ملکی قرضوں میں دب گیا۔ مہنگائی اور زیادہ ٹیکس جیسے معاشی مسائل نے متوسط طبقے اور تاجروں کو بری طرح متاثر کیا اور مایوسی میں اضافہ ہوا۔ غیر ملکی اثر و رسوخ خاص طور پر 1907 کا اینگلو-روسی معاہدہ اور 1890ء کے "تمباکو کنسیشن" جیسی مراعات نے غیر ملکی کنٹرول کے خلاف مزاحمت کو ابھارا۔ 1905ء میں نئے ٹیکسوں کے خلاف مظاہروں کے نتیجے میں 1906ء میں پہلی قومی اسمبلی کی تشکیل ہوئی، جو پارلیمانی نظام کی جانب ایک اہم قدم تھا۔ قدامت پسندوں اور بادشاہت کی مخالفت کے باوجود، بشمول محمد علی شاہ کے ذریعہ اسمبلی کو تحلیل کرنے کی کوشش اور اس کے رد عمل میں انقلاب کے نتیجے میں 1906ء میں "ایران کا آئین" تشکیل پایا۔ یہ ایران کی جدید تاریخ اور جمہوریت اور آزادی کی لڑائی کا اہم ترین موڑ ہے۔

7.3.7 مذہبی رہنما اور سماجی تبدیلی

ریاست اور مذہبی رہنماؤں کے درمیان تعلق ایک مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ قاجار ریاست اور مذہبی رہنماؤں کے درمیان تعلقات پیچیدہ تھے۔ 19 ویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں خاص طور پر آئینی انقلاب کے دوران یہ پیچیدگی نمایاں طور پر ظاہر ہوئی۔ ناصر الدین شاہ اور مظفر الدین شاہ نے اپنی حکمرانی کو قائم رکھنے کے لئے شیعہ علماء کی حمایت پر انحصار کیا۔ انہیں مذہبی وقف (اوقاف) اور عدالتی نظم و نسق پر کنٹرول دیا۔ اس سے قاجار بادشاہت کو استحکام بر قرار رکھنے میں مدد ملی۔ تاہم، جیسے جیسے سماجی تبدیلیاں رونما ہوئیں، خاص طور پر متوسط طبقے کے عروج کے ساتھ، علماء نے اپنا اثر و رسوخ بڑھانا شروع کر دیا۔

تاہم ایک ایسا نیا متوسط طبقہ ابھرا جو جدید تعلیم اور مغربی نظریات سے متاثر ہوا، انہوں نے بادشاہت اور علماء کی روایتی طاقت دونوں کو چیلنج کرنا شروع کر دیا۔ مصلحین نے سیکولر اور مذہبی حکام کے درمیان تناؤ پیدا کرتے ہوئے جمہوریت اور سیاسی اصلاحات کی کوشش کی۔ اس پس منظر میں آیت اللہ خمینی اور سید محمد طباطبائی جیسے علماء نے سیاست میں زیادہ فعال کردار ادا کرنا شروع کیا، کچھ نے اصلاحات کی حمایت کی اور دوسروں کو خوف تھا کہ سیکولر تبدیلیاں حکومت میں اسلام کے کردار کو کمزور کر دیں گی۔ مرزا حسن شیرازی جیسے علماء کی قیادت میں 1891ء کے تمباکو پروٹسٹ نے غیر ملکی اثر و رسوخ کے خلاف رائے عامہ کو متحرک کرنے کی صلاحیت کو ظاہر کیا۔ آئینی انقلاب کے دوران، علماء منقسم تھے۔ کچھ نے انصاف اور اصلاح کی تحریک کی حمایت کی، جبکہ دوسروں کو خدشہ تھا کہ اس سے ان کی طاقت کم ہو جائے گی۔ اس تقسیم نے انقلاب کے دوران اور بعد میں ایران کے سیاسی منظر نامے پر اثر ڈالا۔ جس کے زیر اثر محمد علی شاہ نے نو تشکیل شدہ پارلیمنٹ کو تحلیل کرنے اور آئین سازوں کو دبانے کی کوشش کی۔ خلاصہ یہ کہ قاجار حکمران قانونی حیثیت کے لئے مذہبی رہنماؤں پر انحصار کرتے تھے لیکن سماجی تبدیلیاں اور سیاسی طور پر باشعور ہونے کے سلسلے میں علماء نے غیر معمولی کردار ادا کیا۔

محققین کا ماننا ہے کہ قاجار دور نے جدید ایران میں رونما ہونے والی سماجی، سیاسی اور ثقافتی پیش رفت کی بنیاد رکھی۔ اس دور میں اٹھنے

والے چیلنجز نے عوامی جدوجہد کو فروغ دیا جو بیسویں صدی کے اختتام تک جاری رہی اور پہلوی دور کی ابتداء اور 1979ء کے انقلاب پر منتج ہوئی۔

7.4 پہلوی دور حکومت

جدید ایران کی تاریخ میں رضا شاہ پہلوی سب سے نمایاں اور اہم نام ہے، جدید ایران کی تاریخ میں انیسویں صدی کے اوائل اور بیسویں صدی کے اواخر میں ایران کی سیاست عدم استحکام کا شکار تھی۔ یہی وہ دور تھا جس میں رضا شاہ پہلوی ایرانی سیاست میں بااثر فوجی شخصیت بن کر ابھرے۔ رضا خان نے فوجی بغاوت کی قیادت کی جس نے حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ 1925ء تک اس نے آخری قاجار بادشاہ احمد شاہ قاجار کو معزول کرنے کے لئے بھرپور طاقت حاصل کر لی اور حکمراں بن گیا۔ اس دور حکومت نے ایک مضبوط مرکزی حکومت تشکیل دی اور ملک کو جدید بنانے کے مقصد سے پرجوش اصلاحات کے ساتھ ایران میں ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ رضا شاہ نے 1925ء سے 1941ء تک ایران پر حکومت کی۔ اس نے جدید ایرانی معاشرے اور حکومت کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ اس نے پہلوی خاندان کی بنیاد رکھی اور روایتی قاجار بادشاہت سے زیادہ مرکزی اور جدید ریاست بنائی۔ اس دور میں حکومتی کردار، اصلاحی کوششوں اور معاشرے میں اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ بادشاہت ایک دستور اور اسمبلی کے تحت تھی اور عہد قاجار کی طرح بادشاہ کے اختیارات لامحدود نہیں تھے۔ ان سب کے باوجود رضا شاہ کی آمد فوجی طاقت کے بل بوتے پر ہوئی اور اس نے بھی مصطفی کمال اتاترک کی طرح آمرانہ حیثیت اختیار کر لی۔ رضا شاہ نے ملک کی اصلاحات پر خصوصی توجہ کی البتہ اس میں اس کی مرضی کا ہی مکمل عمل دخل تھا۔ ان ترقیاتی کاموں کی بدولت ملک کو فائدہ بھی پہنچا اور اس آمرانہ مزاج اور پالیسیوں کی وجہ سے نقصان بھی ہوا۔ البتہ محققین کا ماننا ہے کہ تمام تر کمزوریوں کے ساتھ رضا شاہ پہلوی جسے ایرانی "رضا شاہ کبیر" کہتے ہیں، کا دور ملکی مفاد اور ترقی کی طرف اہم پیش قدمی سے مزین ہے۔ رضا شاہ نے ملک سے بدامنی کا خاتمہ کرتے ہوئے باغیوں کو کنٹرول کیا اور پورے ایران میں ایک مضبوط مرکزی حکومت قائم کر دی۔ رضا شاہ کا دور وہی دور ہے جب عالمی سطح پر زبردست سیاسی ہلچل رہی۔

7.4.1 طاقت کی مرکزیت

رضا شاہ کے اہم مقاصد میں سے ایک طاقت کو مرکزی بنانا اور قبائلی رہنماؤں اور علاقائی گورنروں کے اثر و رسوخ کو کم کرنا تھا۔ رضا کا خیال تھا کہ ایران کی جدیدیت کے لئے ایک مضبوط ریاست ضروری ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے، اس نے کئی انتظامی اصلاحات کیں، جن میں ایک جدید بیوروکریسی کا قیام، قومی پولیس فورس کی تشکیل، اور فوج کی تنظیم نو شامل ہے۔

رضا شاہ کا مقصد علماء اور اشرافیہ کی طاقت کو کم کرنا تھا جو طویل عرصے سے ایرانی معاشرے پر اپنا اثر و رسوخ رکھتے تھے۔ اس نے ریاست کو سیکولر بنانے اور عوامی زندگی میں مذہبی اثر کو کم کرنے کے لئے پالیسیاں نافذ کیں۔ اس میں سیکولر تعلیمی نظام کا قیام اور مغربی طرز کی قانونی اصلاحات متعارف کرانا شامل تھا۔ رضا کے سب سے متنازعہ اقدامات میں سے ایک 1936ء کا قانون تھا جس میں حجاب پر پابندی

عائد کی گئی تھی۔ اس کے تحت خواتین کو عوامی جگہوں پر نقاب لگانے پر پابندی عائد کر دی گئی۔ جو جدیدیت اور سیکولرازم کے تئیں اس کی گہری وابستگی کی عکاسی کرتا ہے۔

7.4.2 معاشی اصلاحات

رضا شاہ نے اپنے دور اقتدار میں ترقیاتی کاموں کی طرف توجہ دی۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ معیشیت میں جدید اصلاحات ایک مضبوط ریاست کے لئے ضروری ہے، رضا شاہ نے ایران کو صنعتی بنانے اور غیر ملکی طاقتوں پر انحصار کم کرنے کے لئے کئی اقتصادی اصلاحات شروع کیں۔ صنعتی ترقی، تجارتی سہولیات اور عوام کی آسانی کے لئے ایک شہر سے دوسرے شہر تک پختہ سڑکوں کا جال بچھایا گیا۔ خلیج فارس سے بحیرہ خضر تک ساڑھے آٹھ سو میل لمبی ریلوے لائن بچھائی گئی اور ہفتوں کے سفر کو چند دنوں میں طے کیا جانے لگا۔

شمال میں واقع گیلان کے علاقے میں پہلی مرتبہ چائے کی کاشت شروع ہوئی۔ ایران میں صنعتی ترقی کی داغ بیل پڑی۔ کپڑے، شکر اور دیگر اشیاءِ خورد و نوش کے کارخانے قائم ہوئے۔ رضا شاہ کی حکومت نے ریاستی زیر قیادت اقدامات، فیکٹریاں بنانے اور خاص طور پر مغربی ممالک سے غیر ملکی سرمایہ کاری کو فروغ دیا اور صنعت کاری پر توجہ دی۔ مزید بر آں، اس نے بڑھتے ہوئے صنعتی شعبے کے لئے ایک ہنر مند افرادی قوت تیار کرنے کے لئے تعلیم اور پیشہ ورانہ تربیت میں بھی سرمایہ کاری کی۔

7.4.3 سماجی اصلاحات

رضا شاہ کے جدید ایران کے ویژن میں معاشرے کی تبدیلی شامل تھی۔ رضا کی حکومت نے خواتین کی حیثیت کو بہتر بنانے، تعلیم کو فروغ دینے اور قومی شناخت کو فروغ دینے کے لئے سماجی اصلاحات متعارف کروائیں۔ عوام میں تعلیم اور اسکولوں و یونیورسٹی کی کمی کے سبب اس دور میں تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دی گئی۔ تہران شہر میں یونیورسٹی کا قیام اس ضمن میں تاریخی واقعہ ہے۔ یونیورسٹیوں اور تعلیمی اداروں کے قیام کی بدولت اعلی تعلیم کی راہیں ہموار ہوئیں۔ جس کے زیر اثر ایرانی طلبہ کو انجینئرنگ، قانون، زراعت، طب، سائنس اور دوسرے جدید علوم کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے یورپ کے ملکوں میں بھیجا گیا۔

ایک اہم سماجی اصلاح خواتین کے حقوق کا فروغ تھا۔ رضا شاہ کا خیال تھا کہ خواتین کی ترقی قومی ترقی کے لئے اہم ہے۔ اس نے لڑکیوں کے اسکول قائم کیے اور خواتین کو افرادی قوت میں شامل ہونے کی ترغیب دی۔ 1935ء کے خاندانی تحفظ کے قانون کا مقصد شادی اور طلاق میں خواتین کے حقوق کو بہتر بنانا تھا، جو صنفی مساوات کی طرف ایک قدم کے طور پر دیکھا گیا حالانکہ اسے مذہبی گروہوں کی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

رضا شاہ کے لئے تعلیم ایک اور توجہ کا مرکز تھی۔ اس نے جدید نصاب کے ساتھ سیکولر تعلیم کو فروغ دینے کے لئے اسکولوں اور یونیورسٹیوں کا ایک نیٹ ورک بنایا۔ 1934ء میں تہران یونیورسٹی کا قیام ایک تاریخی کارنامہ تھا، جس نے ایرانیوں کو اعلیٰ تعلیم کے مواقع فراہم کیے اور دانشوروں اور پیشہ ور افراد کی نئی نسل کی پرورش کی۔ تہران کے ساتھ ساتھ بڑے شہروں جیسے مشہد، اصفہان، شیراز، تبریز

اور اہواز میں بھی یونیورسٹیاں قائم کی گئیں۔ دارالحکومت تہران میں یونیورسٹی کے علاوہ آریامہر یونیورسٹی آف ٹیکنالوجی بھی قائم کی گئی جو انقرہ کی مل ایسٹ ٹیکنیکل یونیورسٹی کے نمونہ پر ہے۔ اس وقت ایران میں خواندگی کا تناسب چالیس فیصد تک پہنچ گیا ہے۔

7.4.4 علم وادب کا رجحان وترقی

تہران جو آبادی کے لحاظ سے کراچی اور قاہرہ سمیت مشرق وسطی کے تین سب سے بڑے شہروں میں سے ہے، ملک میں علم و ادب اور صحافت کا سب سے بڑا مرکز بن گیا۔ انقلاب سے ذرا قبل تک یہاں سے روزنامے اور اکیس ہفت روزہ اخبار شائع ہوتے تھے جو سب نجی ملکیت میں تھے۔ روزنامہ اطلاعات اور کیہان کی اشاعت ایک ایک لاکھ تھی۔ مشہد سے روزنامہ ”خراسان“ شائع ہوتا تھا جس کی اشاعت تین ہزار تھی۔ تمام اخبارات فارسی زبان کے ہیں۔ اخبار "کیہان "کا انگریزی ایڈیشن بھی شائع ہوتا تھا جس کی اشاعت پندرہ ہزار تھی۔ اخبارات اگرچہ آزاد تھے لیکن 1953ء کے قانون کے تحت کسی بھی اخبار کو مذہب یا بادشاہت پر تنقید کرنے فوجی معلومات کا انکشاف کرنے اور عوام کو فوج کے خلاف ورغلانے پر عدالت کے فیصلے کے بغیر بند کیا جا سکتا تھا۔ قانون کے تحت اخباروں کے لئے کم از کم تین ہزار اور رسالوں کے لئے پانچ ہزار اشاعت ضروری تھی۔ جو اخبار اور رسالے اس مقررہ حد کو پوری نہیں کر سکتے تھے وہ نہیں نکالے جا سکتے تھے۔ علمی اخبار اور رسالے اس پابندی سے آزاد تھے۔ ایران میں پہلوی دور میں جو فارسی ادب پیدا ہوا اس میں ناول، افسانے ڈرامے اور شاعروں پر اشتراکی اثرات کا غلبہ نظر آتا ہے۔ لیکن علمی اور تحقیقی میدان میں جن لوگوں نے کام کیا وہ یا تو آزاد خیال ہیں یا اسلامی رجحان رکھتے ہیں۔ ایران کے علمی وادبی تحقیق میں محمد علی فروغی، سعید نفیسی، محمد قزوینی اور فروزانظر کے نام قابل ذکر ہیں۔ شاعروں میں محمد تقی بہار متوفی 1951ء جو ملک الشعراء کہلاتے تھے، صادق سرد، پروین اعتصامی متوفی 1940ء اور لاہوتی متوفی 1957ء کے نام اہم ہیں۔ لاہوتی کمیونسٹ تھے اور فرار ہو کر تاجکستان چلے گئے تھے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ افسانہ نگاروں میں محمد حجازی محمد علی جمال زادہ عارف قزوینی متوفی 1934ء اور صادق ھدایت متوفی 1951ء کے نام قابل ذکر ہیں۔ جمال زادہ ڈرامہ نویس بھی تھے۔

7.4.5 قومیت اور شناخت

رضاشاہ کی حکومت نے قوم پرستی کے مضبوط احساس پر زور دیا۔ اس کا مقصد ایک متحد ایرانی شناخت بنانا تھا جو نسلی اور علاقائی تقسیم سے بالاتر ہو۔ ان کی کوششوں میں ایران کے قبل از اسلام ورثے پر زور دینے کے ساتھ ساتھ فارسی زبان اور ثقافت کو فروغ دینا بھی شامل تھا۔

1935ء میں، اس نے باضابطہ طور پر ملک کا نام فارس سے بدل کر ایران کر دیا۔ اس نے غیر ملکی اثرات کو کم کرنے کی بھی کوشش کی، خاص طور پر برطانیہ اور روس سے، جنہوں نے تاریخی طور پر ایرانی سیاست اور معیشت کو کنٹرول کیا تھا۔ اس قوم پرست ایجنڈے کے تحت بین الاقوامی سطح پر ایک جدید، طاقتور ایران کے تصور کو فروغ دیا۔ ایران میں آنے والے غیر ملکی باشندوں کو جو مراعات اور سہولیات دستیاب تھیں انہیں ختم کر دیا گیا۔ ان مراعات اور سہولیات کی وجہ سے ہی بیرونی طاقتوں کو تجارت، صنعت اور سیاحت کے راستے ایران کے اندرونی معاملات میں مداخلت کا موقع مل جاتا تھا۔

7.4.6 مغرب سے مرعوبیت

رضا شاہ مغرب سے بہت مرعوب تھا۔ اس نے سیکولر بنیادوں پر اصلاحات کی داغ بیل ڈالی جس میں مذہب مخالف رجحان پایا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ 1927ء میں ملک فرانس کا عدالتی قانون نافذ کیا گیا۔ 1928ء میں روایتی ایرانی لباس کی جگہ کوٹ پتلون کو لازم قرار دیا گیا۔ ساتھ ہی مغربی طرز پر پہلوی ٹوپی کا پہننا لازم کر دیا گیا۔ 1930ء سے ابتدائی اور ثانوی مدرسوں میں دینیات کی تعلیم لازمی نہیں رہی۔ 1935ء میں عورتوں کے پردہ پر پابندی عائد کر دی گئی اور مغربی لباس کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ 1930ء میں ہی ایک ایسی ادبی و علمی مجلس بنائی گئی جو فارسی زبان سے عربی کے الفاظ کو نکال کر فارسی زبان کو خالص کرے۔

7.4.7 چیلنجز اور مخالفت

ان اصلاحات کے باوجود رضا شاہ کو اپنے دور حکومت میں اہم چیلنجوں اور مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے آمرانہ طرز حکمرانی نے، جس میں سنسر شپ اور اختلاف رائے کا جبر شامل تھا، بہت سے لوگوں کو الگ کر دیا۔ علماء نے خاص طور پر اس کی سیکولرائزیشن کی پالیسیوں اور ان کی روایتی اتھارٹی کے خاتمے کی مخالفت کی۔

1941ء میں قائم ہونے والی کمیونسٹ تنظیم Tudeh پارٹی رضا شاہ کے بعد کے سالوں میں ایک اہم اپوزیشن قوت بن گئی۔ اس نے سماجی کارکنوں اور دانشوروں کو اپنی طرف متوجہ کیا جو حکومت کی آمریت اور سماجی عدم مساوات سے ناخوش تھے۔ رضا شاہ کی اختلاف رائے کو دبانے کی کوششوں نے صرف اپوزیشن کی تحریکوں کو ہوا دی، جس سے ملک میں بدامنی بڑھ گئی۔

7.4.8 دوسری جنگ عظیم اور ایران کی دستبرداری

رضا شاہ کا دور دوسری جنگ عظیم کے دوران اچانک ختم ہو گیا۔ اس نے جرمن حامیوں کے تحت ہمدردی ظاہر کی جس نے برطانوی اور سوویت حکومتوں کے لئے خطرے کی گھنٹی بجا دی۔ اگست 1941ء میں، برطانوی اور سوویت افواج نے ایران پر حملہ کیا جس کے نتیجے میں رضا شاہ کو 16 ستمبر 1941ء کو تخت سے دستبردار ہونا پڑا۔ ان کے بعد ان کا بیٹا محمد رضا پہلوی تخت نشین ہوا۔ جدید ایران میں رضا شاہ کا کردار پیچیدہ رہا۔ اگرچہ ایران کو جدید بنانے اور ایک مرکزی ریاست کو قائم کرنے کا سہرا اس کے سر باندھا جاتا ہے لیکن اس کی آمرانہ حکمرانی اور جابرانہ پالیسیوں کے ایرانی معاشرے پر دیرپا اثرات مرتب ہوئے۔ اس دور حکومت میں جدیدیت اور روایت، سیکولرازم اور مذہب اور قوم پرستی اور آمریت کے درمیان تنازعات نے سماج کو متاثر کیا۔

محققین کا ماننا ہے کہ رضا شاہ نے ایران کو انگریزوں کی غلامی سے بچالیا۔ لیکن ایرانی جمہوریت کو پنپنے نہیں دیا۔ وہ ایران کی آزادی تو چاہتا تھا لیکن ایرانیوں کی آزادی کا قائل نہیں تھا۔ رضا شاہ کے اکیس سالہ دور حکومت میں یہ تضاد صاف نظر آتا ہے۔ اس نے جاگیرداروں کو کوئی تکلیف نہیں دی تاکہ بادشاہت قائم رہ سکے۔ اس نے کسی بھی جمہوری آواز اور جماعت کو پنپنے نہیں دیا۔ اس کے دور میں اسمبلی تو قائم تھی لیکن اس میں جمہوری طرز کے بجائے شاہ کی بات کو تسلیم کیا جاتا تھا۔ قانون کے نظر میں سب لوگ برابر نہیں تھے نتیجہ یہ ہوا کہ

عدالتوں میں ناانصافیاں کی جاتی تھیں۔ حکومت کا نصف بجٹ فوج اور پولیس کے لئے وقف تھا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ فوج اور پولیس میں کام کرنے والوں کی حالت تو اچھی ہوگی لیکن حقیقتاً فوجیوں اور اہلکاروں کی تنخواہیں بہت کم تھیں۔ کسان پریشان حال تھے۔ بہت کم کسان تھے جو زمین کے مالک تھے۔ بقیہ تمام جاگیر داروں کے رحم و کرم پر تھے۔

بعض محققین کا ماننا ہے کہ سماجی سطح پر عورتوں کی آزادی اور تعلیم نسواں کے نعرے محض سطحی ترقی اور مغرب کی نقالی کی علامت تھے۔ اس دور میں ہٹلر کا غلغلہ تھا۔ رضا شاہ انگریزوں کا اثر کم کرنے اور اپنی طاقت بڑھانے کی غرض سے ہٹلر سے جاملا جس کے بعد حکومت میں فسطائی اثرات بڑھنے لگے۔ حکومت کے بہت سے محکموں میں نازی افسروں کا تقرر کیا گیا۔ جرمن کمپنیوں کو ایران میں کپڑے، شیشے اور دیگر اشیاء کے خرید و فروخت کی اجازت دے دی گئی۔ مارچ 1938ء میں رضا شاہ نے جرمن حکومت کو ہوائی اڈہ بنانے کی اجازت دے دی۔ خلاصہ کلام یہ کہ ایرانی حکومت کے کل پرزے انگریزی سامراجیت سے نازی جرمن طاقت کے ہاتھ میں جا پہنچے۔

رضا شاہ کے آخری دور میں یورپ میں دوسری عالمی جنگ چھڑ گئی۔ اور اگرچہ اس موقع پر ایران نے غیر جانبدار رہنے کا اعلان کر دیا تھا لیکن اتحادی ملکوں نے ایران کی اس غیر جانبداری کا احترام نہیں کیا۔ لہذا جب ہٹلر نے 1941ء کو سویت یونین پر حملہ کیا تو سویت یونین کے لئے ضروری ہو گیا کہ جنوبی سرحد پر قائم ایران سے اپنے نازی دشمنوں کو نکالے۔ اس ضمن میں سویت یونین نے 1921ء کے سویت-ایرانی معاہدہ کے مطابق ایران سے مطالبہ کیا کہ تمام نازیوں کو فوراً نظر بند کیا جائے ورنہ سویت یونین خود فوج کے ساتھ ایران میں داخل ہو جائے گی۔ دوسرا اہم پہلو یہ بھی ہے کہ جرمنوں کے مقابلے میں روس کو فوجی سامان فراہم کرنے اور امداد روانہ کرنے کے لئے ایران سے بہتر کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا، چنانچہ 25/ اگست 1941ء کو شمال سے روس نے وار جنوب سے برطانوی فوجوں نے بیک وقت ایران پر حملہ کر دیا، ایران اتنی بڑی طاقتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا اس لئے اس نے ہتھیار ڈال دئے۔

7.5 ایران میں مغربی تہذیب اور اس کے اثرات: قاجاری اور پہلوی حکومت کا تقابلی مطالعہ

قاجاری اور پہلوی خاندان ایران تاریخ میں دو الگ الگ ادوار کی نمائندگی کرتے ہیں، ہر ایک گورننس، معاشرے اور قومی شناخت میں نمایاں فرق کے ساتھ نشان زد ہے۔ یہاں دونوں کے درمیان مغربی تہذیب کے حوالے سے اہم فرق پیش کیا جارہا ہے:

7.5.1 گورننس اور سیاسی ڈھانچہ

قاجر خاندان: قاجار نے روایتی اور مطلق العنان طریقہ سے حکومت کی۔ اپنا کنٹرول برقرار رکھنے کے لئے مقامی رہنماؤں اور قبائلی سرداروں پر انحصار کیا۔ کوئی مضبوط مرکزی بیوروکریسی نہیں تھی۔ انہوں نے اپنی حکمرانی کو برقرار رکھنے کے لئے سماجی نابرابری کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔ جس کی وجہ سے عدم اتحاد اور مرکوز اختیارات کا فقدان پایا جاتا تھا۔

پہلوی خاندان: رضا شاہ اور اس کے بیٹے محمد رضا شاہ نے طاقت کو مرکوز کرنے کے لئے سخت محنت کی۔ انہوں نے قبائلی رہنماؤں کے اثر و رسوخ کو کم کیا اور ایک زیادہ منظم بیوروکریٹک ریاست قائم کی۔ پہلویوں نے ایک متحد قومی شناخت بنانے پر توجہ مرکوز کی جو علاقائی

اور نسلی اختلافات سے بالاتر ہو۔

7.5.2 جدیدیت اور اصلاح

قاجر خاندان: قاجار دور کے آخری دور میں جدید اصلاحات محدود تھیں۔ اصلاحات کی سب سے اہم کوشش آئینی انقلاب کے زیر اثر ہوئی۔ جس کا مقصد بادشاہ کے اختیارات کو محدود کرنا اور پارلیمانی نظام متعارف کرانا تھا۔ تاہم، ان اصلاحات کو مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا اور وہ صرف جزوی طور پر کامیاب رہیں۔

پہلوی خاندان: پہلویوں نے جدید اصلاحات کے ضمن میں مہماتی طریقہ اپنایا۔ رضا شاہ نے تعلیم، بنیادی ڈھانچے اور صنعت میں وسیع پیمانے پر اصلاحات متعارف کروائیں۔ اس نے ملک کو سیکولرائز کرنے اور مغربیت کو فروغ دینے کی کوشش۔ ان تبدیلیوں نے شہری اور جدید طرز زندگی کو فروغ دیا۔

7.5.3 ثقافتی شناخت اور قوم پرستی

قاجر خاندان: قاجاروں نے قومی شناخت کا احساس پیدا کرنے کے لئے ایران کے قبل از اسلام ثقافتی ورثے کو زندہ کرنے کی کوشش کی لیکن انہیں اکثر سماج سے کٹا ہوا پایا گیا۔ ضروری ترین اصلاحات نہ کرپانے کی وجہ سے سماج میں بے چینی نے جنم لیا۔

پہلوی خاندان: پہلویوں نے قوم پرستی، سیکولرازم اور جدیدیت پر زیادہ زور دیا۔ انہوں نے ایرانی شناخت کے احساس کو فروغ دیا جو مغربی نظریات اور جدیدیت سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ انہوں نے عوامی زندگی میں مذہب کے کردار کو کم کرنے اور زیادہ متحد قومی شناخت کو آگے بڑھانے کا کام کیا۔

7.5.4 غیر ملکی تعلقات

قاجر خاندان: قاجاروں نے غیر ملکی مداخلت کے ضمن میں برطانیہ اور روس سے جدوجہد کی۔ ایران نے ان غیر ملکی طاقتوں کے معاہدوں اور حملوں کی وجہ سے قاجار کے زیر انتظام کئی علاقے اور سیاسی کنٹرول کھو دیا۔ انہیں اکثر کمزور اور قوم کے مفادات کا تحفظ کرنے سے قاصر دیکھا جاتا تھا۔

پہلوی خاندان: پہلویوں نے، خاص طور پر رضا شاہ کے بیٹے محمد رضا شاہ نے عالمی سطح پر ایران کی آزادی کی وکالت کرتے ہوئے مغربی ممالک خاص طور پر امریکہ کے قریبی تعلقات استوار کیے۔ تاہم مغرب کے ساتھ گہرے تعلق کی وجہ سے ایران کے اندر مخالفت میں اضافہ ہوا۔ خاص طور پر غیر ملکی اثر و رسوخ سے ناراض مذہبی گروہوں نے اس کی قیادت کی۔

7.5.5 سماجی تبدیلیاں

قاجر خاندان: قاجار کے دور میں، سماجی ڈھانچے زیادہ تر قبائلی وابستگیوں اور مقامی طاقت پر منحصر تھے۔ وہاں سماجی نقل و حرکت بہت کم تھی اور روایتی شخصیات جیسے علماء اور قبائلی رہنما نمایاں اثر و رسوخ رکھتے تھے۔

پہلوی خاندان: پہلویوں کے دور میں شہروں میں اضافہ ہوا۔ متوسط طبقے میں اضافہ ہوا اور تعلیم اور افرادی قوت مزید مواقع پیدا ہوئے۔ تعلیم اور صحت کی دیکھ بھال میں رضا شاہ کی اصلاحات نے ایک جدید اور ترقی پسند معاشرے کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔

7.6 بیسویں صدی میں واقع تبدیلیوں کی جھلک

جیسا کہ ہم نے ذکر کیا کہ بیسویں صدی کے ایرانی سماج میں غیر معمولی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔

صدی کے اوائل میں ایران کی آبادی 12 ملین تھی جس میں 60 فی صدی دیہی، 20-30 فی صدی خانہ بدوش اور 15 فی صدی سے کم شہری آبادی تھی۔ آبادی کی متوقع عمر 30 سال تھی۔ بچوں کی شرح اموات کے سلسلے میں 1000 پر 500 جیسا افسوس ناک شمار ملتا ہے۔

صدی کے اختتام پر آبادی کی کل تعداد 69 ملین تک پہنچ گئی۔ خانہ بدوش آبادی کی تعداد 3 فی صدی تک سمٹ گئی۔ شہری شعبے میں 60 فی صدی تک کا اضافہ ہوا۔ آبادی کی متوقع عمر 70 سال ہو گئی۔ بچوں کی شرح اموات گھٹ کر 1000 پر 28 ہو گئی۔

صدی کے اوائل شرح تعلیم 5 فی صدی تھی جس میں مدارس کے فارغین، قرآنی اسکول اور مذہبی اداروں سے فارغین طلبہ شامل تھے۔ 50 فی صدی سے کم لوگ فارسی زبان سمجھتے تھے۔ عوام کے تفریح اور اجتماعی پروگراموں کے لئے کُشتی، شاہ نامے پڑھنا، شاہی جلوس، عوامی جگہوں پر سزا کا دیا جانا، ڈرامے اور شیعی مقدس مہینہ محرم میں آتش بازی شامل تھی۔

صدی کے اختتام پر شرح تعلیم 84 فی صدی تک پہنچ گئی۔ تقریباً 1 عشاریہ 6 ملین طلبہ اعلی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ دیگر 19 ملین پرائمری اور سیکنڈری اسکولوں میں زیر تعلیم تھے۔ 85 فی صدی آبادی فارسی زبان جاننے لگی۔ عوامی تفریح اور پروگراموں میں فٹ بال، فلمیں، ریڈیو، نیوز پیپر اور سب سے اہم ویڈیوز، ڈی وی ڈی اور ٹیلی ویژن نے جگہ بنالی۔

صدی کے اوائل میں گیس لائٹ، بجلی چند مخصوص لوگوں کو دستیاب تھی۔ وقت کا شاہ صرف موٹر سائیکل کا واحد مالک تھا۔ سڑکوں کی حالت اس قدر خراب تھی کہ تہران سے تبریز کا فاصلہ جو 350 میل پر مشتمل ہے، 14 دنوں میں طے کیا جاتا تھا۔

صدی کے اختتام پر ملک میں سڑکوں، بجلی کے سسٹم اور گیس کی حصولیابی نے قومی معیشت کو ترقی دی۔ ملک میں 10000 کلو میٹر پر مشتمل ریل لائن بچھائی جا چکی تھی۔ 59000 کلو میٹر پر محیط سڑکیں اور 2 عشاریہ 9 ملین موٹر سائیکلیں تھیں۔

جدید سماج میں لوگوں کی توجہات بھی تبدیل ہوئیں جس میں بے روزگاری، پینشن، گھر کی سہولیات، اولڈ ایج ہومس، آلودگی، تعلیمی سہولیات اور جدید زندگی کے ہنگامے ہیں۔ اس طرح ایران جدید دور میں داخل ہوا۔

7.6.1 ریاستی ڈھانچے میں تبدیلی

ایران کی جدید تاریخ میں ریاست اور اس کے ڈھانچے کی تبدیلی نمایاں تبدیلی ہے۔ یہ تبدیلی روایتی، بکھرے ہوئے سیاسی نظام سے مرکزی اور بیوروکریٹک ریاستی نظام کی طرف منتقلی ہے۔

1. مرکوز اقتدار

ریاست میں ایسا نظام تھا جہاں طاقت شاہ اور مختلف مقامی رہنماؤں، قبائلی سرداروں، اور مذہبی حکام کے درمیان تقسیم تھی۔ بعد میں اقتدار ایک جگہ مرکوز ہوا جس کے تحت حکومت کو پورے ملک پر زیادہ سے زیادہ کنٹرول حاصل ہوا، قومی پالیسیوں اور اصلاحات کے نفاذ میں سہولیات میسر آئیں۔

2. بیوروکریسی میں توسیع

صدی کے ابتداء میں شاہ کے تنظیمی ڈھانچے میں بنیادی طور پر شاہ اوراس کے چنندہ لوگ ہی(وزراء، خاندان)اور مقامی معززین (قبائلی سردار، زمیندار، علماء، دولت مند تاجر) شامل تھے۔ کوئی باقاعدہ بیوروکریسی یا فوج نہیں تھی۔ بعد از اں ریاست نے ایک زیادہ وسیع بیوروکریٹک ڈھانچہ تیار کیا، جو ایک جدید قومی ریاست کی پیچیدگیوں کو سنبھالنے کے لئے ضروری تھا۔ اس میں مختلف وزارتوں اور حکومتی اداروں کا قیام بھی شامل ہے جس میں حکومت کے مختلف پہلوؤں جیسے تعلیم، صحت اور ڈھانچہ کی نگرانی کا کام سونپا گیا ہے۔ ریاست نے ملک کی ہر سطح اور خطہ میں نمایاں طور پر توسیع کی جو بیس بڑی وزارتوں کے ساتھ ایک پیچیدہ بیوروکریٹک ڈھانچے میں تبدیل ہوا۔ ریاست نے 850,000 سے زیادہ سرکاری ملازمین کو ملازمت دی۔ یہ بیوروکریسی افرادی قوت میں پہلے کے دور کے مقابلے میں غیر معمولی اضافہ کو دکھاتا ہے۔

3. جدید کاری کی کوششیں

ریاست نے جدید کاری اور ترقی کو فروغ دینے میں فعال کردار ادا کیا، خصوصا پہلوی دور میں۔ اس میں صنعتوں کا قیام، بنیادی ڈھانچے کے منصوبہ بندی اور مغربی طرز تعلیم کے فروغ میں سرمایہ کاری شامل تھی۔ حکومت نے ایران کو ایک جدید قومی ریاست میں تبدیل کرنے کی کوشش کی تاکہ عالمی سطح پر نمایاں بن سکے۔

4. معاشرے پر کنٹرول

ریاست کی توسیع کے ساتھ، معاشرے کے مختلف پہلوؤں بشمول مذہب، تعلیم اور عوامی زندگی پر ریاستی کنٹرول میں بھی اضافہ ہوا۔ حکومت کا مقصد سماجی اصولوں اور طریقوں کو کنٹرول کرنا اور ان پر اثر انداز ہونا تھا جو اکثر روایتی حکام جیسے کہ علماء کے ساتھ تناؤ کا باعث بنتے رہے۔

5. شناخت پر اثر

ریاست کی تبدیلی کے قومی تشخص پر بھی اثرات مرتب ہوئے۔ جیسا کہ ریاست نے ایک متحد قومی شناخت کو فروغ دینے کی کوشش کی، اس کا اکثر مقامی اور علاقائی شناختوں سے ٹکراؤ ہوا، جس کے نتیجے میں قوم پرستی اور علاقائیت کے درمیان ایک پیچیدگی پیدا ہوئی۔

6. فوجی ترقی

صدی کے اوائل میں ایرانی ریاست کے پاس باضابطہ طور پر فوج کی کمی تھی اور وہ نظم و نسق بر قرار رکھنے کے لئے مقامی معززین، جیسے قبائلی سرداروں اور جاگیرداروں پر انحصار کرتی تھی۔ وہاں کوئی ٹھوس فوجی تنظیم یا بنیادی ڈھانچہ موجود نہیں تھا۔ صدی کے اواخر میں ریاست نے نصف ملین سے زیادہ افراد کی فوجی قوت کو بر قرار رکھا۔ یہ فوجی توسیع ریاست کی مداخلت کو نافذ کرنے اور نظم و نسق کو بر قرار رکھنے کے لئے ضروری قدم بنا۔ 1954ء اور 1977ء کے درمیان فوجی بجٹ میں بارہ گنا اضافہ ہوا، جو فوج کے لئے مختص وسائل میں خاطر خواہ اضافے کی نشاندہی کرتا ہے۔ مثال کے طور پر فوجی بجٹ 1954ء میں 60 ملین سے بڑھ کر 1973ء میں 5.5 بلین ہو گیا اور 1977ء میں مزید 7.3 بلین ڈالر ہو گیا۔

7.6.2 لسانی تبدیلیاں

صدی کے اوائل و اواخر میں جس طرح کی لسانی تبدیلیاں واقع ہوئیں وہ سماج کی سطح اور سفر کا اظہار ہے۔ محققین نے جگہ کے ناموں کے ہجے اور استعمال میں تبدیلی کو نوٹ کیا ہے اور ایک زیادہ معیاری شکل کی طرف بڑھتا ہوا پایا جو عصری استعمال کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے۔ جو فارسی زبان میں جدید رجحان کی عکاسی کرتا ہے۔ اس ضمن میں ریاستی اصطلاحات میں نمایاں تبدیلیاں قابل ذکر ہیں۔ خاص طور پر پہلوی دور میں حکومت نے ایک ایسی قومی شناخت کو فروغ دینے کی کوشش کی جو روایتی ورثے سے الگ ہو۔ نئی اصطلاحات کو اپنانا اور موجودہ شرائط کی تبدیلی رضا شاہ کی طرف سے شروع کی گئی۔

سیاسی زبان و بیان کے ضمن میں پہلے جو اصطلاحات رائج تھیں اس میں "استبداد" بمراد، بادشاہوں کی مطلق طاقت، "سلطنت" بمراد روایتی بادشاہی نظام، "اشرف" بمراد اعلیٰ طبقہ، "اعیان" بمراد مقامی حکومت میں بااثر شخصیات، "ارباب" بمراد زمیندار اور اس نے جاگیردار، "رعایہ" بادشاہی نظام میں عوام، طیرہ بمراد قبائلی لوگ اور شہر سے انجان لوگ، جیسی اصطلاحات رائج تھیں۔ ان اصطلاحات کے بجائے جو اصطلاحات رائج ہوئیں ان میں "جمہوریت"، "تکثیریت"، "جدیدیت"، "حقوقِ بشر"، "جامعہ مدنی" بمراد سِول سوسائٹی، "مشارکت" بمراد عوامی شرکت، "شہروندی" بمراد شہریت۔

ان نئی اصطلاحات نے بالترتیب، سیاسی شرکت اور نمائندگی کے بڑھتے ہوئے مطالبے، معاشرے کے اندر متنوع گروہوں کی شراکت داری، سماج میں جدید کاری اور ترقی کی خواہش، سیاسی گفتگو میں انسانی حق کا بنیادی تصور اور انفرادی آزادیوں، ریاست کے علاوہ منظم گروہوں اور اداروں کی قبولیت اور سیاسی عمل کی بنیاد شہریوں کی شمولیت، شہریت کا فعال تصور جیسے بحثوں کو جنم دیا۔ ان بحثوں نے جدید ایرانی سماج کے تانے بانے کو بنانے میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔

لسانی تبدیلیاں ایک بڑی ثقافتی تبدیلی کا حصہ تھیں جس کا مقصد سیکولرائزیشن اور جدیدیت کی طرف پیش قدمی تھی۔ جس کے تحت قومی زبان کا فروغ شامل تھا جو ایران کے اندر متنوع نسلی گروہوں کو متحد کر سکے۔ اصطلاحات اور جگہوں کے ناموں میں تبدیلیاں بھی سیاسی نظریات سے متاثر ہوئیں۔ خاص طور پر پہلوی دور (1925ء-1979ء) کے دوران۔

رضا شاہ (1925ء-1941ء) نے ایران کو جدید بنانے کے لئے ایک مشترکہ کوشش یہ بھی کی جس میں ایک ایسی قومی شناخت کو

فروغ دینا شامل تھا جو روایتی ورثے سے الگ تھی۔ جس کے ضمن میں ثقافتی تنظیمیں بنائی گئیں، فارسی ثقافت اور زبان کو فروغ دینے کے لئے فرہنگستان (کلچرل اکیڈمی) جیسے اداروں کا قیام عمل میں آیا۔ فارسی زبان کی اصلاح بتاتے ہوئے غیر ملکی (خاص طور پر عربی) الفاظ کو فارسی الفاظ سے بدلنے کی کوششیں ہوئی۔ مثلاً "ولایت" (صوبہ) کو "اوستان" اور "ولی" (گورنر) کو "اوسطندر" میں تبدیل کرنا۔ ایک اہم تبدیلی 1934ء میں واقع ہوئی جب رضا شاہ نے حکم دیا کہ قدیم آریائی ورثے سے نسبت اور قاجار خاندان کی بدولت آئے زوال سے قوم کو دور کرنے کے لئے ملک کو "فارس" کے بجائے "ایران" کہا جائے گا، ویکیپیڈیا کے مطابق لفظ ایران 'آریائی' نسل سے نکلا، جو رضا شاہ پہلوی کی قومی شناخت پر نسلی غلبہ کو واضح کرتی ہے۔ یہ تبدیلی قومی فخر اور ثقافتی تشخص کو بلند کرنے کی ایک وسیع مہم کا حصہ تھی۔

ان لسانی تبدیلیوں کا اثر یہ بھی ہوا کہ یہ حوالہ انیسویں صدی کے آخر سے بیسویں صدی کے آخر تک ایرانی حکمرانوں کے القاب اور کردار میں نمایاں تبدیلی پر بحث کرتا ہے، جو سیاسی نظریات اور سماجی اقدار میں وسیع تر تبدیلیوں کی عکاسی کرتا ہے۔

انیسویں صدی کے آخر میں، ناصر الدین شاہ نے "شاہ این شاہ" (بادشاہوں کا بادشاہ) اور "پادشاہ" (سرپرست شاہ) جیسے القابات اپنے اعلیٰ اختیار اور طاقت کو منوانے کے لئے اختیار کیے۔ اسے "خاقان" (خانوں کا خان) بھی کہا جاتا تھا، جو ایک طاقتور حکمران کا لقب تھا اور "ظِلُّ اللہ" (خدا کا سایہ)، جس سے الٰہی نمائندہ کا پیغام دیا جاتا۔ اس کی عدالت نے اسے ایک اخلاقی اور مذہبی رہنما کے طور پر پیش کرتے ہوئے عدل انصاف کا قائم کرنے والا، وفاداروں کا کمانڈر جیسے عظیم القابات کا استعمال کیا۔ بادشاہ کو ریاست کا واحد منبع سمجھا جاتا تھا۔ اس کی مرضی کو ریاست کی مرضی کے طور پر لیا جاتا۔

اس کے برعکس، 20ویں صدی کے اواخر میں انقلاب ایران کے رہنما آیت اللہ روح اللہ خمینی نے سماجی انصاف اور پسماندہ لوگوں کو بااختیار بنانے پر توجہ مرکوز کی۔ خمینی کے لئے "رہبر انقلاب" اور "رہنما مستضعفین" جیسے انقلابی اور مذہبی القابات دیے گئے۔ ان کے لقب "اسلامی جمہوریہ کے بانی" نے بادشاہت سے اسلامی اصولوں پر مبنی ایک نئے سیاسی نظام کی طرف واضح تبدیلی کی نشاندہی کی۔ خمینی کی قیادت نے عام لوگوں خاص طور پر "انقلابی عوام" اور دنیا بھر میں مصائب کا شکار لوگوں کی نمائندگی کرنے پر بھی زور دیا۔ انصاف کے لئے مقامی اور عالمی جدوجہد کے اتحاد کی کوشش کی۔ بادشاہت سے، جو کہ الٰہی حق اور مطلق طاقت پر انحصار کرتی تھی، انقلابی قیادت کے ماڈل کی طرف منتقلی ایران میں ایک گہری ثقافتی اور سیاسی تبدیلی کی عکاسی کرتی ہے۔ یہ ظاہر کرتا ہے کہ کس طرح قیادت کا تصور سماجی ذمہ داری اور اجتماعی شناخت پر زیادہ توجہ مرکوز کرنے کے لئے تیار ہوا، جس سے ملک کی سیاسی زبان اور فکر میں ایک بڑی تبدیلی آئی۔ ایران کی عوام خود کو کسی حکمران کی رعایا کے طور پر نہیں بلکہ مکمل شہری کے طور پر دیکھنے لگے۔ قطع نظر جنس انہوں نے قومی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ 1990ء کی دہائی تک 70 فیصد سے زیادہ بالغ آبادی قومی انتخابات میں باقاعدگی سے ووٹ ڈالنے لگی۔

7.6.3 مذہبی و فکری تبدیلی

صدی کے اوائل میں غیر سیاسی رجحان کے طور پر دیکھا گیا۔ اس نے دنیاوی معاملات کے بجائے بعد کی زندگی، ذاتی رویے اور اخلاقیات پر زیادہ توجہ دی۔ شیعہ کیلنڈر کا سب سے اہم واقعہ، عاشورہ، 680ء میں امام حسین کی شہادت کی یاد اور اس کے غم میں منایا جاتا تھا۔

جس میں ان کی قربانی کو خدائی منصوبے اور تقدیر کے طور پر دیکھا گیا۔ صفوی خاندان، جس نے 1501ء میں شیعہ مذہب کو ایران کے سرکاری مذہب کے طور پر قائم کیا اور قاجار خاندان سمیت ان کے جانشینوں نے عوام کے ساتھ اپنے تعلق کو مضبوط کیا۔ عوام کو بیرونی خطرات جیسے عثمانیوں کے خلاف متحد کرنے کے لئے ماہ محرم کی سرپرستی کی۔ 1979ء کے انقلاب تک شیعہ مذہب ایک سیاسی نظریے کے طور پر بھی سامنے آیا۔ محرم کا مرکزی پیغام صرف تقویٰ نہیں بلکہ سماجی انصاف اور سیاسی انقلاب کی طرف منتقل ہو گیا۔ ایسے نعرے سامنے آئے جس نے روزمرہ کی زندگی میں ماہ عاشورہ کی روح کو اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ جیسے "ہر مہینہ محرم، ہر دن عاشورہ، اور ہر جگہ کربلا"۔ اس نئے نعرہ نے عوام کو یہ پیغام دیا کہ امام حسین کے اقدامات محض تقدیر کا حصہ نہیں تھے بلکہ انہیں جس صورت حال کا سامنا کرنا پڑا اس کا ایک عقلی ردعمل تھا۔ اس تبدیلی نے شیعہ مذہب کے روایتی تصور سے علیحدہ تصور کی بنیاد رکھی۔ یہ تصور ایران کے سیاسی منظر نامے میں ایک وسیع تر تبدیلی کا ضامن بنا۔

7.7 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- قاجار اور پہلوی ادوار کے سیاسی ڈھانچے، جن میں قاجار کے دور میں غیر مرکزی نظام تھا جبکہ پہلوی دور میں مرکزی ریاست قائم کی گئی۔
- جدیدیت اور اصلاحات کا آغاز بیسویں صدی کے اوائل سے شروع ہوا لیکن پہلوی دور میں جدید تعلیم، بنیادی ڈھانچے اور قومی شناخت پر زور کی وجہ سے اپنے عروج کو پہنچی۔
- معاشرت اور ثقافت پر ان اصلاحات کے اثرات؛ خاص طور پر پہلوی دور میں ایرانی شناخت کی تشکیل اور مغربی اثرات کا بڑھتا ہوا عمل۔
- مذہبی اور فکری تبدیلیاں؛ دونوں ادوار میں مذہب کا کردار اہم رہا، لیکن پہلوی دور میں ریاست اور مذہب میں تنازعہ زیادہ ہوا۔
- قومی شناخت میں تبدیلی؛ خاص طور پر پہلوی دور میں فارسی ورثے اور ایرانی قومیت کو اجاگر کیا گیا، جس کا مقصد قومی اتحاد کو فروغ دینا تھا۔

7.8 نمونہ امتحانی سوالات

7.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. قاجار خاندان کی حکومت کا زوال کس سال میں ہوا؟

(a) 1920 (b) 1925 (c) 1930 (d) 1935

2. قاجار خاندان کی حکومت میں ایران میں کون سا اہم واقعہ ہوا جس کا مقصد بادشاہی طاقت کو محدود کرنا تھا؟

(a)اینگلو-فارسی جنگ (b). آئینی انقلاب (c). ترکمانچائے معاہدہ (d). تمباکو پروٹسٹ

3. اپنے آخری دور میں قاجار حکومت نے ایران کے کن بڑے مسائل کا سامنا کیا؟

(a). اندرونی قبائلی تنازعات اور غیر ملکی مداخلت (b). زراعت میں اضافے اور جدید کاری

(c). یورپی تاجروں سے تعلقات (d). تعلیم کا فروغ

4. رضاشاہ پہلوی کا اہم مقصد کیا تھا؟

(a). مذہبی رہنماؤں کی طاقت کو بڑھانا (b). قبائلی رہنماؤں اور علاقائی گورنروں کے اثر ورسوخ کو کم کرنا

(c). فوجی قوت کو کمزور کرنا (d). قاجار خاندان کو اقتدار میں واپس لانا

5. رضاشاہ کے دور میں ایران میں حجاب پر پابندی کس سال عائد کی گئی؟

1921.(a) 1925.(b) 1936.(c) 1941.(d)

6. رضاشاہ کے اصلاحی اقدامات میں کون سا قدم شامل تھا؟

(a). مذہبی اسکولوں کو فروغ دینا (b). غیر ملکی کمپنیوں کو ایران سے باہر نکالنا

(c). سیکولر تعلیمی نظام کا قیام (d). اسلامی قوانین کو فروغ دینا

7. قاجاری اور پہلوی خاندانوں کی حکومت کے حوالے سے مندرجہ ذیل میں سے کون سا بیان درست ہے؟

(a). قاجاری خاندان نے قبائلی سرداروں کے اثر کو محدود کیا۔ (b). پہلوی خاندان نے بیوروکریسی کے بغیر حکومت کی۔

(c). پہلوی خاندان نے قومی شناخت کو فروغ دیا۔ (d). قاجاری خاندان نے قوم پرستی اور جدیدیت کو فروغ دیا۔

8. پہلوی خاندان نے جدیدیت کے حوالے سے کون سی حکمت عملی اختیار کی؟

(a). ملک کی تعلیم، بنیادی ڈھانچے اور صنعت میں اصلاحات کا نفاذ (b). قبائلی رہنماؤں کے اثر کو مزید بڑھایا۔

(c). آئینی انقلاب کو روک دیا (d). مطلق العنان نظام کو مضبوط کیا۔

9. ایران میں بیسویں صدی کے آخر میں شرح خواندگی کس فیصد تک پہنچ چکی تھی؟

25.(a) 50.(b) 84.(c) 95.(d)

10. ایران کی جدید تاریخ میں لسانی تبدیلیوں کا اثر کس پہلو پر پڑا؟

(a). سیاسی نظام میں استحکام کا فقدان (b). قومی زبان کے فروغ اور وحدتی قومی شناخت پر

(c). مذہبی امور کو سیاسی نظام میں شامل کرنے پر (d). سماجی ڈھانچے میں قبائلی سرداروں کے اثر کو بڑھانے پر

7.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. قاجار اور پہلوی خاندان کے سیاسی ڈھانچے اور حکمرانی کے انداز میں بنیادی فرق کیا تھے؟
2. جدیدیت اور سماجی اصلاحات کے حوالے سے قاجار اور پہلوی خاندان کی حکمت عملی میں کیا نمایاں فرق پایا جاتا تھا؟
3. بیسویں صدی کے ایران میں سماجی، لسانی، اور ثقافتی تبدیلیاں کیسے رونما ہوئیں؟
4. ایران میں ریاستی ڈھانچے اور بیوروکریسی کی ترقی کا سفر کس طرح ہوا؟
5. انیسویں صدی کے آخر سے بیسویں صدی کے آخر تک ایران میں مذہبی اور فکری تبدیلیاں کیسے رونما ہوئیں۔

7.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

6. قاجار اور پہلوی خاندان کے دور میں ایرانی سیاسی و حکومتی نظام کے بنیادی فرق اور ان کے ایرانی معاشرے پر اثرات کا تجزیہ کریں۔
7. انیسویں اور بیسویں صدی کے دوران ایران میں جدیدیت، سماجی و ثقافتی اصلاحات، اور قومی شناخت کے عناصر کو فروغ دینے کی غرض سے کیے گئے اقدامات کا موازنہ کریں۔
8. ایران میں مذہبی و فکری تبدیلیوں اور ریاست کی طرف سے مذہبی اداروں کی سیاست میں شمولیت کے عمل کا جائزہ لیں۔

7.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

---

1. ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ جلد سوم : ثروت صولت، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی
2. اسلامی نظام حکومت اور ایران : اقتدار محمد خان، البلاغ پبلیکیشنز، دہلی
3. ایران صدیوں کے آئینہ میں : ڈاکٹر امرت لعل عشرت
4. Abrahamian, E. (2008). *A History of Modern Iran*. Cambridge University Press.
5. Saulat, S. (2001). *Millat-e-Islamia ki Mukhtasar Tarikh* (Vol. 3). Markazi Maktaba Islami Publishers.
6. Hasan, S. S. (1980). *Inqilab-e-Iran*. Malik Noorani Publications.
7. Ishrat, A. L. (1967). *Iran Sadion ky Ayine me*. Amrat Lal Ishrat Publications.
8. Ashraf, A. (1946). *Iran Ki Bedari*. Progressive Books.

Author's Note:

This chapter relies extensively on Ervand Abrahamian's *A History of Modern Iran* (2008) for data and arguments.. Any use of ideas or arguments from this work is intended for educational

purposes only, and all rights are acknowledged.

اکائی 8: جدید ایران (انقلاب 1979ء)

اکائی کے اجزا:

8.0 تمہید

8.1 مقاصد

8.2 انقلاب کا تاریخی پس منظر

8.2.1 قاجاری دور سے انقلاب کا تعلق

8.2.2 پہلوی دور سے انقلاب کی آہٹ

8.3 سفید انقلاب کے مسائل اور غیر ارادی نتائج

8.4 انقلاب کے اہم پہلو

8.4.1 علماء کا کردار

8.4.2 معاشی عدم اطمینان

8.4.3 ثقافتی کو لاحق خطرہ

8.4.4 1977ء کے احتجاج

8.4.5 میڈیا کا کردار

8.4.6 1978ء کی بغاوت

8.4.7 خمینی کی واپسی

8.4.8 شاہ کا زوال

8.4.9 انقلاب اور اس کا نتیجہ

8.4.10 اسلامی جمہوریہ کا قیام

8.4.11 اسلامی جمہوریہ پر تنقید کا آغاز

8.5 سماج پر انقلاب کے اثرات
8.5.1 اسلامی جمہوریہ کی تشکیل
8.5.2 ثقافتی انقلاب
8.5.3 معاشی تبدیلیاں
8.5.4 سماجی تحریکیں اور سرگرمی
8.5.5 مذہبی اقلیتوں پر اثرات
8.6 انقلاب ایران کے علاقائی وعالمی اثرات
8.6.1 اسلامی تحریکوں کے لیے تحریک
8.6.2 سیکولر حکومتوں کو چیلنج
8.6.3 مشرق وسطی پر اثر
8.6.4 مغرب کے ساتھ کشیدہ تعلقات
8.6.5 عالمی سیاست پر اثرات
8.6.6 انقلابِ ایران ایک مثال
8.7 انقلاب کے متعلق مختلف نقطہ ہائے نظر
8.8 ایرانی انقلاب کو اسلامی انقلاب کیوں کہا جاتا ہے؟
8.9 اکتسابی نتائج
8.10 نمونہ امتحانی سوالات
8.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
8.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
8.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
8.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد

8.0 تمہید

1979ء کا ایرانی انقلاب جسے اسلامی انقلاب بھی کہا جاتا ہے، ایران اور مشرق وسطیٰ کی تاریخ میں ایک اہم موڑ تھا۔ یہ انقلاب شاہ محمد رضا پہلوی کی قیادت میں پہلوی بادشاہت کے زوال اور آیت اللہ روح اللہ خمینی کی قیادت میں اسلامی جمہوریہ کے عروج کا باعث بنا۔ یہ انقلاب کوئی اچانک وقوع پذیر ہونے والا واقعہ نہیں تھا۔ بلکہ کئی دہائیوں کی سیاسی، سماجی اور اقتصادی تبدیلیوں کا نتیجہ تھا۔ اس واقع کے پس منظر میں اندرونی مسائل اور غیر ملکی مداخلت کے خلاف پائے جانے والی عوامی بے چینی تھی۔ اس اکائی میں 1979ء انقلاب کے مطالعہ کے لیے اس کی تاریخی جڑوں، اہم واقعات، اس میں شامل اہم گروہوں اور اس کے نتائج کا جائزہ لیا جائے گا۔

8.1 مقاصد

1979ء کے ایرانی انقلاب کے تاریخی پس منظر کو سمجھنا

انقلاب کی طرف لے جانے والے اہم واقعات کو جاننا

انقلاب کا ایرانی سماج پر اثر کا جائزہ لینا۔

انقلاب ایران کے علاقائی و عالمی اثرات کو سمجھنا

اس بات کا جائزہ لینا کہ ایرانی انقلاب ایک اسلامی انقلاب کیوں کہا جاتا ہے۔

8.2 انقلاب کا تاریخی پس منظر

8.2.1 قاجاری دور سے انقلاب کا تعلق

1979ء کے انقلاب کی ابتدا انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں قاجار خاندان سے ہوتی ہے۔ قاجاروں نے غیر ملکی مداخلت، معاشی مسائل اور سماجی بدامنی کا سامنا کیا۔ اپنی حکمرانی کے دوران انہیں ملک کو کنٹرول کرنے میں بہت سے چیلنجوں کا سامنا کرنا پڑا، جس سے ان کی طاقت کمزور پڑ گئی اور مقامی رہنماؤں کو اثر و رسوخ حاصل کرنے کا موقع ملا۔ اس فقدان نے ایک ایسا سیاسی ماحول پیدا کیا جہاں حکومت کے خلاف عدم اطمینان بڑھنے لگا۔ قاجار کے دور میں ایک نیا متوسط طبقہ ابھرنا شروع ہوا۔ یہ طبقہ خصوصاً شہروں میں ابھرا۔ اس گروپ میں شہری تاجر اور مذہبی رہنما شامل تھے جنہوں نے یہ دیکھا کہ وہ حکومت کے متعلق اور غیر ملکی مداخلت کے خلاف متحد ہیں۔ یہ بیداری ایران میں سیاسی تحریکوں کی تشکیل میں ایک اہم قدم تھا۔ قاجار کے دور میں ایک بڑا واقعہ 1905ء-1911ء کا آئینی انقلاب تھا۔ آئینی انقلاب نے ایک ایسی بادشاہت کی بناڈالنے کی کوشش کی جو آئین کی پابند ہو اور حکمرانوں کی طاقت محدود ہو جائے۔ لیکن قاجار حکمران ان عوامی مطالبات اور اصلاحات کو بروئے کار نہیں لا سکے۔ اس انقلاب کا مقصد بادشاہت کی طاقت کو کم کرنا اور عوام کی نمائندگی کے لیے پارلیمنٹ قائم کرنا تھا۔ اگرچہ قاجاروں کی جگہ پہلوی خاندان نے لے لی، لیکن آئینی انقلاب کا اثر باقی رہا جس سے بعد کی

تحریکیں بھی متاثر ہوئیں۔ 1979ء کے انقلاب کے وقت تک بہت سے ایرانیوں نے پہلوی بادشاہت کو قاجار کی بدعنوانی اور ظلم کے تسلسل کے طور پر دیکھا۔ اس نکتہ نظر نے ٹھوس تبدیلی کی شدید خواہش کو جنم دیا۔ قاجار خاندان کی مرکزی اتھارٹی کا کمزور ہونا، سیاسی طور پر بیدار ایک متوسط طبقے (مڈل کلاس) کا عروج اور آئینی انقلاب کے دیرپا اثرات نے ان حالات کو جنم دیا جو 1979ء کے انقلاب کا باعث بنے۔

8.2.2 پہلوی دور سے انقلاب کی آہٹ

رضا شاہ پہلوی نے ایران کو ایک جدید قوم میں تبدیل کرنے کے لیے جدیدیت کی تبلیغ اور سیکولرائزیشن کے نفاذ پر توجہ دی۔ اس نے صنعتیں، بنیادی ڈھانچہ اور مغربی طرز کی تعلیم کو ترقی دی لیکن بہت سے لوگ، خاص طور پر روایتی اور دیہی برادریوں نے خود کو اس عمل سے الگ تھلگ محسوس کیا۔ رضا شاہ کی آمرانہ پالیسیوں اور اپوزیشن کو دبانے کے عمل نے مزید عدم اطمینان پیدا کیا۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران جب رضا شاہ کو 1941ء میں جلاوطنی پر مجبور کیا گیا تو اس کا بیٹا محمد رضا شاہ بادشاہ بنا۔ انہوں نے سیاسی عدم استحکام، معاشی مشکلات اور بڑھتی ہوئی قوم پرست تحریک جیسے کئی چیلنجز کا سامنا کیا۔ اس سلسلے کی اہم کڑی 1951ء میں وزیر اعظم محمد مصدق کے ذریعہ ایران کی تیل کی صنعت کو نیشنلائز کرنے کا عمل تھا۔ 1953ء میں امریکہ کی سینٹرل انٹیلیجنس ایجنسی (سی آئی اے) کی حمایت سے مصدق کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا۔ جس سے شاہ کا اقتدار تو مستحکم ہوا لیکن ایرانی سیاست میں غیر ملکی مداخلت کے خلاف بڑھتی ہوئی ناراضگی کو مزید ہوا ملی۔

اس سے قبل رضا شاہ پہلوی نے 1925ء سے لے کر 1941ء میں اقتدار چھوڑنے تک ایران پر حکومت کی۔ اگرچہ 1979ء کے انقلاب کے وقت وہ زندہ نہیں تھا لیکن اس کے بعد محمد رضا شاہ نے اپنے باپ کے بہت سے اقدامات اور پالیسیوں کے نفاذ کو جاری رکھا۔ جو ایرانی انقلاب کی اہم وجوہات ہیں۔

1. آمرانہ حکمرانی

رضا شاہ نے بہت سخت طریقہ سے ایک سنٹرالائز حکومت (مرکوز) حکومت چلائی۔ وہ مخالفت کو برداشت نہیں کرتا تھا اور اکثر ہر اس آواز کو دبا دیتا تھا جو اس سے اختلاف کرے۔ اس رد عمل سے دانشوران، مذہبی رہنماؤں اور متوسط طبقے میں بے چینی پیدا ہوتی گئی۔ اس سخت اصول نے معاشرے کے بہت سے گروہوں میں مخالفت کے جذبہ کو جنم دیا۔ اس کے بیٹے محمد رضا شاہ جس نے ان کے بعد اقتدار سنبھالا اس آمرانہ وراثت کو بھی قائم رکھا جس سے کشیدگی میں اضافہ ہوتا رہا۔

2. جدید کاری اور سیکولرائزیشن

رضا شاہ ایران کو مزید جدید اور مغرب زدہ بنانا چاہتا تھا۔ اس نے ایرانی معاشرے کی روایات کو بدلنے کی کوشش کی۔ اس ضمن میں مغربی تعلیم، مغربی لباس اور مغربی ثقافت اور طریقہ زندگی کو فروغ ملا۔ مغربیت کی طرف اس قدر جھکاؤ نے بہت سے روایتی اور مذہبی ایرانیوں کو پریشان کر دیا۔ ان کا احساس تھا کہ ان کی ثقافتی شناخت کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ جدیدیت اور روایتی اقدار کے درمیان اس تصادم نے عدم اطمینان کے بڑھتے ہوئے احساس کو جنم دیا۔

3. معاشی نابرابری

رضا شاہ کی معاشی پالیسیاں صنعت کاری اور شہر بنانے پر مرکوز تھیں۔ ان پالیسیوں سے بنیادی طور پر امیروں اور طاقتوروں کو فائدہ پہنچا۔ کچھ لوگ امیر سے امیر تر ہوتے گئے اور بہت سے دیہی اور معاشی طور پر کمزور طبقے کے لوگ مزید غربت کا شکار ہوتے گئے۔ اس معاشی تفاوت نے سماج کے بیدار مغز لوگوں کی توجہ مبذول کی۔ خصوصا پیچھے رہ جانے والے طبقہ میں انقلاب کا جذبہ پروان چڑھا۔

4. تیل کی تجارت کا نیشنالائزیشن

رضا شاہ کے دور میں ایران سے برآمد ہونے والے تیل پر غیر ملکی کمپنیوں کا کنٹرول تھا۔ 1950ء کی دہائی کے اوائل میں وزیر اعظم محمد مصدق نے تیل کی صنعت پر اپنا کنٹرول حاصل کرنے کے لیے اسے نیشنالائز کرنے کی کوشش کی۔ جس کے بعد 1953ء میں مصدق کے خلاف غیر ملکی طاقتوں کے اشتراک سے بغاوت کر دی گئی اور شاہ کی طاقت بحال ہوگئی۔ اس بغاوت کے بعد غیر ملکی مداخلت اور بادشاہت کے گٹھ جوڑ کے خلاف عوام میں سخت غصہ پیدا ہوا۔

5. سیاسی جبر

محمد رضا شاہ نے اپنے والد کے جابرانہ طریقوں کو وراثت میں پایا۔ 1957ء میں 'ساواک' (خفیہ پولیس) قائم کی گئی۔ ساواک کے ذریعہ اختلاف رائے رکھنے والوں کو دھمکیاں دی جاتیں۔ سیاسی مخالفین کو دبانے کے لیے اسے استعمال کیا جاتا تھا۔ بہت سے لوگوں نے ان سخت اقدامات کے رد عمل کے طور پر اپوزیشن گروہوں کی حمایت کرنا شروع کر دی۔ اس میں مذہبی اور بائیں بازو کی تنظیمیں بھی شامل ہیں۔

6. ثقافتی انقلاب (سفید انقلاب)

سفید انقلاب، جسے "شاہ کا سفید انقلاب" بھی کہا جاتا ہے۔ یہ بڑی اصلاحات کے نفاذ کی ایک مہم تھی جو 1963ء میں شاہ محمد رضا پہلوی نے شروع کی۔ سفید انقلاب کا بنیادی مقصد ایران کی معیشت اور معاشرے کو مغربی اور جدید طرز پر لانا تھا۔ اس میں سماجی، اقتصادی اور سیاسی شعبوں میں بہت سی تبدیلیاں شامل تھیں۔ سفید انقلاب کے اہم اہداف اور نتائج درج ذیل ہیں:

1. لینڈ ریفارم پروگرام

سفید انقلاب کا ایک اہم حصہ زمین کی پالیسی میں تبدیلی تھی۔ شاہ بڑے زمینداروں سے زمین لے کر غریب کسانوں کو دینا چاہتا تھا۔ حکومت نے زمین پر قبضہ کر لیا اور اسے تقریباً 15 / لاکھ بے زمین کسانوں کو دے دیا۔ تاہم اس سے کچھ مسائل پیدا ہوئے۔ زمین کو اکثر چھوٹے حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا جس کی وجہ سے کاشتکاری میں مشکلات درپیش ہوئیں اور پیداوار کم ہوئی۔ اس کے علاوہ بہت سے دیہی علاقوں میں اب بھی بنیادی سہولیات (اسکول، اسپتال، بجلی اور صاف پانی) نہیں تھیں۔

2. صنعتی ترقی

شاہ نے صنعتی ترقی کے دو راستے اپنائے۔ ایک، نئی صنعتوں میں سرمایہ کاری (انویسٹمنٹ)۔ دوسرا، غیر ملکی کمپنیوں کو سرمایہ کاری کرنے کی ترغیب دینا۔ جس سے ایران میں نئے مینوفیکچرنگ سیکٹر اور ٹیکنالوجی کی ترقی مقصود تھی۔ لیکن اس پالیسی نے بیرونی طاقتوں کی

مداخلت کے راستے کو مزید ہموار کیا۔

3. صحت اور تعلیم

صحت اور تعلیم میں بہتری بھی سفید انقلاب کا حصہ تھی۔ اس مہم کے تحت اسپتال بنائے گئے۔ خواندگی کی شرح 26٪ سے بڑھ کر 42٪ ہو گئی۔ ان پروگراموں نے صحت عامہ اور تعلیم کو بہتر بنایا۔ یہ شعبہ بھی زیادہ تر شہری علاقوں میں تھا اور دیہی آبادی اس سے محروم تھی۔

4. خواتین کے حقوق

سفید انقلاب نے خواتین کو ووٹ دینے، انتخابات اور عدلیہ میں حصہ لینے کا حق دیا۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں روایتی طور پر زیادہ تر طاقت مردوں کے پاس تھی، یہ تبدیلی اہم تھی۔

8.3 سفید انقلاب کے مسائل اور غیر ارادی نتائج

بڑے منصوبوں کے باوجود سفید انقلاب نے بہت سے مسائل پیدا کیے اور غیر متوقع نتائج سامنے آئے۔ ان مسائل اور نتائج نے بالآخر 1979ء ایرانی انقلاب کی راہ ہموار کی۔ کچھ اہم مسائل درج ذیل ہیں:

1. روایتی گروہوں پر عدم توجہی

شاہ کی جانب سے اس تیز رفتار تبدیلی کے منصوبہ اور نفاذ میں مختلف گروہوں کو اپنے ساتھ شامل نہیں کیا گیا۔ روایتی زمینداروں، مذہبی رہنماؤں اور غریب آبادی، محنت کش طبقہ اور سول سوسائٹی نے محسوس کیا کہ سفید انقلاب امیروں اور غیر ملکی مفادات کے حق میں ہے۔

2. معاشی عدم مساوات

اگرچہ شاہ کی پالیسیوں کا مقصد معیشت کی مدد کرنا تھا لیکن انہوں نے امیر اور غریب کے درمیان ایک بڑا فاصلہ پیدا کیا۔ شہروں کے بننے کے بعد غریب ان شہروں میں کام کاج اور معاشی ترقی کی امید لیے شہر پہنچے لیکن وہ بھیڑ بھاڑ اور غریب بستیوں کا حصہ بنتے چلے گئے۔ آمدنی اور ذرائع کی تقسیم کے فرق نے لوگوں کہ اندر اس خیال کو مضبوط کیا کہ حکومت کو ان کے مسائل کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔

3. مذہبی گروہوں کی مخالفت

بہت سے مذہبی رہنماؤں نے ان اصلاحات کو ناپسند کیا خاص طور پر سیکولرائزیشن (مذہبی روایات سے دستبرداری)۔ اس گروہ سے تعلق رکھنے والے آیت اللہ خمینی نے ان اقدامات کے خلاف جدوجہد کرنے کو مغربی اثرورسوخ اور سیکولر اقدار کے خلاف جنگ قرار دیا۔

4. سفید انقلاب، 1979ء انقلاب کا راستہ بن گیا

1970 کی دہائی کے آخر تک سفید انقلاب کے زیر اثر شاہ کی آمرانہ حکمرانی اور مغربی ممالک کے ساتھ قریبی تعلقات نے بڑے

پیمانے پر عوامی احتجاج کو جنم دیا۔ بہت سے گروہ بشمول بائیں بازو، نیشنلسٹ اور مذہبی گروہ شاہ کے خلاف متحد ہو گئے۔

مختصراً یہ کہ سفید انقلاب کا ہدف ایران کو جدید بنانا تھا لیکن اس نے سماجی، اقتصادی اور سیاسی کشیدگی پیدا کی جو بالآخر 1979ء کے انقلاب پر منتج ہوئی۔ یہ کشیدگی پہلوی بادشاہت کے زوال اور اسلامی جمہوریہ ایران کے عروج کا باعث بنی۔ یہ معاشرے کے مختلف طبقات کی مشترکہ جدوجہد کا ایک تاریخی موڑ ثابت ہوا۔

8.4 انقلاب کے اہم پہلو

8.4.1 علماء کا کردار

علماء، خاص طور پر آیت اللہ خمینی، ایک طاقتور اپوزیشن قوت بن گئے۔ خمینی نے شاہ کی مغربیت زدہ حکومت اور ملک کے سیکولرائزیشن پر سخت تنقید کی۔ ان تنقیدوں سے وہ ایرانی بھی جو خود کو الگ تھلگ محسوس کرتے تھے، تبدیلی کی آواز کا تیزی سے حصہ بننے لگے۔ جب خمینی کی شخصیت اور وجود حکومت کے لیے خطرہ بن گیا تو 1964ء میں خمینی کو جلاوطن کر دیا گیا۔ یہ جلاوطنی شاہ کے خلاف مزاحمت کی علامت بن گئی اور اس نے آیت اللہ خمینی کی حیثیت کو مزید بلند کیا۔

ایران کے سیاسی منظر نامے کو تبدیل کرنے اور 1979ء انقلاب کی جدوجہد میں مذہبی رہنماؤں کا کردار کلیدی ہے۔ وہ صرف شاہ کی مخالفت میں نہیں بلکہ وسیع تاریخی، سماجی اور مذہبی عوامل کی وجہ سے عملی سیاست کا حصہ بنے۔ (جس کا ذکر مندرجہ بالا سطروں اور گزشتہ اکائی میں کیا گیا ہے۔) جس نے جدید ایران میں علماء کو بادشاہت کے خلاف ایک طاقتور قوت بنا دیا۔ علماء عوام کو متحرک کرنے، عوامی مسائل کو بیان کرنے اور انقلاب کی قیادت کرنے والے رہنما بن گئے۔

تاریخی طور پر علماء کا سیاسی اثر و رسوخ بیسویں صدی کے اوائل سے ہی نظر آتا ہے۔ خاص طور پر 1905ء سے 1911ء تک کے آئینی انقلاب کے دوران علماء نے اہم کردار ادا کیا۔ یہ ایران میں بادشاہت کی مطلق العنان حکمرانی کو چیلنج کرنے کی پہلی بڑی کوشش تھی۔ جس میں علماء نے ایک مضبوط اپوزیشن کی حیثیت اختیار کی۔ انہوں نے آئینی اصلاحات کی حمایت کرتے ہوئے اسلامی طرز حکمرانی کی وکالت کی۔ جس میں آیت اللہ عبدالکریم کا نام ملتا ہے۔ اس دور نے مستقبل کی سیاسی سرگرمیوں میں علماء کے کردار کو طے کیا اور سماجی و سیاسی مسائل میں ان کی شمولیت کی بنیاد رکھی۔

1963ء میں شاہ کے سفید انقلاب کے ذریعے ایران کو جدیدیت کی آغوش میں دھکیل دینا مقصود تھا۔ جس نے مختلف سماجی گروہوں بشمول علماء، روایتی زمینداروں اور تاجروں میں شدید عدم اطمینان پیدا کیا۔ علماء نے شاہ کی مغرب زدگی کی کوششوں اور سیکولر پالیسیوں کو اسلامی اقدار اور ایران کے سماجی نظام کے لیے براہ راست خطرات کے طور پر دیکھا۔ اس مخالفت میں "لینڈ ریفارم" پالیسی اہم تھی۔ مصنفین نے لکھا کہ اس پالیسی کو دیہی اشرافیہ کی طاقت کو کم کرنے کے لیے ڈیزائن کیا گیا تھا لیکن اس پالیسی نے علماء کے اثر و رسوخ کو بھی نقصان پہنچایا۔ ان اصلاحات کے خلاف 1963ء کا احتجاج ایک اہم واقعہ ثابت ہوا۔ خاص طور پر جب آیت اللہ روح اللہ خمینی نے شاہ کی

پالیسیوں کے خلاف سختی سے بات کی۔ جون 1963ء میں ان کی گرفتاری نے بڑے مظاہروں کو جنم دیا، جس کی وجہ سے مظاہرین اور پولیس کے درمیان پر تشدد جھڑپیں ہوئیں۔ یہ واقعہ ایک قومی رہنما اور مزاحمت کی مضبوط آواز کے طور پر آیت اللہ خمینی کے عروج کا آغاز تھا۔

شاہ کی مخالفت میں مختلف گروہوں کو متحد کرنے میں آیت اللہ خمینی کی قیادت مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ خمینی نے ایک طرف روایتی شیعیی عقائد اور دوسری طرف بادشاہت اور مغربی اثر ورسوخ دونوں پر سخت تنقید کی۔

روایتی شیعہ علماء نے سیاسی معاملات میں خاموشی کو ترجیح دی۔ یعنی روایتی طور پر اس خیال کو فروغ دیا گیا کہ مذہبی رہنماؤں کو سیاسی معاملات اور قیادت سے باہر رہنا چاہیے۔ اس خیال کے مطابق علماء یا مذہبی رہنماؤں کو حکومتی اور سیاسی معاملات سے دور رہتے ہوئے اپنے ایمان اور تقویٰ کے متعلق لوگوں کی رہنمائی پر توجہ دینی چاہیے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان کا کردار محض روحانی معاملات میں ہونا چاہیے۔ اس کے بر خلاف آیت اللہ خمینی نے کہا کہ علماء کا فرض ہے کہ وہ سیاست میں حصہ لیں۔ خاص طور پر جب جبر یا غیر منصفانہ حکومت سے سامنا ہو۔ خمینی کا ماننا تھا کہ اسلامی ریاست کے لیے ضروری ہے کہ معاشرے میں اسلامی قوانین اور اقدار کو مکمل طور پر نافذ کیا جائے۔ خمینی نے اس خیال کو مسترد کر دیا کہ مذہبی رہنماؤں کو ظلم کے سامنے غیر فعال یا خاموش رہنا چاہیے۔ ان کا اصرار تھا کہ انہیں کسی بھی قسم کی جابرانہ حکومت کے خلاف فعال طور پر مزاحمت کرنی چاہیے۔ لوگوں کے حقوق کا تحفظ کریں علماء کی ذمہ داری ہے۔

ساتھ ہی خمینی نے "ولایت فقیہ" کا تصور پیش کیا۔ جس کے مطابق فقہاء اور علماء کو سیاسی اختیار حاصل ہونا چاہیے۔ اس خیال نے شاہ کی سیکولر حکومت کو چیلنج کیا اور پریشان حال عوام کو متحد اور یکجا کیا۔ 1964ء میں خمینی کے جلاوطن ہونے کے بعد بھی پہلے ترکی اور بعد میں فرانس میں ان کا اثر ورسوخ بڑھتا رہا۔ جلاوطنی سے، خمینی نے اپنے پیروکاروں سے کیسٹ ٹیپ اور خطوط کے ذریعے بات چیت کی۔ یہ بات چیت خفیہ طریقے سے ایران میں پھیلائی جاتی تھی۔ لوگوں کی نا امیدیوں کو ایک رخ دینے، ان میں امید کی آس جگانے اور تبدیلی کی جدوجہد کو مذہبی فریضے کے طور پر پیش کرنے کی ان کی صلاحیت نے انہیں طلبہ، نوجوانوں، سماجی کارکنوں، عام شہریوں اور تاجروں میں بے حد مقبول کیا۔

وقت کے ساتھ علماء کی طاقت میں اضافہ ہوا۔ انہوں نے کامیابی کے ساتھ عوام کو بادشاہت کے خلاف متحد و متحرک کیا۔ مذہبی اجتماعات، جیسے عاشورا کی تقریبات، سیاسی مخالفت کے اظہار کے مواقع بن گئے۔ مثال کے طور پر 1977ء کی عاشورہ کی تقریبات میں بڑے اجتماعات ہوئے جہاں لوگوں نے اپنے غصے کا اظہار کیا۔ خمینی کے پیغامات عام ہوئے۔ علماء نے بائیں بازو اور سیکولر قوم پرستوں سمیت دیگر اپوزیشن گروہوں کے ساتھ اتحاد بھی بنایا، جس سے شاہ کے خلاف ایک وسیع محاذ تشکیل دیا۔ نیشنل فرنٹ جیسے گروپ، نیشنلزم کی وکالت کرنے والی تنظیمیں اور کئی بائیں بازو کے دھڑوں نے بادشاہت کے خلاف جدوجہد میں علماء کا ساتھ دیا۔ اس اتحاد نے مظاہروں اور ہڑتالوں کو منظم کیا جو 1978ء میں مزید شدت اختیار کر گیا۔ خلاصہ کلام یہ کہ شاہ کے خلاف جدوجہد میں علماء کے کرادر نے مختلف گروہوں کو اکٹھا کیا اور ایک طاقتور اپوزیشن بنائی۔ ان کی قیادت نے عوام کی بے اطمینانی کو ایک ایسی تحریک میں تبدیل کر دیا جو شاہ کا تختہ الٹنے اور اسلامی جمہوریہ کے قیام کا باعث بنی۔ اس تحریک نے تاریخی، سماجی اور مذہبی عوامل کے پیچیدہ امتزاج کو اجاگر کیا۔

8.4.2 معاشی عدم اطمینان

1970ء کی دہائی میں تیل کی آمدنی میں اضافے کے باوجود ایران کو معاشی مسائل کا سامنا کرنا پڑا جیسے مہنگائی، بے روزگاری اور دولت کی بدانتظامی۔ امیر اشرافیہ اور غریب عوام کے درمیان خلیج وسیع تر ہوتی گئی جس سے سماجی بے چینی اور مایوسی میں اضافہ ہوا۔

8.4.3 ثقافتی کو لاحق خطرہ

مغربی ثقافت پر شاہ کا زور، ایران کے ثقافتی اور مذہبی اقدار سے متصادم تھا۔ بہت سے ایرانیوں نے محسوس کیا کہ ان کی شناخت خطرے میں ہے اور ان تبدیلیوں کے خلاف سخت ردعمل کا اظہار کیا۔

8.4.4 1977ء کے احتجاج

1977ء میں ایک مضمون میں خمینی پر تنقید کے بعد شاہ کے خلاف بڑے مظاہرے شروع ہوئے۔ مظاہرے پورے ملک میں پھیل گئے، جس میں طلبہ، دانشوران اور مذہبی رہنما شامل تھے۔ ان مظاہروں کو روکنے کے لیے حکومت نے پرتشدد ردعمل کیا۔ جس کے بعد عوامی غصہ اور شاہ کی مخالفت میں اضافہ کیا۔

8.4.5 میڈیا کا کردار

میڈیا نے انقلاب کے لیے رائے عامہ کو متحرک کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ خمینی کی تقاریر کیسٹ میں ریکارڈ کی گئیں اور ایران میں خفیہ طریقے سے پھیلائی گئیں۔ جس نے دیگر عوام کو منظم کیا اور اس مزاحمت کو غیر معمولی طاقت دی۔

8.4.6 1978ء کی بغاوت

1978ء میں ملک بھر میں بڑے مظاہرے ہوئے۔ حکومت کے پرتشدد ردعمل، خاص طور پر ستمبر 1978ء میں بلیک فرائیڈے کے دوران، جہاں بہت سے مظاہرین مارے گئے، نے عوام کو حکومت کے خلاف مزید مستحکم کر دیا۔

8.4.7 خمینی کی واپسی

جنوری 1979ء میں آیت اللہ خمینی جلاوطنی سے واپس ایران آئے لاکھوں حامیوں نے ان کا استقبال کیا۔ ان کی آمد نے انقلاب کے آخری مرحلے کے آغاز کا اشارہ دیا۔

8.4.8 شاہ کا زوال

16 / جنوری 1979ء کو شاہ نے علاج کے لیے ایران چھوڑ دیا۔ جو اس کی حکمرانی کے خاتمے کی علامت بن گیا۔ عوامی مظاہروں اور ہڑتالوں نے معیشت کو مفلوج کر دیا اور پہلوی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

8.4.9 انقلاب اور اس کا نتیجہ

ایرانی انقلاب کے نتیجے میں یکم اپریل 1979ء کو اسلامی جمہوریہ کا قیام عمل میں آیا۔ آیت اللہ خمینی کی قیادت میں نئی حکومت کا مقصد ایران کے معاشرے اور طرز حکمرانی کو اسلامی اصولوں کے مطابق ڈھالنا تھا۔ اس انقلاب نے ایران کے سیاسی ڈھانچے، سماجی پالیسیوں اور بین الاقوامی تعلقات کو نمایاں طور پر متاثر کیا۔

8.4.10 اسلامی جمہوریہ کا قیام

اس انقلاب سے ایک نئی تھیوکریٹک حکومت قائم ہوئی۔ جس میں خمینی سپریم لیڈر تھے۔ آئین نے ولایت فقیہ (اسلامی فقیہ کی سرپرستی) کا نظریہ متعارف کرایا اور مذہبی طبقہ کو سیاست کا مستقبل قرار دیا گیا۔

8.4.11 اسلامی جمہوریہ پر تنقید کا آغاز

انقلاب کے فوراً بعد نئی حکومت کی تشکیل ہوئی۔ نئے طریقوں اور پالیسیوں پر اندرون ملک اور بیرون ملک سے مخالفت بھی شروع ہوئی۔ اس تنقید میں سماجی تبدیلیوں کو نشانہ بنایا گیا۔ سخت اسلامی لباس کا قانون، خواتین کے محدود حقوق اور روایتی اسلامی طریقوں کو فروغ دینے پر تنقید کی گئی۔ نئی حکومت کا مقصد مغربی اثرات کو ختم کرنا اور اسلامی اقدار کو فروغ دینا تھا۔ دوسری تنقید یہ ہوئی کہ نئی حکومت نے سابقہ عہدیداروں، سیاسی مخالفین اور بائیں بازو کے گروہوں کو نشانہ بناتے ہوئے اپوزیشن کو دبا دیا۔ جب کہ انقلابی رہنماؤں نے ابتدا میں جمہوریت کا وعدہ کیا تھا نئی حکومت نے جلد ہی اختلاف رائے کو دبانا شروع کر دیا۔ سیاسی مخالفین، بشمول بائیں بازو، قوم پرست اور یہاں تک کہ کچھ مذہبی گروہوں کو بھی ظلم و ستم کا سامنا کرنا پڑا۔

اس ضمن میں اسلامک ریوولوشنری گارڈ کورپس (IRGC) کی تشکیل نے حکومت کو سیکورٹی فورسز پر کنٹرول دے دیا اور اقتدار پر اپنی گرفت مضبوط کر دی۔

8.5 سماج پر انقلاب کے اثرات

1979ء ایرانی انقلاب نے ایرانی معاشرے پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ جس نے ملک کے سیاسی، ثقافتی، سماجی اور اقتصادی ڈھانچے کو تبدیل کیا۔

8.5.1 اسلامی جمہوریہ کی تشکیل

انقلاب کے نتیجے میں اسلامی جمہوریہ ایران کا قیام عمل میں آیا۔ جس کے تحت بادشاہت کی جگہ اسلامی قانون (شریعت) پر مبنی حکومت قائم ہوئی۔ نئی حکومت کا مقصد اسلامی اصولوں پر مبنی ایک ایسا معاشرہ تشکیل دینا تھا جو بنیادی طور پر ایران کے سیاسی نظام کی تشکیل نو کرے۔

8.5.2 ثقافتی انقلاب

انقلاب بڑی ثقافتی تبدیلیوں کا باعث بنا۔ اسلامی اقدار اور اصولوں کو فروغ دیا گیا جبکہ مغربی اثرات اور سیکولر اداروں کو کم کیا گیا۔ حکومت نے اسلامی تعلیمات پر زور دینے کے لیے تعلیمی نظام میں اصلاحات کیں اور خواتین کو اسلامی قانون کے تحت طرز زندگی کا پابند بنایا۔

8.5.3 معاشی تبدیلیاں

انقلاب ایران نے معیشت میں اہم تبدیلیاں پیدا کیں۔ حکومت نے تیل جیسی اہم صنعتوں کو نیشنلائز کیا۔ اس کا مقصد دولت کی مساوی تقسیم تھا۔ تاہم ان اقتصادی تبدیلیوں کو بدانتظامی، بین الاقوامی پابندیوں اور غیر ملکی سرمایہ کاری میں کمی جیسے چیلنجوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جس کی وجہ سے جاری اقتصادی مشکلات میں اضافہ ہوا۔

8.5.4 سماجی تحریکیں اور سرگرمی

انقلاب نے ابتدائی طور پر سماجی تحریکوں کو تقویت بخشی۔ جس میں خواتین کے حقوق اور مزدوروں کے حقوق کے لیے کوششیں شامل تھیں۔ اگرچہ کچھ ابتدائی پیش رفت ہوئی لیکن حکومت کی جانب سے اختلاف رائے پر پابندیوں نے بعد کے سالوں میں ان تحریکوں کی پیش رفت کو محدود کر دیا۔

8.5.5 مذہبی اقلیتوں پر اثرات

انقلاب نے ایران میں مذہبی اقلیتوں کو متاثر کیا بشمول عیسائی، یہودی اور بہائی جنہیں امتیازی سلوک اور بعض اوقات ظلم و ستم کا سامنا کرنا پڑا۔ ان حالات کی وجہ سے ان برادریوں کے بہت سے افراد نے ایران چھوڑ دیا۔

8.6 انقلاب ایران کے علاقائی و عالمی اثرات

1979ء کے ایرانی انقلاب نے نہ صرف ایران کو شاہ کی حکمرانی کے مقابلہ آیت اللہ خمینی کی قیادت میں اسلامی جمہوریہ میں تبدیل کر دیا بلکہ اس واقعہ کے پورے مشرق وسطیٰ اور دنیا پر نمایاں اثرات مرتب ہوئے۔ اس واقعہ نے عالمی سطح پر اسلامی تحریکوں کو متاثر کیا۔ ساتھ ہی سیکولر حکومتوں کو چیلنج کیا۔ ایران اور مغرب کے درمیان نئی کشیدگی کو جنم دیا۔ بین الاقوامی تعلقات پر اس کے اثرات آج بھی نظر آتے ہیں۔

8.6.1 اسلامی تحریکوں کے لیے تحریک

ایرانی انقلاب کے بڑے علاقائی اثرات میں سے ایک یہ تھا کہ اس نے مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقہ میں اسلامی تحریکوں کو متاثر کیا۔ انقلاب نے ظاہر کیا کہ ایک عوامی تحریک کے لیے ایک سیکولر حکومت کا تختہ الٹ کر اسلامی حکومت کا قیام ممکن ہے۔ اس نے مصر میں اخوان المسلمین، تیونس اور الجزائر میں اسلام پسند تحریکوں کو اپنے ممالک میں اسی طرح کی اسلامی حکومت کا مقصد بنانے کی تحریک دی۔

انقلاب کی کامیابی ان تحریکوں کے لیے ایک مثال بن گئی۔ اس انقلاب نے سیاسی تبدیلی کے لیے میدانی سطح پر متحرک ہونے اور مذہبی عقائد کی طاقت پر زور دیا۔

8.6.2 سیکولر حکومتوں کو چیلنج

ایرانی انقلاب خطے کی سیکولر حکومتوں، بالخصوص مغربی طاقتوں کی حمایت یافتہ حکومتوں کے لیے براہ راست چیلنج بن گیا۔ مصر، عراق اور شام جیسے ممالک جنھوں نے سیکولر پالیسیاں اپنائی تھیں، کو ایران کے انقلاب سے متاثر اسلام پسند گروہوں کے دباؤ کا سامنا کرنا پڑا۔ انقلاب نے ان حکومتوں کی کمزوری کو ظاہر کیا کیونکہ ان میں سے اکثر نے اقتدار میں رہنے کے لیے آمرانہ طریقے اپنائے تھے۔ اس کے جواب میں بہت سی سیکولر حکومتوں نے اسلام پسند تحریکوں پر سختی سے کریک ڈاؤن شروع کر دیا اور تشدد کا سلسلہ شروع ہوا۔ مثال کے طور پر، مصر، صدر انور سادات اور بعد میں حسنی مبارک کے دور میں اسی طرح کی بغاوت کے خوف سے اخوان المسلمون اور اسی طرح کے گروہوں کے خلاف تشدد اور جبر کیا جاتا رہا۔

8.6.3 مشرق وسطیٰ پر اثر

ایرانی انقلاب نے مشرق وسطیٰ میں طاقت کا توازن بدل دیا۔ ایران نے خود کو اسلامی دنیا کے رہنما اور مغربی اثر و رسوخ کا مقابلہ کرنے والی قوت کے طور پر پیش کیا۔ اس حیثیت نے پڑوسی ممالک کو تشویش میں مبتلا کر دیا جنھوں نے ایران کے اثر و رسوخ کو اپنے استحکام اور اختیار کے لیے خطرہ سمجھا۔ مورخین کا ماننا ہے کہ اس صورتحال نے خطے میں سنی اور شیعہ مسلمانوں کے درمیان فرقہ وارانہ کشیدگی میں بھی اضافہ کیا۔ سنی اکثریتی ممالک بالخصوص سعودی عرب نے شیعہ زیر قیادت ایران کو ایک خطرہ کے طور پر دیکھا اور مسلکی اختلافات نے خطہ میں سیاسی رخ اختیار کر لیا۔

8.6.4 مغرب کے ساتھ کشیدہ تعلقات

انقلاب کے بعد ایران اور مغرب کے تعلقات بہت متاثر ہوئے۔ خاص طور پر امریکہ کے ساتھ جو ایرانی سیاست میں شاہ کا مضبوط حمایتی تھا۔ انقلاب نے امریکہ اور ایران کے تعلقات کو مکمل طور پر ختم کر دیا۔ جس کے نتیجے میں سفارتی تناؤ پیدا ہوا۔ 1979ء میں امریکی سفارت خانے پر قبضہ کر لیا گیا۔ جہاں 52 / امریکیوں کو 444 دنوں تک قید رکھا گیا۔ اس ضمن میں یہ ایک سنگین موڑ تھا۔ اس واقعہ نے نہ صرف امریکہ اور ایران کے تعلقات کو نقصان پہنچایا بلکہ ایران میں امریکہ مخالف جذبات میں بھی اضافہ کیا کیونکہ نئی حکومت نے امریکہ کو ایران کی خود مختاری کے خلاف ایک سامراجی قوت قرار دیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ امریکہ نے ایران کے اثر و رسوخ کو روکنے کی کوشش کی۔ اس نے ایران کو ایک ایسی ریاست کے طور پر دیکھا جو دہشت گردی اور عدم استحکام کو فروغ دیتی ہے۔ اس کی وجہ سے محاذ آرائی ہوئی، بشمول ایران-عراق جنگ (1980ء-1988ء) جس میں امریکہ نے عراق کی حمایت کی۔

8.6.5 عالمی سیاست پر اثرات

ایرانی انقلاب کے اثرات محض مشرق وسطیٰ پر نہیں پڑے بلکہ عالمی سیاست اور بین الاقوامی تعلقات میں بھی تبدیلیاں آئیں۔ اس اسلامی انقلاب نے دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا میں غالب سیکولر اور لبرل نظریات کے لیے ایک نظریاتی چیلنج کھڑا کر دیا۔ انقلاب نے ظاہر کیا کہ مذہبی تحریکیں خصوصاً اسلامی تحریکیں لوگوں کو متحد کر سکتی ہیں اور وقت کے سیاسی نظام کو ہلا سکتی ہیں۔ اس واقعہ کے بعد مغربی ممالک نے مشرق وسطیٰ کے حوالے سے اپنی پالیسیوں پر نظر ثانی کی۔ اس کے زیر اثر لبنان میں حزب اللہ جیسے نئے غیر ریاستی کردار رکھنے والی جماعت کا عروج ہوا۔ جو ایران کا حمایت یافتہ گروہ ہے جو علاقائی سیاست میں بااثر ہوا اور اس نے حکومتی کنٹرول کو چیلنج کیا، خود مختاری کا نعرہ دیا اور ریاستی اختیار کی محدودیت پر بات کی۔

8.6.6 انقلابِ ایران ایک مثال

1979ء کے انقلاب نے ایک مضبوط مثال قائم کی جس نے مشرق وسطیٰ اور پوری دنیا میں گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ اسلامی تحریکوں کی نمو، ناانصافی اور ظلم و استبداد کے خلاف کوشش اور نظریاتی جدوجہد اس کا حصہ ہیں۔

معاشی چیلنجز

نئی حکومت کو اقتصادی مسائل کا سامنا کرنا پڑا جن میں افراط زر، بے روزگاری اور تیل کی گرتی ہوئی آمدنی شامل ہیں۔ ایران عراق جنگ (1980–1988) نے ان مسائل کو مزید خراب کیا اور ایران کے وسائل پر بہت زیادہ دباؤ ڈالا۔

8.7 انقلاب کے متعلق مختلف نقطہ ہائے نظر

1979ء کے انقلاب کو مختلف گروہوں نے مختلف طریقے سے سمجھا ہے۔ اسلام پسندوں نے اسے مغربی اثر و رسوخ پر اسلامی اقدار کی فتح کے طور پر دیکھا۔

بائیں بازو کے گروہوں نے ابتدائی طور پر شاہ کی حکومت کے خاتمے کی امید اور سماجی طبقات میں نابرابری کے خلاف مزاحمت کے نقطہ نظر سے انقلاب کی حمایت کی لیکن جلد ہی بچھڑ گئے۔

سیکولر ذہن شہری حقوق اور آزادیوں کے تئیں نئی تھیوکریٹک حکومت سے خوف زدہ اور ہوشیار تھا۔

بین الاقوامی سطح پر تبصرہ نگاروں نے انقلاب کو سرد جنگ کی عینک سے دیکھا۔ امریکہ اور اس کے اتحادیوں کو ایران کے مغرب مخالف رجحان پر سخت تشویش تھی۔

اس ضمن میں خواتین کا نقطہ نظر مختلف ہے۔ دورانِ انقلاب خواتین نے بڑے پیمانے پر اس جدوجہد میں حصہ لیا۔ بعد میں بھی وہ اجتماعی زندگی میں سرگرم رہیں۔ خواتین کا دوسرا نقطہ نظر، بعد میں اسلامی قوانین کے تحت نافذ کردہ پابندیوں کو دقیانوس اور روایت پرست

گردانتا ہے۔

8.8 ایرانی انقلاب کو اسلامی انقلاب کیوں کہا جاتا ہے؟

ایرانی انقلاب 1979ء کو کئی وجوہات کی بنا پر "اسلامی انقلاب" کہا جاتا ہے۔ جس میں اسلامی عقائد پر توجہ، مذہبی شخصیات کا اہم کردار، اسلامی اصولوں پر مبنی عوامی تحریک اور مذہبی حکومت کی تشکیل شامل ہیں۔ آیئے ان وجوہات کو تفصیل سے دیکھتے ہیں۔

1. نظریاتی بنیادیں

ایرانی انقلاب کے پس پشت اسلامی اقدار اور اصولوں پر مبنی نظریہ تھا۔ یہ انقلاب صرف سیاسی جبر یا معاشی مسائل سے لڑنے کے لیے نہیں تھا۔ بلکہ ایک ایسا معاشرہ تشکیل دینے کی جدوجہد کا نتیجہ تھا جو اسلامی عقائد کے مطابق ہو۔ آیت اللہ روح اللہ خمینی نے اسلامی تعلیمات پر مبنی حکومت کا وژن پیش کیا۔ انہوں نے "ولایت فقیہ" (اسلامی فقیہ کی نگہبانی) کا تصور پیش کیا۔ جس میں کہا گیا تھا کہ اسلامی فقیہ کو ملک کی قیادت کرنی چاہیے تاکہ تمام قوانین اور پالیسیاں اسلامی اصولوں کے مطابق ہوں۔ خمینی کی تقریروں اور تحریروں نے بہت سے لوگوں کو متاثر کیا، خاص طور پر شہر کے متوسط طبقے، طلبہ اور مذہبی آبادی نے انہیں بغور سنا۔ خمینی نے اخلاقی زوال اور مغربی اثر و رسوخ کے بالمقابل اسلامی حکومت کا تصور پیش کیا۔ یہ اسلامی نظریہ انقلاب کی ایک مضبوط بنیاد بن گیا۔

2. مذہبی رہنماؤں اور اداروں کا کردار

ایرانی انقلاب میں مذہبی رہنماؤں اور اداروں نے مرکزی کردار ادا کیا جس نے اسے واضح طور پر اسلامی بنا دیا۔ اس انقلاب کی قیادت علماء اور مذہبی اسکالرز نے کی۔ مختلف مذہبی تنظیموں نے مظاہروں کو منظم کرنے، انقلابی فکر کو پھیلانے اور اجتماعی کارروائی کے لیے منصوبہ تشکیل دے کر مدد کی۔ مساجد عوام کو متحرک کرنے کے مراکز بن گئیں۔ مساجد میں لوگ اسلامی حکومت کی ضرورت پر بات کرنے کے لیے جمع ہوتے تھے۔ مذہبی رہنماؤں اور اداروں کی اس قدر شمولیت نے انقلاب کی اسلامی نوعیت اور اسلامی سمت کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔

3. اسلامی اصولوں کی بنیاد پر متحرک ہونا

ایرانی انقلاب میں عوام کی شرکت قابل دید بتائی جاتی ہے۔ لاکھوں ایرانی شاہ کی حکومت کے خلاف مظاہروں میں شامل ہوتے۔ اس وسیع پیمانے پر شرکت کو اسلامی ریاست کے قیام کے مشترکہ مقصد کے طور پر دیکھا گیا۔ مختلف سماجی گروہ، بشمول طلبہ، کارکنان اور خواتین ایک ساتھ مل کر ایک اسلامی حکومت کے لیے پرزور حمایت کا اظہار کر رہے تھے۔

اس دور کے شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ احتجاج صرف معاشی مسائل پر نہیں تھا۔ عوام مذہبی جذبات سے بھی لبریز تھی۔ مثال کے طور پر مظاہرین نے "آزادی، آزادی، اسلامی جمہوریہ" جیسے نعرے لگائے۔ جو اسلامی اقدار کی پیروی کرنے والی حکومت کی تائید ہے۔

4. ایک تھیوکریٹک ریاست کا قیام

انقلاب کی کامیابی کے بعد ایران سرکاری طور پر اپریل 1979ء میں اسلامی جمہوریہ ایران بن گیا۔ جسے ایک تھیوکریٹک ریاست مانا گیا۔ یعنی ایسی ریاست جہاں مذہب اور عقائد کی بالادستی ہو۔ نئی حکومت نے اپنے قانونی اور سیاسی نظام کی بنیاد اسلامی قانون (شریعت) پر رکھی۔ 1979ء کے انقلاب نے مذہبی رہنماؤں کو سیاسی اقتدار پر کنٹرول دیا۔

نئی حکومت نے اسلامی قوانین اور پالیسیوں کو نافذ کیا جیسے کہ خواتین کا حجاب پہننا لازم قرار پایا اور اسلامی عدالتیں قائم ہوئیں۔ ان اقدامات نے انقلاب کے اسلامی تشخص کو مزید مستحکم کیا کیونکہ ریاست کا مقصد اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا معاشرہ تشکیل دینا تھا۔

5. علاقائی اور عالمی سیاست پر اثرات

ایرانی انقلاب کے اثرات ایران سے باہر تک پہنچے اور مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقہ میں اسلامی تحریکوں کو اور سیاسی حالات کو متاثر کیا۔ یہ انقلاب دنیا بھر میں اسلام پسند گروہوں کے لیے ایک ماڈل کے طور پر دیکھا گیا۔ دنیا بھر کی اسلامی تحریکات اور مذہبی قیادتوں نے انقلاب کا خیر مقدم کیا۔

8.9 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- قاجار اور پہلوی دور میں سماجی و اقتصادی تفاوت، سیاسی جبر اور ثقافتی تبدیلیوں نے 1979ء کے ایرانی انقلاب کے ظہور میں کس طرح اہم کردار ادا کیا۔
- ایرانی انقلاب نے نہ صرف ایران بلکہ مشرق وسطی اور عالمی سطح پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے۔
- 1979ء کے ایرانی انقلاب کا رخ اور مزاج اسلامی تھا۔

8.10 نمونہ امتحانی سوالات

8.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. 1979ء کے ایرانی انقلاب کا تاریخی پس منظر کس دور سے شروع ہوتا ہے؟

(a). صفوی دور (b). قاجاری دور (c). پہلوی دور (d). اسلامی دور

2. آئینی انقلاب (1905-1911) کا بنیادی مقصد کیا تھا؟

(a). بیرونی مداخلت کو روکنا (b). بادشاہت کی طاقت کو محدود کرنا اور پارلیمنٹ قائم کرنا

(c). جدیدیت اور سیکولرائزیشن کو فروغ دینا (d). مذہبی تعلیمات کو نافذ کرنا

3. رضا شاہ پہلوی کے دور حکومت میں "سفید انقلاب" کا بنیادی مقصد کیا تھا؟

(a). معاشرتی اصلاحات　　(b). ملک کو اسلامی اصولوں پر لانا

(c). ایران کو جدید بنانا اور معیشت میں ترقی لانا　　(d). عوام کو مکمل آزادی دینا

4. "ساواک" کیا تھی اور کس مقصد کے لیے قائم کی گئی؟

(a). تعلیمی ادارہ، نوجوانوں کی تعلیم کے لیے　　(b). سیکریٹ پولیس، سیاسی مخالفین کو دبانے کے لیے

(c). فوجی ادارہ، ملک کی حفاظت کے لیے　　(d). مالیاتی ادارہ، اقتصادی ترقی کے لیے

5. آیت اللہ خمینی کو ایران سے جلاوطن کب کیا گیا تھا؟

(a).1963　　(b).1964　　(c).1978　　(d).1979

6. کون سا تصور آیت اللہ خمینی نے پیش کیا جس کے مطابق علماء کو سیاسی اختیار حاصل ہونا چاہیے؟

(a). آئینی اصلاحات　　(b). اسلامی جمہوریت　　(c). انقلاب　　(d). ولایت فقیہ

7. 1977ء کے عاشورا کے اجتماعات کس مقصد کے لیے منعقد کیے گئے تھے؟

(a). شاہ کی حمایت کے لیے　　(b). سیاسی مخالفت کے اظہار کے لیے

(c). معاشی مسائل پر بحث کے لیے　　(d). اسلامی قوانین کے نفاذ کے لیے

8. ایرانی انقلاب کے نتیجے میں 1979ء میں کس قسم کی حکومت قائم ہوئی؟

(a). جمہوری　　(b). شاہی　　(c). تھیوکریٹک　　(d). کمیونسٹ

9. 1979ء ایرانی انقلاب کے نتیجے میں ایران میں کس قسم کی حکومت قائم ہوئی؟

(a). جمہوری حکومت　　(b). بادشاہت　　(c). سوشلسٹ حکومت　　(d). اسلامی جمہوریہ

10. ایران کے 1979ء کے انقلاب کا علاقائی اثر کیا تھا؟

(a). سیکولر تحریکوں کی حوصلہ افزائی　　(b). اسلامی تحریکوں کو تقویت دینا

(c). مغربی ممالک کے ساتھ تعلقات میں بہتری　　(d). قومی صنعتوں کی نجکاری

8.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. 1979 کے ایرانی انقلاب کے ذریعے لائی گئی اہم سماجی تبدیلیوں پر تبادلہ خیال کریں۔
2. وضاحت کریں کہ کس طرح 1979 کے ایرانی انقلاب نے مشرق وسطیٰ کی سیاست کو متاثر کیا۔
3. 1979 کے ایرانی انقلاب کے بارے میں اسلام پسندوں، بائیں بازو کے گروہوں اور سیکولر مفکرین کے مختلف نقطہ ہائے نظر کیا تھے؟
4. 1979 کے ایرانی انقلاب کو اکثر "اسلامی انقلاب" کیوں کہا جاتا ہے؟ اہم وجوہات پر روشنی ڈالیں۔

5. 1979 کے ایرانی انقلاب کی شناخت کو بنانے میں مذہبی رہنماؤں اور اداروں کے کردار کی وضاحت کریں۔

8.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. 1979 کے ایرانی انقلاب کی مختلف جہتوں کا تجزیہ کریں، بشمول ایرانی معاشرے پر اس کے سیاسی، ثقافتی، اقتصادی اور سماجی اثرات۔ ان تبدیلیوں نے نئی ایرانی ریاست کی تشکیل کیسے کی؟
2. 1979 کے ایرانی انقلاب کے علاقائی اور عالمی اثرات کا جائزہ لیں۔ اس نے اسلامی تحریکوں کو کیسے متاثر کیا، سیکولر حکومتوں کو چیلنج کیا، اور ایران کے مغربی ممالک بالخصوص امریکہ کے ساتھ تعلقات کو کیسے بدلا؟
3. 1979 کے ایرانی انقلاب کی نظریاتی بنیادوں اور مقاصد کا جائزہ لیں۔ مذہبی قیادت، عوامی شرکت، اور اسلامی ریاست کے قیام نے ایران کے اندر مختلف سماجی گروہوں کی خواہشات کی عکاسی کیسے کی۔

8.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد

.1	ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ جلد سوم	ثروت صولت
.2	اسلامی نظام حکومت اور ایران	اقتدار محمد خان
.3	انقلاب ایران	سید سبط حسن
.4	انقلاب ایران	ادیب الہندی
.5	ایران کا اسلامی انقلاب اور اس کا عالمی ردعمل	شہید صفی پوری
.6	ایران کا اسلامی انقلاب	ریاضت علی شائق

7. Abrahamian, E. (2008). *A History of Modern Iran*. Cambridge University Press.
8. Saulat, S. (2001). *Millat-e-Islamia ki Mukhtasar Tarikh* (Vol. 3). Markazi Maktaba Islami Publishers.
9. Hasan, S. S. (1980). *Inqilab-e-Iran*. Malik Noorani Publications.
10. Ishrat, A. L. (1967). *Iran Sadion ky Ayine me*. Amrat Lal Ishrat Publications.
11. Ashraf, A. (1946). *Iran Ki Bedari*. Progressive Books.

اکائی 9: انڈونیشیا: اجمالی تعارف

اکائی کے اجزا:

9.0 تمہید

9.1 مقاصد

9.2 خطے کا تعارف

9.2.1 مختصر تعارف

9.2.2 جغرافیہ

9.2.3 باشندے اور مذہب

9.3 مسلمانوں کی آمد اور اشاعت اسلام

9.3.1 جزیرہ سماترا میں اسلام کی اشاعت

9.3.2 جزیرہ جاوا میں اسلام کی اشاعت

9.3.3 مسلم حکومتوں کا قیام

9.3.4 سمدرا کی سلطنت

9.3.5 آچے کی سلطنت

9.3.6 دیماک کی سلطنت

9.3.7 ماترم کی سلطنت

9.3.8 بانتن کی سلطنت

9.4 مغربی استعمار اور اس سے آزادی

9.4.1 تحریک مزاحمت اور اس کے اہم رہنما

9.4.2 امام بونجول

9.4.3 دیپونی گورو
9.4.4 تحریک آزادی اور اس کے اہم رہنما
9.5 آزادی کے بعد انڈونیشیا
9.6 اکتسابی نتائج
9.7 نمونہ امتحانی سوالات
9.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
9.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
9.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
9.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

9.0 تمہید

انڈونیشیا ایک مجمع الجزائر (جزیروں کا مجموعہ) ہے۔ اس ملک میں دنیا کی سب سے بڑی مسلم آبادی رہتی ہے۔ اس خطے میں اسلام کی اشاعت زیادہ تر تیرہویں اور چودہویں صدی عیسوی کے دوران ہوئی۔ اشاعت اسلام میں اہم رول ہندوستانی اور عرب تاجروں کے ساتھ تبلیغ و اشاعت اسلام کے مقصد سے آنے والے علماء اور صوفیاء کا رہا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تبلیغی کوششوں کے نتیجے میں خطے کے کئی حکمرانوں نے اسلام قبول کیا اور ان میں سے کچھ نے تو اپنی زندگی کے آخری ایام اشاعت اسلام کے لیے وقف کر دیے۔ بعد میں تجارت کی غرض سے آنے والے ولندیزیوں (ڈچ تاجروں) نے اس خطے پر قبضہ کر لیا اور اسے ایک سیاسی وحدت کی شکل دی۔ بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں انڈونیشیا کی آزادی کی تحریک نے زور پکڑا اور صدی کے وسط میں اسے ڈچ استعمار سے آزادی ملی۔ آزادی کے بعد انڈونیشیا نے ایک آزاد اور خود مختار مسلم اکثریتی ریاست کے طور اپنی شناخت قائم کی ہے۔

9.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد انڈونیشیا کی موجودہ سیاسی وحدت کا اس کے مختلف پہلوؤں کے ساتھ اجمالی تعارف پیش کرنا ہے۔ اس اکائی کے مطالعے سے طلبہ انڈونیشیا کے جغرافیے اور آبادی کے ساتھ یہاں کے باشندوں کی تاریخ و ثقافت اور مذہب سے واقفیت حاصل کر سکیں گے۔ اس کے مطالعے سے طلبہ یہ بھی جان سکیں گے کہ موجودہ سیاسی وحدت کی شکل اختیار کرنے سے پہلے یہ ملک کن ناموں سے پکارا جاتا تھا؟ باشندے کون ہیں؟ مختلف ادوار میں یہاں کون سی حکومتیں قائم ہوئیں؟ ملک کی آزادی کے لیے کون سی کوششیں ہوئیں اور کن تحریکات

وافراد کا اس میں نمایاں رول رہا۔ اسی طرح طلبہ اس اکائی کے مطالعے کے بعد یہ بھی جان سکیں گے کہ آزادی کے بعد انڈونیشیا کا مسلم سماج کس طرح آگے بڑھ رہا ہے۔

9.2 خطے کا تعارف

9.2.1 مختصر تعارف

انڈونیشیا کا ملک جدید دور سے پہلے کبھی ایک سیاسی وحدت نہیں رہا۔ اس لیے انڈونیشیا کی تاریخ و ثقافت کو جاننے کے لیے ہندوستان کے مشرق میں موجود ان جزیروں (جنہیں جزائر شرق الہند کے نام سے جانا جاتا ہے) میں مختلف ادوار میں قائم ہونے والی سلطنتوں کی تاریخ کا جاننا ضروری ہے۔ البتہ انڈونیشیا میں تاریخ لکھنے کا رواج مسلمان حکومتوں کے قیام کے ساتھ ہوا اس لیے اس سے پہلے کی تاریخ آثار قدیمہ، چینی کہانیوں اور مقامی طور پر سینہ بہ سینہ منتقل ہونے والی داستانوں پر مبنی قیاس اور مفروضوں کی بنیاد پر لکھی جاتی ہے۔ مورخین انڈونیشیا کے تاریخی دور کا آغاز عیسوی صدی کی ابتدا یا اس سے کچھ پہلے کرتے ہیں جب ہندوستان خصوصاً جنوبی ہند سے ہندو اور بعض دیگر علاقوں سے بدھ تاجر اور مبلغین اس علاقے میں آنا اور آباد ہونا شروع ہوئے۔ ان لوگوں نے یہاں اپنی نوآبادیاں قائم کیں، اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت کا کام بھی کیا اور پھر حکومتیں بھی قائم کیں۔ البتہ ہندوستان کی طرح انڈونیشیا میں بھی بدھ مذہب زوال پذیر ہو گیا۔ اس دور کی اہم سلطنتوں میں سری دجایا، ماترم، کیدیری اور سنگوساری کا ذکر ملتا ہے۔ انڈونیشیا میں مسلم دور سے پہلے مجاپہت کی اہم اور بڑی سلطنت قائم تھی۔ اس کا قیام 1293 عیسوی میں جاوا میں ہوا اور 1428 تک قائم رہی۔ تیرہویں اور چودھویں صدی عیسوی میں انڈونیشا کے علاقے میں اسلام کی اشاعت شروع ہوئی اور بہت جلد یہاں کی بڑی آبادی مسلمان ہو گئی۔ جس طرح پہلے کے ادوار میں اس خطے میں چینی، ہندوستانی اور عرب باشندے تجارت کی غرض سے آتے رہے اور اپنی نوآبادیاں قائم کرتے رہے اسی طرح مسلم دور حکومت میں پندرہویں اور سولہویں صدی عیسوی کے دوران یورپی تاجروں نے بڑے پیمانے پر اس خطے کا رخ کیا اور بالآخر ولندیزیوں نے اس پورے خطے پر قبضہ کر کے اپنی حکومت قائم کر لی جو دوسری عالمی جنگ میں انڈونیشیا پر جاپانی قبضے اور پھر موجودہ قومی ریاست کے قیام تک باقی رہی۔

9.2.2 جغرافیہ

انڈونیشیا اور اس کے آس پاس کے جزیروں کے مجموعے کا قدیم نام نوسانتارا (یعنی درمیانی جزائر) ہے۔ یہ جزیرے ایشیا اور آسٹریلیا کے درمیان 3200 میل تک سمندری علاقے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس مجموعے کا سب سے بڑا جزیرہ بورنیو اور سب سے زیادہ آباد جزیرہ جاوا ہے۔ سماترا اور سلاویسی خطے کے دیگر بڑے اور اہم جزیرے ہیں۔ انڈونیشیا جزائر کے اس مجموعے کا نیا نام ہے۔ اس سے پہلے یہ ولندیزی (ڈچ) شرق الہند (Dutch East Indies) یا صرف شرق الہند (East Indies) کے ناموں سے جانا جاتا تھا۔ انڈونیشیا (Indonesia) کا لفظ یونانی زبان کے الفاظ Indos اور Nesos سے مل کر بنا ہے جس کا معنی Indian Island (ہندوستانی جزیرے) ہوتا ہے۔ خطے کو یہ نام یورپی ماہرین نسلیات نے دیا لیکن اسے زیادہ شہرت نہیں مل پائی۔ انڈونیشیا کے نام کو بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں اس وقت شہرت ملنے لگی

جب انڈونیشیا کے قوم پرست طلبہ اور رہنماؤں نے ولندیزی استعمار کے ذریعے دیے گئے نام Dutch East Indies (ولندیزی شرق الہند) کے بجائے انڈونیشیا نام کو سیاسی مقاصد کے اظہار کے لیے استعمال کرنا شروع کیا۔ سب سے پہلے ہالینڈ میں تعلیم کی غرض سے مقیم انڈونیشیا کی قومی تحریک کے طلبہ نے 1921 میں اپنی انجمن کا نام انڈونیشی مجلس رکھا اور اپنے ملک کو انڈونیشیا کہنے کی قرارداد منظور کی۔ 1945 میں آزادی کے اعلان کے ساتھ سرکاری طور پر ملک کا نام انڈونیشیا رکھا گیا۔

انڈونیشیا کے جزائر کا مجموعی رقبہ 1904,569 مربع کلومیٹر اور 2023 کی مردم شماری کے مطابق ملک کی آبادی 28 کروڑ سے زیادہ ہے۔ انڈونیشیا کے جزیروں کی کل تعداد 17 ہزار سے زیادہ ہے، جاوا، سماترا، سلاویسی، نیوگینی اور جزیرہ بورنیو کا ایک حصہ مل کر اس کے رقبے کا بڑا حصہ تشکیل دیتے ہیں۔ ملک کی کل آبادی کا نصف سے بھی زیادہ حصہ صرف جاوا کے جزیرے میں رہتا ہے جبکہ سماترا ملک کا دوسرا سب سے زیادہ آباد جزیرہ ہے۔ باقی جزیروں میں آبادی کم، بہت کم یا نہیں ہے اور وہ گھنے استوائی جنگلوں سے ڈھکے ہوئے ہیں۔

9.2.3 باشندے اور مذہب

انڈونیشیا کے قدیم باشندوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ زنگیوں کی ایک نسل سیاہ فام بونے تھے، یہ جنگلوں میں رہتے اور شکار پر ان کی گزر اوقات ہوتی تھی۔ ان کے بعد ہندوستان اور جنوب مشرق کے لوگوں کی مخلوط بادامی نسل جو جاوی کہلاتی ہے اس نے ان جزیروں کو اپنا مسکن بنایا۔ ان کے بعد کاکیشیا، منگولیا اور زنگی نسلوں کے ملاپ سے وجود میں آنے والی ملائی نسل یہاں آباد ہوئی، نیوگینی میں پاپوائی نسل کے لوگ آباد ہیں۔ موجودہ دور میں انڈونیشیا کے باشندوں کی اکثریت ملائی نسل سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ جاوی اور پاپوائی نسل کے لوگ بھی یہاں بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ ملک کے اندرونی جنگلی علاقوں میں قدیم زنگی نسل کے بونے اور دیگر لوگ بھی آباد ہیں۔

انڈونیشیا بنیادی طور پر ایک مذہبی ملک ہے۔ یہاں مختلف مذاہب کے لوگ آباد ہیں۔ البتہ ملک کے باشندوں کی بڑی اکثریت کا مذہب اسلام ہے۔ اسلام سے پہلے یہاں کے باشندوں کی اکثریت بودھ مت اور ہندو مت کی پیروکار تھی۔ ولندیزی دور میں یہاں پر سرکاری سرپرستی میں عیسائیت کو فروغ دیا گیا۔ مقامی مذہبی روایتیں بھی اندرون جنگلات موجود ہیں۔ فی الحال ملک میں مسلمانوں کا تناسب 87 فی صد، عیسائیوں کی آبادی 10 فی صد، ہندوؤں کی آبادی تقریباً 2 فی صد، بودھوں کی آبادی تقریباً 1 فی صد اور بقیہ 1 فی صد میں مقامی مذہبی روایتوں کے ماننے والے اور دیگر مذاہب کے لوگ شامل ہیں۔ ہندوؤں کی بڑی تعداد بالی کے جزیرے میں آباد ہے۔

انڈونیشیا مجمع الجزائر یعنی بڑی تعداد میں جزیروں کا ملک ہے اور اس کے مختلف جزیروں میں مختلف تہذیبوں اور نسلوں کے لوگ آباد ہیں اس لیے یہاں کثرت کے ساتھ زبانیں اور بولیاں بولی جاتی ہیں۔ یہاں بولی جانے والی زبانوں اور بولیوں کی تعداد ڈھائی سو کے قریب ہے، ان میں ملائی اور جاوی بڑی اور اہم زبانیں ہیں۔ جاوی آبادی کی اکثریت کی زبان ہے لیکن صرف جاوا کے جزیرے تک محدود ہے جب کہ ملائی زبان ملک کے تقریبا سبھی حصوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے، اسی لیے ملائی زبان کے انڈونیشی لہجے کو بھاسا انڈونیشیا کے نام سے قومی زبان کا درجہ دیا گیا ہے اور یہ پورے ملک کو ایک رشتے میں پرونے کا کام کرتی ہے۔ بھاسا انڈونیشیا لاطینی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے البتہ انڈونیشیا پر ولندیزی قبضے سے پہلے تک یہ زبان عربی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی۔

9.3 مسلمانوں کی آمد اور اشاعت اسلام

تیرہویں اور چودھویں صدی عیسوی کو تبلیغ و اشاعت اسلام کی دوسری لہر کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ساتویں صدی عیسوی (پہلی صدی ہجری) کے بعد اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا کام جس بڑے پیمانے پر ان دو صدیوں کے دوران ہوا، کسی بھی دوسرے دور میں نہیں ہوا۔ اس دوران ہی اسلام وسط ایشیا، مشرقی یورپ، افریقہ کے صحرائی اور جنوبی علاقوں، جنوبی ایشیا، اور جنوب مشرقی ایشیا کے علاقوں میں پھیلا اور یہ علاقے مسلمانوں کے زیر اقتدار آئے۔ یہی وہ صدیاں ہیں جب اسلام جنوب مشرقی ایشیا کے ان علاقوں میں پر امن طور پر پھیلا جو اب انڈونیشیا، ملائیشیا اور برونئی کے ملکوں کے طور جانے جاتے ہیں۔ اس خطے میں اشاعت اسلام کے حوالے سے یہ دل چسپ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ یہاں پر کبھی کوئی مسلمان فوج نہیں آئی، پورا خطہ مسلمان تاجروں اور ان مبلغوں کی پر امن دعوت کے زیر اثر اسلام کے سائے میں آیا جنہیں اولیاء اللہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

9.3.1 جزیرہ سماترا میں اسلام کی اشاعت

انڈونیشیا کے جزیروں میں اسلام کی اشاعت و تبلیغ کا پہلا دور عرب تاجروں کی کوششوں سے شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں سب سے پہلے اسلام ایک عرب مبلغ شیخ عبد اللہ عارف کے ذریعے سماترا کے جزیرے میں متعارف ہوا۔ شیخ عبد اللہ عارف کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بارہویں صدی کے نصف آخر میں سماترا پہنچے اور ان کی تبلیغی کوششوں کے نتیجے میں آچے کے کچھ لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ البتہ سماترا کے جزیرے میں بڑے پیمانے پر اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا کام شیخ عبد اللہ عارف کے نامور شاگرد و مرید شیخ برہان الدین نے کیا۔ انہوں نے مغربی اور جنوبی سماترا کے علاقوں میں اشاعت اسلام کا کام انجام دیا اور اس مقصد کے لیے ایک تعلیمی مرکز (مدرسہ) بھی قائم کیا جہاں نئے مسلمان ہونے والوں کو دینی تعلیم فراہم کی جاتی تھی۔ سماترا کے مختلف علاقوں میں اسلام کی اشاعت میں ان نو مسلم مبلغوں کا کردار بہت اہم ہے۔ ایک حجازی عالم شیخ اسماعیل نے بھی چودھویں صدی عیسوی کے دوران سماترا میں اسلام کی اشاعت کا کام بڑے پیمانے پر کیا۔ ان کی تبلیغ سے جزیرے کا ایک حکمراں (سمدرا کا راجہ) بھی مسلمان ہو گیا۔ مشہور عرب سیاح ابن بطوطہ جب 1345 عیسوی میں سماترا کے جزیرے میں پہنچا تو اس نے پایا کہ ساحلی علاقوں میں مسلمانوں کی کثیر آبادی ہے اور جزیرے کے اندرونی علاقوں میں بھی اسلام کی اشاعت تیزی کے ساتھ ہو رہی ہے۔ پندرہویں صدی عیسوی میں جزیرے کے کئی دیگر راجاؤں نے بھی مذہب اسلام اختیار کر لیا اور ان کی سرپرستی اور کوششوں سے پورے جزیرے میں اسلام پھیل گیا۔

9.3.2 جزیرہ جاوا میں اسلام کی اشاعت

جاوا انڈونیشیا کا ایک بڑا اور سب سے زیادہ آباد جزیرہ ہے۔ ملک کی تقریباً نصف آبادی اسی ایک جزیرے میں رہتی ہے۔ جاوا میں اسلام کی اشاعت سماترا کے بعد ہوئی۔ یہاں بھی اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا بنیادی کام تاجروں اور ان کے ساتھ آنے والے مسلمان مبلغوں کے ذریعے ہوا۔ ابتدا میں ان مبلغین کو کچھ زیادہ کامیابی نہیں ملی لیکن چودھویں صدی عیسوی کے دوران ایک گجراتی (ہندوستانی) تاجر اور

مبلغ ملک ابراہیم کی کوششوں سے اشاعت اسلام کی تحریک کو زبردست کامیابی ملی۔ انہوں نے مشرقی جاوا کے ایک ہندو راجہ کا علاج کیا جس سے متاثر ہو کر وہ نہ صرف مسلمان ہو گیا بلکہ اسلام کا بہت بڑا مبلغ بن گیا۔ راجہ کا اسلامی نام رادن رحمت رکھا گیا۔ جاوا میں ملک ابراہیم مولانا مغربی کے نام سے مشہور ہیں اور جزیرے میں جن نو اولیاء کے سر اشاعت اسلام کا سہرا بندھتا ہے مولانا مغربی ان میں پہلے ہیں اور رادن رحمت دوسرے۔ ان نو اولیاء اللہ کو مقامی زبان میں سونان کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے جس کا مطلب انڈونیشی زبان میں ولی ہوتا ہے۔ ان کے ناموں کی تفصیل اس طرح ہے:

1. ملک ابراہیم (مولانا مغربی): 1419 میں ان کا انتقال ہوا اور جاوا کے بندرگاہی شہر گریسک میں ان کا مزار ہے
2. رادن رحمت: ان کا مزار سورابایا کے قریب نمپل کی پہاڑی پر ہے اور یہ سونان نمپل کے نام سے مشہور ہیں
3. مخدوم ابراہیم: یہ رادن رحمت کے بیٹے تھے۔ ان کا سونان بونانگ کہا جاتا ہے
4. رادن پاکو: یہ سونان گیری کے نام سے مشہور ہیں اور گریسک کے قریب گیری کی پہاڑی پر مدفون ہیں
5. فتح اللہ: یہ سونان گننگ جاتی کے نام سے مشہور ہیں اور چریبون کے قریب گننگ جاتی نامی پہاڑی پر مدفون ہیں
6. سونان قدس: ان کا مزار ممیرانگ کے قریب قدس میں ہے
7. سونان موریا: یہ میدان جپارا کے قریب مدفون ہیں
8. سونان درجات: ان کا مزار نمپل کے قریب ہے
9. سونان کالی جاگا: ان کا مزار کالی جاگا کے مقام پر ہے

جاوا کے ان نو اولیاء اللہ کو خطے میں اسلام کے سب سے بڑے مبلغین میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان کی کوششوں سے ہی اس علاقے میں اسلام کی اشاعت ہوئی ان میں سے کئی حکمراں تھے یا ان کا تعلق شاہی گھرانوں سے تھا، جنہوں نے کاروبار حکومت چھوڑ کر تبلیغ و اشاعت اسلام کی خدمت انجام دی۔ سماٹرا اور جاوا کے مبلغوں نے ہی انڈونیشیا کے دوسرے جزیروں میں بھی اسلام کی دعوت کو عام کیا اور رفتہ رفتہ ان جزیروں کے باشندے بھی مسلمان ہو گئے۔

9.3.3 مسلم حکومتوں کا قیام

انڈونیشیا کی موجودہ سیاسی وحدت دور جدید کا مظہر ہے۔ مختلف اوقات میں اس کے مختلف جزیروں اور علاقوں میں مختلف حکومتیں قائم ہوتی رہیں بلکہ کئی بار ایسا بھی ہوتا کہ ایک ہی جزیرے میں متعدد حکومتیں قائم ہوتیں۔ خطے میں مسلمانوں کی آمد کے بعد بھی یہی صورت حال برقرار رہی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ خطے کے کئی حکمرانوں نے یا تو اسلام قبول کر لیا تھا یا کسی علاقے کے باشندوں کی اکثریت مسلمان ہو گئی اور انہوں نے اپنے کسی بڑے مبلغ کو اپنا حکمراں بنالیا یا بعض حکومتیں مسلمانوں نے مقامی حکمرانوں کو شکست دے کر قائم کیں۔ حکومتوں کے قیام کا انڈونیشیا کے سماج میں زندگی کے تمام شعبوں پر اثر پڑا، ان کے عقائد و نظریات میں بنیادی تبدیلی آئی، سماج سے لے کر علم و ادب اور سیاست تک تمام شعبوں میں اسلامی رنگ نظر آنے لگا۔ ذات پات کے نظام، غلامی، عورتوں کی حق تلفی وغیرہ کا خاتمہ

ہوا اور ایک نئی تہذیب و ثقافت نے اس علاقے میں جنم لیا۔ ذیل میں انڈونیشیا کے دو سب سے بڑے جزیروں، سوماترا اور جاوا، میں قائم ہونے والی کچھ مسلمان حکومتوں کا مختصر تعارف پیش کیا جا رہا ہے۔

9.3.4 سمدرا کی سلطنت

انڈونیشیا میں مسلمانوں کی پہلی حکومت ساترا جزیرے کے شمالی علاقے آچے کے سمدرا کے مقام پر قائم ہوئی۔ شیخ اسماعیل (جن کا ذکر پہلے ہو چکا) کی کوششوں سے سمدرا کا راجہ مسلمان ہو گیا اور اس کا اسلامی نام ملک الصالح (وفات 1297ء) رکھا گیا، یہ ساترا کے جزیرے میں پہلا مسلمان حکمراں تھا۔ اس نے اور اس کے جانشینوں نے اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لیے نمایاں خدمات انجام دیں البتہ یہ باج گزار حکمراں تھے (جاوا کی سلطنت مجاپہت کے) سمدرا کو مکمل خود مختاری سلطان زین العابدین (ملک الظاہر سوم) کے دور حکومت میں 1350 عیسوی میں ملی۔ سمدرا کے حکمرانوں کی خاص بات یہ تھی کہ ان سے ہر ایک نے اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لیے کام کیا۔ دوسرے حکمراں سلطان محمد (ملک الظاہر) نے اپنی زندگی اسلام کے لیے وقف کر دی تھی۔ اس نے سلطنت میں اسلامی قوانین نافذ کیے۔ اس کے جانشین سلطان احمد (ملک الظاہر دوم) نے دینی ادارے اور اسلامی مراکز قائم کیے اور اسلامی علوم و فنون کو ترقی دی۔ چوتھے حکمراں سلطان زین العابدین کے زمانے میں سلطنت میں امن و امان قائم ہوا، تجارت کو ترقی ملی اور خوش حالی آئی۔ اسی کے زمانے میں ابن بطوطہ ساترا پہنچا تھا اور ریاست کی خوش حالی اور دینی امور سے دل چسپی کی تعریف کی ہے۔ اس کے بعد سمدرا کی سلطنت کا زوال شروع ہو گیا۔

9.3.5 آچے کی سلطنت

ساترا میں مسلمانوں کی دوسری بڑی سلطنت آچے کی قائم ہوئی۔ اس کا قیام 1496 میں علی عنایت شاہ کے ذریعے ہوا اور 1874 میں ولندیزیوں کے قبضے تک برقرار رہی۔ یہ ساترا میں مسلمانوں کی سب سے بڑی اور طاقت ور سلطنت تھی۔ اس ریاست کے حکمرانوں نے رعایا کی فلاح و بہبود اور ریاست کی ترقی کے لیے بہت کام کیا۔ ان کے دور حکومت میں علوم و فنون اور خاص طور پر اسلامی علوم و فنون کو بڑے پیمانے پر فروغ ملا۔ اسے ساترا میں اسلام کی مرکزی طاقت کا درجہ حاصل تھا۔ آچے کی سلطنت کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ ریاست کے 34 حکمرانوں میں چار مسلم خواتین نے مسلسل تقریباً ساٹھ برس (1641ء سے لے کر 1699ء تک) تک حکمرانی کی۔ مسلم تاریخ میں یہ پہلی مثال ہے جب خواتین نے کسی ملک پر مسلسل اتنی طویل مدت تک حکومت کی۔

9.3.6 دیماک کی سلطنت

یوں تو جاوا کے جزیرے میں مسلمانوں کی پہلی حکومت امپل کے مقام پر قائم ہوئی جس کے حکمراں رادن رحمت نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ ان کا اور ان کے جانشین مخدوم ابراہیم کا شمار ان کی دینی خدمات کے سبب جاوا کے نو اولیا میں ہوتا ہے۔ البتہ ان کی حیثیت ایک امیر یا سردار سے زیادہ نہیں تھی۔ جاوا میں مسلمانوں کی پہلی اہم خود مختار حکومت اصلاً دیماک کی تھی جو 1428ء میں مجاپہت حکومت کی شکست کے بعد قائم ہوئی اور جس کا پہلا حکمراں رادن فاتح تھا۔ دیماک کی سلطنت 1578ء تک قائم رہی، یہ ایک سلطنت تھی اور اس میں کئی نامور حکمراں گزرے ہیں۔ ان حکمرانوں نے اسلامی طرز زندگی کو فروغ دینے کی کوشش کی اور اسلامی علوم کو ترقی دینے کے اقدامات کیے۔

آخری دور میں شہزادوں کے آپسی اختلافات اور باہمی خانہ جنگی کے سبب سلطنت کمزور ہو گئی یہاں تک کہ عام لوگ سلطان کے خلاف ہو گئے اور بغاوت کر دی جس کے نتیجے میں اسے اپنے سپہ سالار سنوپاتی کے حق میں دست بردار ہونا پڑا۔ دیماک کی جگہ ماترم کی مشہور سلطنت کا بانی یہی سنوپاتی ہے۔

9.3.7 ماترم کی سلطنت

جاوا کے جزیرے میں قائم ہونے والی مسلم حکومتوں میں سب بڑی اور اہم ماترم کی حکومت تھی۔ اس کا بانی سنوپاتی تھا جس کا تعلق ماترم کے پرانے حکمراں خاندان سے تھا اور اس نے ماترم کو ہی اپنا دار الحکومت بنایا۔ سنوپاتی نے اپنی حکومت کی توسیع بھی کی اور اسے مستحکم بھی کیا۔ البتہ ماترم کے حکمرانوں میں سب سے زیادہ شہرت اس کے پوتے سلطان آگنگ کو ملی جسے کہ انڈونیشیا کا عظیم ترین مسلم حکمراں باور کیا جاتا ہے۔ اس کے دور حکومت میں ماترم کی ریاست کے تعلقات پڑوسی ریاستوں سے دوستانہ اور مضبوط ہوئے اور اس نے باہری طاقتوں کو ماترم کی حدود میں قدم جمانے کا موقع نہیں دیا۔ اس نے انڈونیشی جزیروں کو متحد کر کے ایک وسیع مملکت قائم کرنے کی کوشش کی اسی طرح اس نے جاوا کے جزیرے میں اسلامی تہذیب و تمدن کے فروغ کے لیے بھی کام کیا۔ البتہ 1645ء میں سلطان آگنگ کی وفات کے بعد اس کے جانشین حکومت کے اہل ثابت نہ ہو سکے، رفتہ رفتہ ان کی طاقت کمزور پڑتی چلی گئی، ولندیزیوں کو تجارتی و دیگر مراعات اتنی زیادہ دے دی گئیں کہ ریاست کے اندرونی معاملات میں بھی ان کا عمل دخل بڑھتا چلا گیا، انہوں نے ریاست کے حکمرانوں کے پاس برائے نام اختیارات رہنے دیے، اسے سوراکارتا اور جوگجاکارتا دو حصوں میں تقسیم کر دیا اور ان کی حیثیت ولندیزیوں کی بالادستی والی مقامی ریاستوں جیسی ہو گئی۔

9.3.8 بانتن کی سلطنت

جاوا میں قائم ہونے والی مسلمانوں کی دوسری بڑی سلطنت بانتن کی تھی یہ مشرقی جاوا کے علاقے میں قائم ہوئی اور اس کے بانی مشہور عالم دین اور مبلغ فتح اللہ (مقامی زبان میں انہیں پاتح ہلا کہتے ہیں جو غالبا فتح اللہ کی بگڑی ہوئی شکل ہے) تھے۔ ان کی رشتہ داری دیماک کے شاہی خاندان میں تھی اور دیماک کی سلطنت کی توسیع میں ان کا اہم کردار رہا تھا۔ انہوں نے مشرقی جاوا کی کئی ہندو ریاستوں کو فتح کر کے بانتن نامی شہر میں ایک آزاد حکومت قائم کی جو اپنے دار الحکومت کی نسبت سے بانتن کی سلطنت کہلاتی ہے۔ فتح اللہ ایک دین دار حکمراں تھے، انہوں نے تبلیغ و اشاعت دین کے مقصد سے 1552ء میں حومت اپنے بیٹے حسن الدین کے حوالے کر دی تھی اور اپنی وفات تک 18 برس جاوا کے علاقے میں تبلیغ دین کا کام کرتے رہے۔ ان کا شمار انڈونیشیا کے نو اولیاء میں ہوتا ہے اور سونان گننگ جاتی کے نام سے مشہور ہیں، ان کا مزار چری بون میں ہے۔ بانتن کی سلطنت کے دوسرے اہم حکمراں سلطان حسن الدین ہیں، انہوں نے بانتن کی سلطنت میں توسیع کی، حکومت اسلامی اصولوں کے مطابق چلائی، سلطنت میں مسجدیں، مدرسے، سرائیں اور باغات تعمیر کیے۔ والد کی طرح انہیں بھی دین سے خاص شغف تھا، بڑی تعداد میں علماء کو بانتن بلایا اور عربی علم و ادب کی سرپرستی کی۔ ان کے دور حکومت میں بانتن کو ایک بڑے تجارتی مرکز کے طور پر فروغ ملا اور بانتن گرم مسالوں کی تجارت کا بڑا مرکز بن گیا۔ مولانا حسن الدین نے بھی اپنے والد کی طرح 1570ء میں حکومت چھوڑ دی تھی اور باقی عمر تبلیغ و اشاعت دین میں گزاری۔ بعد کے دنوں میں بانتن کی ریاست میں دھیرے دھیرے ولندیزیوں کی

دخل اندازی بڑھتی چلی گئی اور بالآخر 1687ء میں ریاست پوری طرح ولندیزیوں کے قبضے میں چلی گئی۔

9.4 مغربی استعمار اور اس سے آزادی

انڈونیشیا قدرتی وسائل سے بھرپور علاقہ ہے۔ اپنے گرم مسالوں اور دوسری تجارتی چیزوں کی فراوانی کے لیے قدیم زمانے سے مشہور ہے۔ مختلف ملکوں کے تاجر قدیم زمانے سے یہاں آتے جاتے رہے ہیں، البتہ پہلے کے زمانے میں یہاں کی تجارتی سرگرمیوں میں عرب، ہندوستانی اور چینی تاجروں کا حصہ زیادہ ہوتا تھا۔ یورپی ملکوں تک اس علاقے کے گرم مسالے اور تجارتی اشیاء زیادہ تر انہیں تاجروں سے پہنچتی تھیں۔ صنعتی و سائنسی ترقی کے سبب جب یورپ کے ملکوں کو عروج حاصل ہوا تو وہاں کے تاجروں نے بھی اس علاقے کا رخ کرنا شروع کیا۔ یورپی اقوام میں سے سب سے پہلے پرتگالی تاجر واسکوڈی گاما کی پیروی میں اس خطے میں پہنچے۔ واسکوڈی گاما نے 1498ء میں سب سے پہلے کچھ انڈونیشی جزیروں کا چکر لگایا تھا اس کی پرتگال واپسی کے بعد ہی پرتگالی تاجروں نے ان جزیروں کا رخ کیا۔ انہوں نے سب سے پہلے اس خطے سے عربوں اور ہندوستانیوں کی تجارتی سرگرمیوں کا خاتمہ کیا۔ پرتگالیوں نے تجارت کے ساتھ ساتھ ان جزائر پر اپنا سیاسی اقتدار بھی قائم کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے تجارتی کوٹھیوں کے نام پر ساحلی علاقوں میں بڑے بڑے فوجی قلعے تعمیر کر لیے۔

اسپینی (ہسپانوی) تجارت میں پرتگالیوں کے حریف تھے، 1522ء میں وہ بھی پرتگالیوں کے پیچھے پیچھے انڈونیشیا کے علاقے میں پہنچ گئے اور یہاں پر تجارت کرنے کے ساتھ ساتھ بعض جزیروں پر بھی قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ خطے میں بالادستی کو لے کر پرتگالیوں اور ہسپانویوں کے درمیان جنگیں بھی ہوئیں اور بالآخر 1540ء میں پرتگالیوں نے ہسپانویوں کو شکست دے کر خطے سے نکال دیا۔ ولندیزی اور انگریز تاجر انڈونیشیا میں کسی قدر تاخیر سے داخل ہوئے۔ 1595ء میں ولندیزیوں کا پہلا تجارتی بیڑہ انڈونیشیا کی حدود میں داخل ہوا اور یہاں کامیاب تجارتی سرگرمیاں انجام دینے کے بعد ہالینڈ واپس لوٹا۔ ادھر اپنے تاجروں کا انڈونیشیا میں بڑھتی ہوئی دلچسپی کو دیکھ کر ہالینڈ کی حکومت نے مارچ 1602ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے ایک تجارتی کمپنی قائم کر دی۔ کمپنی کے قیام کا مقصد ولندیزیوں کی تجات کو بحر ہند میں منظم کرنا اور انہیں تحفظ فراہم کرنا تھا۔ کمپنی کو بڑے پیمانے پر رعایتیں دی گئیں، اسے وسیع اختیارات دیے گئے، تجارت پر اجارہ داری قائم کی گئی، محاصل معاف یا کم کیے گئے، فوج رکھنے اور نوآبادیاں قائم کرنے کے اختیارت بھی دیے گئے۔ انہیں اختیارات کے تحت کمپنی کے لوگوں نے مختلف مقامی ریاستوں کے ساتھ پہلے تجارتی معاہدے کیے، تجارتی تحفظ کے نام پر قلعے نما کوٹھیاں قائم کیں اور ان میں فوج رکھی اور پھر رفتہ رفتہ انڈونیشیا کے بیشتر جزیروں پر قابض ہو گئے یہاں تک کہ جاوا اور سماترا جیسے بڑے جزیروں میں قائم بڑی بڑی مسلم ریاستوں پر بھی انہوں نے قبضہ کر کے اپنی کالونی بنالیا۔

انڈونیشیا کے علاقے پر ولندیزیوں کا قبضہ دو طرح کا تھا۔ ایک براہ راست مقبوضات یعنی جن کا نظم ونسق براہ راست ان کے ہاتھ میں تھا۔ دوسرا بالواسطہ مقبوضات یعنی جن پر ولندیزی بالواسطہ طور پر مقامی دیسی حکمرانوں کے ذریعے حکومت کرتے تھے۔ ولندیزیوں نے انڈونیشیا کے زیادہ علاقوں پر براہ راست حکومت نہیں قائم کی بلکہ زیادہ تر علاقوں میں چھوٹے مقامی حکمرانوں کو محدود اختیارات کے ساتھ

باقی رکھا، اس طرح کی دیسی ریاستوں کی تعداد 282 تھی۔ ہر ریاست میں ولندیزی ناظم ہوتا تھا جس کے مشورے کے دیسی حکمراں پابند ہوتے تھے یعنی ریاست کا اصل حکمراں ولندیزی ناظم ہوا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ دیسی حکمراں کے تقرر اور معزولی کا اختیار بھی انڈونیشیا کے ولندیزی گورنر جنرل کو ہوتا تھا۔

9.4.1 تحریک مزاحمت اور اس کے اہم رہنما

انڈونیشیا میں ولندیزی استعمار کی کامیابی کی بنیادی وجہ وہاں کے حکمرانوں کے باہمی اختلافات اور تنازعات تھے۔ وہ مقامی طور پر منتشر اور بکھرے ہوئے تھے، وہ سیاسی شعور سے بھی عاری تھے یہاں تک کہ ایک دوسرے کی مخالفت میں ولندیزی سازشوں کے ادراک سے بھی قاصر تھے جب کہ دوسری طرف ولندیزی ایک تربیت یافتہ فوج کے ساتھ بہترین اسلحے اور طاقت ور بحری بیڑے سے لیس تھے اور وہ اپنی تجارتی اور قومی مفاد کے تحفظ او حصول کے لیے ہر ممکن جد وجہد کرتے تھے۔ حکمرانوں کی نااہلی اور عوامی زبوں حالی کے باوجود انڈونیشیا میں علماء اور باشعور افراد کا ایک ایسا طبقہ موجود تھا جسے ولندیزی عزائم اور سازشوں کا بخوبی اندازہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب ولندیزیوں کی سرگرمیاں تجارت و معیشت سے بڑھ کر سیاست و حکومت میں مداخلت کے حدود میں داخل ہونے لگیں بلکہ سیاسی اقتدار کا فائدہ اٹھاتے ہوئے جب مشنریوں کے ذریعہ مذہب کی جبری تبلیغ کی جانے لگی تو ان لوگوں نے اپنی سطح پر خاص طور پر انڈونیشیا کے مرکزی جزیروں جاوا اور ساترا میں مزاحمتی تحریکیں شروع کیں۔ مزاحمتی تحریکوں کی قیادت علماء کے ہاتھ میں تھی اس لیے انہیں تحریک جہاد کا نام دیا گیا۔

9.4.2 امام بونجول

انڈونیشیا پر ولندیزی کے خلاف سب سے پہلی تحریک مزاحمت ساترا کے جزیرے میں شروع ہوئی۔ اس تحریک کے بانی ور ہنما امام بونجول (Imam Bondjol) تھے۔ یہ آچے کی ریاست کے مشہور اور بااثر عالم دین تھے۔ 1772ء میں آچے میں بونجول کے مقام پر پیدا ہوئے، خاندان میں علم و فضل کا سلسلہ پہلے سے جاری تھا، انہوں نے خود بھی اعلی مذہبی تعلیم حاصل کی اور ایک بڑے عالم وفقیہ کے طور پر شہرت حاصل کی۔ ان کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ جزیرے میں ولندیزی اثر اور دخل اندازی کو دیکھ کر انہوں نے اپنے شاگردوں کے تعاون سے ولندیزی مخالف تحریک کا آغاز کیا، اس تحریک کا مرکز انہوں نے ایک پہاڑی علاقے میں بنایا اور جب مقامی عوام وخواص کی ایک بڑی تعداد ان کی تحریک میں شامل ہوگئی تو انہوں نے مزاحمت کاروں کی باقاعدہ ایک فوج تیار کی۔ امام بونجول کی جدوجہد کا آغاز 1823ء میں ہوا اور تحریک کے آغاز میں انہیں ولندیزیوں کے خلاف کامیابی بھی ملی اور وہ علاقے میں ایک بڑی ریاست قائم کرنے میں بھی کامیاب ہوگئے۔ البتہ ولندیزی سازشوں، اسلحے اور تربیت کی برتری اور مقامی غداروں کے سبب ابتدائی کامیابی کے باوجود ولندیزیوں کے مقابلے انہیں شکست ہوئی۔ 1837ء میں ایک جنگ میں وہ قید کر لیے گئے، حالاں کہ شکست کے بعد بھی ان کے ساتھیوں نے تحریک جہاد جاری رکھی اور انتہائی مشکل حالات کے باوجود ایک طویل عرصے تک ولندیزیوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ ستائیس برس تک قید و بند کی مصیبتیں جھیلتے ہوئے قید کی حالت میں ہی 1864ء میں امام بونجول کا انتقال ہوا۔ بلاشبہ وہ انڈونیشیا پر بیرونی قبضے کے خلاف تحریک مزاحمت کے عظیم رہنما تھے اور اسی سبب سے انہیں انڈونیشیا میں ایک قومی ہیرو کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔

9.4.3 دیپونی گورو

انڈونیشیا میں ولندیزی قبضے اور استعمار کے خلاف سماترا کی طرح ہی جاوا کے جزیرے میں بھی تحریک مزاحمت شروع ہوئی۔ جاوا کی تحریک مزاحمت کے رہنما دیپونی گوروتھے۔ یہ بھی ایک نامور عالم دین تھے، ان کا تعلق ماترم کی ریاست کے شاہی خاندان سے تھا البتہ انہوں نے ایک محکوم و مجبور امیر بننے کے بجائے تبلیغ و جہاد کے راستے کو اختیار کیا۔ دیپونی گورو 1785ء میں ماترم میں پیدا ہوئے۔ شاہی محل میں ان کی تعلیم و تربیت اور پرورش ہوئی لیکن انہوں نے امور سلطنت پر دین کی خدمت کو ترجیح دی اور اپنے ملک کو ولندیزیوں کے قبضے سے آزادی دلانے کے مقصد سے ایک منظم تحریک شروع کی۔ اس تحریک کا مقصد "اسلام کے لیے جینا اور اسلام کے لیے مرنا" تھا۔ انہوں نے علماء کی ایک جماعت تیار کی جو انڈونیشیا کے عوام کو ولندیزیوں کے سامراجی مقاصد اور ان کی جابرانہ و جارحانہ پالیسیوں سے آگاہ کرتی تھی اور انہیں اس سے نبرد آزما ہونے کے طریقے بھی بتاتی تھی۔ تحریک کو منظم کرنے اور مزاحمت کے لیے تیاری کے بعد دیپونی گورو نے 1825ء میں ولندیزیوں کے خلاف باقاعدہ مسلح مزاحمت کا اعلان کیا، عوام کی جانب سے جہاد کی اپیل کا استقبال ہوا اور لوگوں نے پر جوش انداز میں ان کا ساتھ دیا۔ ولندیزیوں نے یہاں بھی اسلحہ اور فوجی تربیت کی برتری کے باوجود سازش اور غداروں کا سہارا لیا۔ اس کے باوجود مزاحمت کاروں کو ابتدا میں زبردست کامیابی ملی لیکن ان کے پاس سازش اور دھوکے کا مقابلہ کرنے کے لیے کوئی اسلحہ نہیں تھا چنانچہ 1830ء میں ولندیزیوں نے دھوکا دے کر دیپونی گورو کو گرفتار کر لیا۔ انہیں سلاویسی کے مکاسر علاقے، جہاں عیسائیوں کی اکثریت تھی، میں جلاوطن کر کے قید کر دیا گیا، وہیں 1835ء میں دیپونی گورو کا انتقال ہوا۔

9.4.4 تحریک آزادی اور اس کے اہم رہنما

بیسویں صدی عیسوی کا آغاز استعماری قبضے والے دیگر ملکوں کی طرح انڈونیشیا کے لوگوں کے لیے بھی ایک نئی صبح امید کا پیغام لے کر آیا۔ اس صدی کے آغاز میں اگر ایک طرف مغربی استعمار کا طلسم ٹوٹنا شروع ہوا تو دوسری طرف مقبوضہ ممالک میں بھی آزادی کے حصول کا جذبہ ترقی کرنے لگا۔ انڈونیشیا میں بھی ولندیزی استعمار کے تحت قائم ہونے والی سیاسی وحدت نے یہاں کے مختلف جزیروں کے عوام کو ایک دوسرے سے قریب آنے کا موقع فراہم کیا اور انہیں متحد ہو کر قابض ملک کے خلاف آزادی کی جدوجہد شروع کرنے پر آمادہ کیا۔ ولندیزیوں کے سامراجی استحصال اور عیسائیت کے فروغ کی جبری مذہبی پالیسی نے اس میں مزید شدت پیدا کی۔ اس عمل میں جہاں ایک طرف عالمی سطح پر اتحاد اسلامی کی کوششوں کا بڑا رول رہا وہیں انڈونیشیا میں مغربی نظریہ قومیت کی ترویج و اشاعت نے بھی انڈونیشیا کے لوگوں میں سیاسی شعور اور قومی آزادی کا جذبہ پیدا کیا اور انہوں نے مل کر آزادی کی ایک نئی تحریک کا آغاز کیا جسے انڈونیشیا کی جدید تحریک آزادی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حاجی وحی الدین کو انڈونیشیا کی جدید قومی تحریک کا پہلا رہنما سمجھا جاتا ہے جنہوں نے اپنے دست راست ڈاکٹر سوتوموکے ساتھ مل کر ولندیزی سامراج کے خلاف زبردست تحریک چلائی۔ انڈونیشیا کی قومی تحریک آزادی کو انقلابی رخ دینے میں حاجی عمر سعید کا کلیدی رول رہا انہوں نے شرکت اسلام نامی جماعت قائم کر کے انڈونیشی نوجوانوں کی سیاسی و عملی تربیت کی اور انہیں آزادی سے بہت قریب کر دیا۔ البتہ انڈونیشیا کو مکمل آزادی دلانے کا سہرا احمد سوکارنو اور محمد حتا جیسے قومی رہنماؤں کے سر بندھتا ہے جن کی رہنمائی میں

انڈونیشیا نے پہلے دوسری عالمی جنگ 17 اگست 1945ء کو اپنی آزادی کا اعلان کیا۔ دوسری عالمی جنگ میں اتحادیوں کی فتح کے بعد ہالینڈ کو ایک بار پھر انڈونیشیا پر مسلط کرنے کی کوشش کی گئی لیکن انڈونیشیا کے قومی رہنماؤں نے اس کی بھرپور مزاحمت کی اور بالآخر 27 دسمبر 1949ء کو انڈونیشیا کو ایک آزاد و خود مختار ملک تسلیم کروانے میں کامیاب ہو گئے۔

9.5 آزادی کے بعد انڈونیشیا

انڈونیشیا کو مرحلہ وار آزادی حاصل ہوئی۔ سب سے پہلے 1945ء میں جاپانی قبضے کے دوران ملک کے سب سے بڑے سیاسی رہنما احمد سوکارنو نے دوسرے انڈونیشی رہنماؤں کے ساتھ مل کر انڈونیشیا کے ایک آزاد جمہوریہ کے طور پر قیام کا اعلان کیا اور انڈونیشیا کے پہلے صدر کے طور پر کام کرنا شروع کیا۔ حکومت چلانے کے لیے انہوں نے ایک عارضی دستور بھی نافذ کیا۔ دوسری عالمی جنگ میں جاپان کی شکست اور اتحادی طاقتوں کی کامیابی سے ایک بار پھر انڈونیشیا کی آزادی خطرے میں پڑ گئی کیوں کہ برطانیہ کی مدد سے ہالینڈ دوبارہ انڈونیشیا کے اقتدار اعلیٰ پر قبضہ جمانا چاہتا تھا جب کہ انڈونیشیا کی قومی قیادت اپنی آزادی کا دفاع کر رہی تھی۔ 1949ء کے آخر تک انڈونیشیا کے لوگ اپنی آزادی کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہو گئے اور نومبر 1949ء میں انڈونیشیا کا دوسرا دستور نافذ ہوا، اس دستور کے تحت انڈونیشیا ایک وفاقی جمہوریہ قرار پایا۔ مکمل آزادی کے بعد 17 اگست 1950ء کو انڈونیشیا کا تیسرا آئین نافذ ہوا، اس کے تحت انڈونیشیا میں ایک وحدانی مرکزی حکومت قائم ہوئی۔ واضح رہے کہ انڈونیشیا کا آئین صدر سوکارنو کے پانچ اصولوں پر مبنی ہے جنہیں انڈونیشی زبان میں پنج شیلا کہتے ہیں، یہ اصول انہوں نے جون 1945ء میں انڈونیشی مجلس برائے اہتمام آزادی کے سامنے مستقبل کے انڈونیشیا کی فکری اساس کے طور پر پیش کیا تھا تاکہ اسے انڈونیشیا کی دستور سازی کی آسانی ہو۔ پنج شیلا کا مطلب ہے: 1۔ توحید یا ایک خدا کا اقرار یعنی ضمیر اور مذہب کی آزادی 2۔ قوم پرستی یا قومیت کی ترقی 3۔ جمہوریت یعنی نمائندہ حکومت کا قیام 4۔ انسان دوستی یا بین الاقوامیت کا فروغ 5۔ معاشرتی انصاف

صدر سوکارنو نے آغاز کار میں عوامی جمہوریت کی نہ صرف حمایت کی بلکہ اسے فروغ دینے میں اہم رول بھی ادا کیا۔ جاپانی قبضے کے دوران انڈونیشیا میں سیاسی جماعتوں پر پابندی عائد تھی، آزادی کے اعلان کے ساتھ یہ پابندی ختم کر دی گئی، ملک کی سابق سیاسی پارٹیاں بحال ہو گئیں اور نئی سیاسی پارٹیاں بھی قائم ہوئیں۔ ان میں چار اہم تھیں:

انڈونیشی قومی پارٹی

خالص قوم پرست جماعت، یہ 1927ء میں قائم ہوئی اور اس کے بانی صدر سوکارنو تھے۔ قوم پرستی کے ساتھ اس جماعت کا رجحان اشتراکیت کی جانب تھا۔

مجلس شوریٰ مسلم انڈونیشیا یا ماشومی پارٹی

نومبر 1945ء میں قائم ہوئی، شرکت اسلام پارٹی کا توسیعہ کہی جا سکتی ہے کیوں کہ اس کے بانی شرکت اسلام کے ہی ایک رہنما ڈاکٹر محمد سوکیمان تھے اور وہی اس کے پہلے صدر بھی منتخب ہوئے۔ یہ پارٹی اسلام کو ایک مکمل نظام حیات کے طور پر دیکھتی تھی اور انڈونیشیا کو

ایک اسلامی جمہوریہ بنانے کی خواہاں تھی۔

نہضۃ العلماء

1926ء میں قائم ہونے والی یہ روایتی انڈونیشی علماء کی جماعت ہے۔ مذہبی جماعت ہونے کی وجہ سے جاپانی قبضے کے دوران اس پر پابندی نہیں تھی، آزادی کے بعد نہضۃ العلماء نے سیاسی جماعت کے طور پر بھی کام کرنا شروع کیا۔

کمیونسٹ پارٹی

انڈونیشیا میں کمیونسٹ پارٹی 1914ء میں قائم ہوئی تھی۔ 1926 میں ایک ناکام انقلاب کی بھی کوشش کی، جاپانی قبضے کے دوران اس کے رہنما روپوش ہوگئے۔ اکتوبر 1945ء میں از سر نو قائم ہوئی۔

آزادی کے بعد انڈونیشیا میں پہلے آزادانہ انتخابات 1955ء میں ہوئے، ان انتخابات میں سبھی سیاسی پارٹیاں شامل ہوئیں لیکن نمایاں کامیابی مذکورہ چاروں پارٹیوں کو ہی ملی۔ صدر سوکارنو حالاں کہ ایک قوم پرست اور جمہوریت کے وکیل رہنما کے طور پر ابھرے تھے لیکن دھیرے دھیرے ان کا انداز حکمرانی آمریت کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ انہوں نے مختلف طریقوں سے غیر معمولی اختیارات حاصل کر لیے، کئی سیاسی پارٹیوں پر پابندی عائد کر دی، پارلیامنٹ معطل کر دی اور انتخابات بھی ملتوی کر دیے اور ایک خانہ زاد مشاورتی کانگریس بنا کر حکومت کرتے رہے۔ صدر سوکارنو کے غیر جمہوری اقدامات اور طریقہ کار نے ملک میں کرپشن اور بدامنی کو جنم دیا، معیشت دن بہ دن خراب ہونے لگی اور عوامی بے چینی میں اضافہ ہوا۔ 1966ء میں انڈونیشی طلبہ نے سوکارنو کے خلاف بڑے پیمانے پر مظاہرے کیے جن سے مجبور ہو کر انہوں نے بیشتر اختیارات فوجی جنرل سوہارتو کے حوالے کر دیے بعد ازاں 1967ء میں انہیں صدارت سے معزول کر دیا گیا اور جنرل سوہارتو صدر منتخب کر لیے گئے۔

سوہارتو کے دور حکومت کے ابتدائی برسوں میں انڈونیشیا کے حالات میں سدھار آیا۔ انہوں نے معیشت کی بحالی کی طرف خاص توجہ دی، زرعی و صنعتی اصلاحات کیں جن کی وجہ سے پیداوار میں اضافہ ہوا اور بے روزگاری میں بھی کمی واقع ہوئی اور ملک ترقی کے راستے پر چل پڑا۔ لیکن جنرل سوہارتو نے بھی آگے چل کر انہیں غلطیوں کو دہرانا شروع کر دیا جن کی وجہ سے سوکارنو کو اقتدار سے محروم ہونا پڑا تھا۔ انہوں نے بھی سیاسی مخالفت کو کچلنا شروع کر دیا، مختلف حربوں کو استعمال کرتے ہوئے غیر معمولی سیاسی اختیارات حاصل کر لیے، نامزدگی کے ذریعے اپنی سیاسی پارٹی کی پارلیامنٹ میں اکثریت کو یقینی بنالیا، جس کے نتیجے میں ملک ایک بار پھر کرپشن اور بدامنی کا شکار ہو گیا۔ معیشت پوری طرح تباہی کے دہانے پر پہنچ گئی، ان حالات میں سیاسی پارٹیوں کے علاوہ طلبہ میں بھی ان کے خلاف بے چینی پیدا ہو گئی اور 1998 کے آغاز میں ان کے خلاف بڑے پیمانے پر مظاہرے شروع ہو گئے۔ مجبوراً انہیں بھی اپنے پیش رو سوکارنو کی طرح اقتدار سے مستعفی ہونا پڑا اور انڈونیشیا میں سیاسی آزادی بحال ہوئی۔

سوہارتو کے بعد سے انڈونیشیا میں سیاسی آزادی بحال ہے، پابندی کے ساتھ ملک میں انتخابات ہو رہے ہیں اور سیاسی پارٹیوں کو ان

میں شرکت کی پوری آزادی ہے، اس وقت سے مختلف سیاسی جماعتیں اور ان کے رہنما اقتدار میں آتے رہے ہیں۔ بعض مشکلات کے باوجود انڈونیشیا جمہوریت اور تعمیر و ترقی کے راستے پر گامزن ہے۔

انڈونیشیا کی اہم مذہبی جماعتیں

انڈونیشیا کا کوئی بھی تعارف اس وقت تک ادھورا رہے گا جب تک کہ اس میں وہاں کی اہم مذہبی جماعت کا ذکر شامل نہ ہو۔ ایسا اس وجہ سے ہے کہ انڈونیشیا کے سماج میں مذہب کی جڑیں بہت گہری ہیں، وہاں کے لوگ مذہب سے عقیدت بھی رکھتے ہیں اور اپنی روزمرہ کی زندگی میں اس پر عمل بھی کرتے ہیں۔ ذیل میں انڈونیشیا کی دو سب سے بڑی مذہبی جماعتوں کا بہت ہی مختصر تعارف پیش کیا جارہا ہے۔

جمعیۃ محمدیہ

جمعیۃ محمدیہ انڈونیشیا کی دو سب سے بڑی مذہبی جماعتوں میں سے ایک ہے۔ اس کے بانی حاجی احمد دحلان تھے جو شرکت اسلام پارٹی کے رہنماؤں میں سے ایک تھے۔ جمعیۃ محمدیہ کا قیام 1912ء میں جزیرہ جاوا کے شہر جکارتا میں عمل میں آیا، اس جماعت نے انڈونیشیا میں مذہبی و معاشرتی اصلاح، تعلیم اور ثقافت کے شعبوں میں نمایاں کام کیا ہے۔ جمعیۃ محمدیہ مختلف اوقات میں سیاست کے شعبے میں بھی سرگرم رہی ہے البتہ مذہبی و سماجی اصلاح کے اپنے کردار کی ہمیشہ حفاظت بھی ہے۔ یہ غیر اسلامی رسوم و عقائد اور جامد تقلید کی مخالفت کرتی ہے، قرآن مجید کو ایک زندہ رہنما کتاب کے طور پر پیش کرتی ہے، جاوی اور ملائی زبانوں میں قرآن کے ترجمہ و اشاعت کا کام کیا ہے اور اسلام کو ایک مکمل نظام حیات باور کرتی ہے۔ ان بنیادی مقاصد کے ساتھ جمعیۃ محمدیہ نے اسلامی اصولوں کو نظام تعلیم کی اساس بنایا ہے، مدارس کے نظام میں اصلاح کی ہے اور اسے جدید تقاضوں کے مطابق بنایا ہے، تنظیم کے زیر انتظام مدارس میں جدید اور قدیم دونوں طرح کی تعلیم ہوتی ہے۔ جدید طرز کے محمدیہ مدارس کا پورے انڈونیشیا میں ایک جال بچھا دیا ہے، اسکول، کالج، یونی ورسٹیاں قائم کی ہیں اور تعلیم کے فروغ کے لیے بڑے پیمانے پر کام کیا ہے۔ عورتوں کی تعلیم اور حقوق پر خاص توجہ دی ہے، انہیں با اختیار بنانے اور منظم کرنے کے لیے جمعیۃ عائشہ کے نام سے خواتین کی الگ تنظیم قائم کی ہے۔ ذرائع ابلاغ کی اہمیت بھی تنظیم کے پیش نظر ہے، مختلف اخبار و رسائل اور علمی جرائد کے علاوہ الکٹرانک اور سوشل میڈیا پر بھی اس کے افراد سرگرم ہیں۔ تعلیم کے ساتھ صحت اور رفاہی امور میں بھی جمعیۃ محمدیہ کی خدمات قابل ستائش ہیں۔ اس کا نتیجہ ہے کہ تنظیم کی سماج کے شہری اور تعلیم یافتہ طبقوں میں گرفت بہت مضبوط ہے، شبیہ صاف ستھری اور اچھی ہے اور اس کی سرگرمیاں عام طور پر رضاکارانہ ہوتی ہیں۔

نہضۃ العلماء

نہضۃ العلماء انڈونیشیا کی سب سے بڑی مذہبی تنظیم باور کی جاتی ہے۔ بنیادی طور پر یہ انڈونیشیا کے روایتی مذہبی علماء کی تنظیم ہے۔ اس کے محرک اول شرکت اسلام کے ہی ایک رہنما حسب اللہ عبد الوہاب تھے جنہوں نے 1916ء میں نہضۃ الوطن کے نام سے روایتی علماء کو متحد کرنے کی کوشش شروع کی البتہ انہیں اس میں کامیابی 1926ء میں اس وقت ملی جب انڈونیشیا کے قد آور روایتی مذہبی عالم ہاشم اشعری کو وہ علماء کی تنظیم بنانے پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اس طرح انڈونیشیا کے مذہبی طبقے کی سب سے بڑی تنظیم نہضۃ العلماء کا

قیام عمل میں آیا اور ہاشم اشعری ہی اس کے پہلے صدر (رئیس اکبر) قرار پائے۔ نہضۃ العلماء انڈونیشیا کے مقبول ترین مذہبی جماعت ہے اور ملک کے دیہی علاقوں میں اس کی جڑیں بہت مضبوط ہیں۔ انڈونیشیا کی قومی بے داری اور آزادی کی تحریک میں بھی نہضۃ العلماء کا اہم رول رہا ہے۔ اس تنظیم نے اہل سنت والجماعت کے وسیع دائرے میں رہتے ہوئے انڈونیشیا کے مسلم سماج کو جوڑنے کا اہم کام کیا ہے۔ اہل سنت کے چاروں مروجہ مسالک کو تسلیم کرتے ہوئے نہضۃ العلماء نے مذہبی اصلاح اور تعلیم کے فروغ پر خاص توجہ دی ہے۔ نہضۃ العلماء کی عوامی مقبولیت کا راز خود کو عوامی مسائل و مشکلات سے جوڑے رکھنا اور ہر موقعے پر ان کے ساتھ کھڑا رہنا ہے۔ تنظیم کی مقبولیت کی پشت پر وہ روایتی مذہبی مدارس اور علماء بھی ہیں جو عوام کی مذہبی امور میں رہنمائی کرتے ہیں۔ نہضۃ العلماء کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ اس نے عوام کی مذہبی ضروریات سے خود کو ہم آہنگ کیا ہے۔ روایتی تعلیم کے علاوہ مساجد، خانقاہوں کا انتظام و انصرام بھی کرتی ہے جن کے گرد کہ انڈونیشیا کی دیہی ثقافت پروان چڑھتی ہے۔ یتیموں، بیواؤں اور غریبوں کی دیکھ بھال کے علاوہ نہضۃ العلماء نے جدید تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کے ہوسٹلوں کے قیام، جدید طرز کے اسکولوں کالجوں اور یونی ورسٹیوں کے قیام پر بھی توجہ دی ہے۔ قیام کے بعد سے ہی نہضۃ العلماء نے اصلاح و ترقی کے لیے اپنے دروازے کھلے رکھے ہیں، مثلاً مدارس کو جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا ہے، اسی طرح مسلسل ایسے اقدامات کرتی رہی ہے جو سماج کے لیے اسے سود مند بنائے رکھیں۔ نہضۃ العلماء سیاست میں بھی سرگرم رہی ہے، کئی بار مذہبی امور کی وزارت بھی اس کے رہنماؤں کے پاس رہی ہے، اس کے رئیس اکبر عبدالرحمان واحد ملک کے صدر بھی منتخب ہوئے البتہ بحیثیت مجموعی نہضۃ العلماء کو انڈونیشیا کی سیاست راس نہیں آئی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ کئی بار اس نے خود کو سرگرم سیاست سے الگ رکھنے کے فیصلے بھی کیے ہیں۔

9.6 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- انڈونیشیا کے علاقے کی قدیم تاریخ و ثقافت، اس کا جغرافیہ، باشندے اور زبانیں وغیرہ۔
- انڈونیشیا کے علاقے میں اسلام کی آمد کے وقت کے حالات، اشاعت اسلام، مسلم حکومتوں کا قیام وغیرہ
- انڈونیشیا کے علاقے میں مسلمانوں کا زوال، مغربی نوآبادیاتی دور کا آغاز، انڈونیشیا کی جدید سیاسی وحدت کا قیام وغیرہ
- مغربی استعمار کے خلاف انڈونیشی مسلمانوں کی مزاحمت، آزادی کی تحریک اور حصول آزادی وغیرہ
- آزادی کے بعد کی صورت حال، سیاسی و مذہبی جماعتیں وغیرہ۔

9.7 نمونہ امتحانی سوالات

9.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. انڈونیشیا کا قدیم نام کیا تھا؟

(a). انڈونیشیا (b)شرق الہند (c)مجمع الجزائر (d)نوسانتار

2. انڈونیشیا میں تاریخ لکھنے کا رواج کس نے شروع کیا؟

(a). چینیوں نے (b)ہندوؤں نے (c)مسلمانوں نے (d)بودھوں نے

3. انڈونیشیا کا سب سے زیادہ آباد جزیرہ کون سا ہے؟

(a). جاوا (b)سماترا (c)سلاویسی (d)بالی

4. انڈونیشیا کے باشندوں کی اکثریت کا مذہب کیا ہے؟

(a). مظاہر پرستی (b)اسلام (c)ہندومت (d)بودھ مت

5. انڈونیشی زبان میں سونان کا مطلب ہوتا ہے؟

(a). ولی (b). خدا (c). شیطان (d). فرشتہ

6. مسلمانوں کی پہلی حکومت انڈونیشیا کے کس جزیرے میں قائم ہوئی؟

(a). جاوا (b). سماترا (c). بالی (d). نیوگینی

7. انڈونیشیا کی پہلی مزاحمتی تحریک کے بانی تھے؟

(a). عمر سعید (b). دیپونی گورو (c). رادن رحمت (d). امام بونجول

8. جاوا کے نو اولیاء میں پہلے ہیں؟

(a). ملک ابراہیم (b). رادن رحمت (c). فتح اللہ (d). فضل اللہ

9. انڈونیشیا کے آئین کی بنیاد ہے؟

(a). سیکولرزم (b). سوشلزم (c). پنچ شیلا (d). پنچ تنترا

10. جمعیۃ محمدیہ کے بانی ہیں؟

(a). حسب اللہ (b). حاجی احمد دحلان (c). حاجی عمر سعید (d). اشم اشعری

9.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. انڈونیشیا کے قدیم باشندوں کے بارے میں لکھیے۔
2. انڈونیشیا میں اسلام کے اشاعت سے متعلق نو اولیا کے نام لکھیے۔
3. بانتن کی سلطنت پر مختصر نوٹ لکھیے۔
4. آزادی کے بعد انڈونیشیا کی چار اہم سیاسی جماعتیں کون سی تھیں؟ لکھیے۔

5. دیپونی گورو کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ لکھیے۔

9.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. انڈونیشیا میں اشاعت اسلام کی کوششوں کا جائزہ لیجیے۔
2. انڈونیشیا کی مغربی استعمار کے خلاف تحریک مزاحمت پر روشنی ڈالیے۔
3. انڈونیشیا کی مذہبی جماعتوں کا تعارف کرائیے۔

9.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

---

1. انڈونیشیا : شاہد حسین رزاقی
2. اسلام کی احیائی تحریکیں اور عالم اسلام : سید قاسم محمود
3. دنیائے اسلام کا مختصر تعارف : مہر گل محمد
4. جغرافیہ عالم اسلام : پروفیسر ماجد حسین
5. ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ جلد دوم و سوم : ثروت صولت
6. سہ روزہ دعوت کا مسلم دنیا نمبر۔

اکائی 10: ملیشیا اور برونائی: اجمالی تعارف

اکائی کے اجزا:

10.0 تمہید

10.1 مقاصد

10.2 خطے کا تعارف

10.2.1 مختصر تعارف

10.2.2 جغرافیہ

10.2.3 باشندے اور مذہب

10.3 مسلمانوں کی آمد اور اشاعت اسلام

10.3.1 جزیرہ نمائے ملایا میں اسلام کی اشاعت اور مسلم حکومتوں کا قیام

10.3.2 ملکا کی سلطنت

10.3.3 جوہور کی سلطنت

10.3.4 برونئی میں اسلام کی اشاعت اور مسلم حکومت کا قیام

10.4 مغربی استعمار سے آزادی اور تعمیر و ترقی

10.4.1 ملائیشیا پر استعماری قبضہ

10.4.2 استعمار سے آزادی

10.4.3 نئے وفاق (ملائیشیا) کی تشکیل

10.4.4 سیاسی استحکام اور تعمیر و ترقی

10.4.5 مثالی مسلم ریاست

10.4.6 برونئی: استعمار کے زیر انتظام

10.4.7 حصول آزادی اور خود مختاری
10.4.8 تعمیر و ترقی کے راستے پر
10.5 اکتسابی نتائج
10.6 نمونہ امتحانی سوالات
10.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
10.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
10.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
10.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

10.0 تمہید

انڈونیشیا کی طرح ملائیشیا اور برونئی کا تعلق بھی جنوب مشرقی ایشیا کے خطے سے ہے اور یہ دونوں ملک بھی انڈونیشیا کی طرح مسلم اکثریتی آبادی والے ملک ہیں۔ خطے کے ان ملکوں میں اسلام کی اشاعت چودھویں اور پندرہویں صدی عیسوی میں ہوئی اور اشاعت اسلام میں اہم رول عرب اور ہندوستانی تاجروں کے ساتھ ان کے ساتھ آنے والے مبلغین کا رہا۔ ان مبلغین کی کوششوں سے خطے کے کئی حکمرانوں نے بھی اسلام قبول کرلیا اور خود بھی اشاعت اسلام کے کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ یہاں پر مسلمانوں کی چھوٹی بڑی کئی حکومتیں بھی قائم ہوئیں البتہ خطے کی دیگر ریاستوں کی طرح آگے چل کر یہ بھی یورپی استعماری طاقتوں کے زیر نگیں آگئیں۔ ان میں کچھ ریاستیں براہ راست یورپی خاص طور پر برطانوی استعمار کے قبضے میں تھیں اور کچھ پر ان کی بالواسطہ حکمرانی تھی۔ بیسویں صدی کے آغاز میں یہاں بھی آزادی کی تحریکات شروع ہوئیں البتہ انھیں آزادی کافی بعد میں یعنی ملائیشیا کو 1957ء میں اور برونئی کو 1984ء میں حاصل ہوئی۔ آزادی کے بعد اب یہ خود مختار ریاست کے طور پر تعمیر و ترقی کے راستے پر گامزن ہیں۔

10.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد ملائیشیا اور برونئی کی مسلم ریاستوں کا اجمالی تعارف پیش کرنا ہے۔ اس اکائی کے مطالعے کے بعد طلبہ میں یہ صلاحیت پیدا ہو سکے گی کہ وہ ان ملکوں کی تاریخ و ثقافت، ان کے جغرافیے اور آبادی کے ساتھ ان کے مذہب اور طرز سیاست سے بھی واقف ہو جائیں۔ یہ اکائی طلبہ کی رہنمائی اس جانب بھی کرے گی کہ یہ ملک کب اور کس طرح اپنی موجودہ شکل میں وجود میں آئے؟ انھیں یہاں تک پہنچنے میں کن کن مراحل سے گزرنا پڑا؟ کون سی تحریکات اور افراد تھے جن کا ان کی آزادی میں رول رہا؟ اور آزادی کے بعد یہ کن

خطوط پر آگے بڑھ رہے ہیں؟ ساتھ ہی ان ملکوں میں مستقبل کے امکانات کیا ہیں۔

10.2 خطے کا تعارف

10.2.1 مختصر تعارف

ملائیشیا اور برونئی کی قومی ریاستیں بھی انڈونیشیا کی طرح دور جدید کا ظاہرہ ہیں۔ ان کی موجودہ سیاسی شکل یورپی (برطانوی) استعمار کی دین ہے۔ ان ملکوں کی تاریخ و ثقافت شرق الہند کے جزائر کی تاریخ و ثقافت سے وابستہ ہے۔ ملائیشیا اور برونئی کی تاریخ بھی ان علاقوں میں مسلم حکومتوں کے قیام کے بعد لکھی گئی ہے۔ مسلمانوں سے قبل کی تاریخ و ثقافت کو جاننے کا ذریعہ یا تو آثار قدیمہ ہیں یا پھر وہ مقامی روایات اور کہانیاں جو سینہ بہ سینہ نسل در نسل منتقل ہوتی رہی ہیں۔ جزیرہ نمائے ملایا اور بورنیو کی تاریخ کا آغاز قیاس یہ ہے کہ پہلی صدی عیسوی کے آس پاس ہوتا ہے۔ گمان غالب یہ ہے کہ پہلی صدی کے آغاز کے ساتھ ہندوستانی اور چینی تاجر اور نو آبادکار ان علاقوں میں وارد ہوئے ہوں گے۔ بعض ایسے شواہد موجود ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ دوسری اور تیسری صدی عیسوی تک ہندوستانی اور چینی نو آبادکار خطے کے ساحلی علاقوں میں آباد ہو کر اپنی بستیاں بسا چکے تھے۔ ہندوستانی آبادکار مذہبی طور پر ہندو اور بودھ مت کے پیروکار تھے، ان کے مبلغین نے اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت بھی کی اور پھر اپنی حکومتیں بھی قائم کیں۔ اس دوران جزیرہ نما ملایا اور جزیرہ بورنیو، جس کے ایک حصے پر جدید ملائیشیا کی دو ریاستیں (ساراواک اور صباح) اور برونئی کا ملک آباد ہیں، میں کئی ہندو ریاستوں کے قیام کا پتہ چلتا ہے اور ان سے کچھ تو ایسی تھیں کہ جو چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی تک قائم رہیں۔ ابتدائی دور کی بڑی ہندو سلطنت لنگا سکا تھی جو دوسو عیسوی میں جزیرہ نمائے ملایا میں قائم ہوئی، اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے راجہ اشوک کے خاندان کے لوگوں نے قائم کیا تھا۔ ایک اور اہم سلطنت سری وجایا کی تھی جس کی جانشین بعد میں مجاپہت کی سلطنت ہوئی۔ یہ قائم تو موجودہ انڈونیشیا کے علاقوں میں ہوئیں البتہ ان کا دائرہ اختیار موجودہ ملائیشیا اور برونئی کے علاقوں تک پھیلا ہوا تھا۔

موجودہ ملائیشیا اور برونئی میں اسلام کے ابتدائی آثار دسویں صدی عیسوی سے ملنے شروع ہو جاتے ہیں جب عرب اور گجراتی مسلمان تاجر اس علاقے میں آنا شروع ہوئے البتہ اسلام کی باقاعدہ اشاعت و تبلیغ کا کام زیادہ تر چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی کے دوران ہوا۔ مسلمانوں کی تبلیغی کوششوں سے عوام و خواص دونوں میں اسلام پھیلا یہاں تک کہ جزیرہ نمائے ملایا کے شہر ملکا میں قائم ہندو سلطنت کے شاہی خاندان کے لوگوں نے بھی اسلام قبول کر لیا اور اس طرح یہاں مسلمانوں کی پہلی حکومت قائم ہوئی جو سلطنت ملکا کے نام سے مشہور ہوئی۔

10.2.2 جغرافیہ

ملائیشیا: انڈونیشیا کے شمال میں واقع ہے۔ بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم ہے، ایک مغربی ملائیشیا جس میں کہ جزیرہ نمائے ملایا کی گیارہ ریاستیں اور دو وفاقی علاقے شامل ہیں اور دوسرا مشرقی ملائیشیا جس میں جزیرہ بورنیو کی دو ریاستیں اور ایک وفاقی علاقہ شامل ہیں۔ مغربی

اور مشرقی ملائیشیا کو جنوبی بحیرہ چین الگ کرتا ہے۔ ملائیشیا کی موجودہ سیاسی شکل 1963 میں وجود میں آئی۔ 1957 میں آزادی کے وقت اس کے وفاق میں گیارہ ریاستیں شامل تھیں اور اسے فیڈریشن آف ملایا کے نام سے جانا جاتا تھا۔ 1963 میں وفاق میں تین مزید ریاستیں سنگاپور، صباح اور ساراواک شامل ہوئیں تب اسے فیڈریشن آف ملائیشیا کا نام دیا گیا۔ بعد میں 1965 میں سنگاپور ملائیشیا کے وفاق سے الگ ہو گیا۔ وفاق کی ریاستوں کے نام یہ ہیں: جوہور، کیدہ، کیلنتان، ملکا، نیگیری سمبیلان، پہانگ، پنانگ، پیراک، پیرلس، سیلانگور، تیرنگالو یہ 11 ریاستیں جزیرہ نمائے ملایا میں واقع ہیں اور صباح اور ساراواک کی 2 ریاستیں جزیرہ بورنیو میں واقع ہیں۔ وفاق کے زیر انتظام تین علاقے یہ ہیں: کولالمپور، پتراجایا یہ دونوں علاقے جزیرہ نمائے ملایا میں ہیں اور لابوان کا وفاقی علاقہ بورنیو میں ہے۔

برونئی دارالسلام: جنوب مشرقی ایشیا کا ایک چھوٹا مگر بہت ہی خوش حال ملک ہے۔ بورنیو کے جزیرے پر شمال کی جانب جنوبی بحیرہ چین کے کنارے واقع ہے۔ بورنیو کے جزیرے پر واقع واحد خود مختار ملک ہے جب کہ جزیرے کے بقیہ علاقے انڈونیشیا اور ملائیشیا کے درمیان منقسم ہیں۔ برونئی کا کل رقبہ 5765 مربع کلومیٹر (2226 مربع میل) ہے۔ ملک کا دارالحکومت بندر سیری بگاوان ہے۔ 1888 سے لے کر 1984 تک برطانیہ کے زیر انتظام محروسہ علاقہ رہا ہے۔ یکم جنوری 1984 کو مکمل خود مختاری ملی ہے اور دستوری مگر مطلق العنان بادشاہت قائم ہے۔

10.2.3 باشندے اور مذہب

ملائیشیا اور برونئی کے بیشتر علاقے قدیم زمانے میں گھنے استوائی جنگلوں سے ڈھکے ہوئے تھے جہاں زنگی نسل کے سیاہ فام بونے آباد تھے۔ ان لوگوں کی گزر بسر جنگلی پیداوار اور شکار پر تھی۔ ان کے علاوہ جنوب مشرق کے مخلوط بادامی نسل کے لوگ بھی یہاں آباد تھے۔ بعد میں ہندوستانیوں اور چینیوں نے جب اس علاقے کو اپنا مسکن بنایا تو ان کے اور مقامی لوگوں کے اختلاط سے ملائی نسل وجود میں آئی اور یہی اب ان ملکوں کی اکثریتی آبادی ہے۔ ملائی نسل کے لوگوں کی نسبت سے ہی یہ پورا علاقہ ملایا یعنی ملائی لوگوں کا وطن کہلاتا ہے، ملائی باشندوں کا تناسب 57 فیصد اور مقامی جاوی 13 فیصد ہیں، چینی نسل کے 23 فیصد اور ہندوستانی نسل کے تقریبا 7 فیصد ہیں۔ ملائیشیا کے ساتھ برونئی کے باشندوں کی اکثریت بھی ملائی نسل سے تعلق رکھتی ہے یعنی ملائی 74 فیصد، چینی تقریبا 10 فیصد اور دیگر (مقامی) 16 فیصد کے قریب ہیں۔

جنوب مشرقی ایشیا کا پورا علاقہ مذہب کی سرزمین ہے۔ مختلف مذاہب کے پیروکار اس خطے میں آباد ہیں اور یہی اس کی خوبصورتی ہے۔ جہاں تک ملائیشیا کا تعلق ہے یہاں کے باشندوں کی اکثریت یعنی 63 فیصد مسلمان ہیں، 19 فیصد کے قریب بودھ، 9 فیصد عیسائی اور 7 فیصد کے قریب ہندو ہیں۔ برونئی میں 82 فیصد سے زیادہ مسلمان، 7 فیصد کے قریب عیسائی اور 6 فیصد سے زیادہ بودھ ہیں۔ ملائیشیا اور برونئی کے مختلف علاقوں میں ملائی زبان کے مختلف لہجے، کچھ جگہوں پر چینی زبان کے مختلف لہجے اور انگریزی زبانیں بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔

10.3 مسلمانوں کی آمد اور اشاعت اسلام

تیرہویں اور چودہویں صدی عیسوی کو تبلیغ و اشاعت اسلام کی دوسری لہر کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ساتویں

صدی عیسوی (پہلی صدی ہجری) کے بعد اسلام کی تبلیغ واشاعت کا کام جس بڑے پیانے پر ان دو صدیوں کے دوران ہوا، کسی بھی دوسرے دور میں نہیں ہوا۔ اس دوران ہی اسلام وسط ایشیا، مشرقی یورپ، افریقہ کے صحرائی اور جنوبی علاقوں، جنوبی ایشیا، اور جنوب مشرقی ایشیا کے علاقوں میں پھیلا اور یہ علاقے مسلمانوں کے زیر اقتدار آئے۔ یہی وہ صدیاں ہیں جب اسلام جنوب مشرقی ایشیا کے ان علاقوں میں پرامن طور پر پھیلا جو اب انڈونیشیا، ملیشیا اور برونئی کے ملکوں کے طور جانے جاتے ہیں۔ اس خطے میں اشاعت اسلام کے حوالے سے یہ دلچسپ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ یہاں پر کبھی کوئی مسلمان فوج نہیں آئی، پورا خطہ مسلمان تاجروں اور ان مبلغوں کی پرامن دعوت کے زیر اثر اسلام کے سائے میں آیا جنھیں اولیاء اللہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

10.3.1 جزیرہ نمائے ملایا میں اسلام کی اشاعت اور مسلم حکومتوں کا قیام

ملائیشیا کی مقامی روایات جزیرہ نمائے ملایا میں اسلام کے ابتدائی نقوش ساتویں صدی عیسوی (پہلی صدی ہجری) میں تلاش کرتی ہیں۔ ان کے مطابق اس جزیرہ نما میں اسلام عہد صحابہ و تابعین میں ہی متعارف ہو چکا تھا۔ البتہ حالیہ دریافت شدہ تاریخی شواہد بتاتے ہیں کہ جزیرہ نمائے ملایا اور اطراف کے علاقوں میں اسلام کے پیروکار (مسلمان) دسویں صدی عیسوی میں موجود تھے۔ البتہ خطے میں اسلام کی عمومی اشاعت تیرہویں اور چودھویں صدی عیسوی میں ہوئی جب عرب اور ہندوستانی تاجروں کے ساتھ میل جول اور ان کے ساتھ آنے والے مبلغین کی مساعی کے نتیجے میں خطے کے بعض شاہی خاندانوں میں اسلام کی اشاعت ہوئی۔ ان میں سب سے زیادہ شہرت ملاکا کی سلطنت کو حاصل ہوئی۔

10.3.2 ملاکا کی سلطنت

انڈونیشی جزیرہ جاوا کی مجاپہت سلطنت کے زوال کے بعد وہاں کے ہندو شاہی خاندان کے کچھ لوگ جلاوطن ہو کر جزیرہ نمائے ملایا کے ساحلی شہر ملاکا میں سکونت اختیار کرلی۔ ملاکا کا شہر پہلے مجاپہت سلطنت کا حصہ رہ چکا تھا اور یہاں پر عرب مسلمان پہلے سے تجارتی مقاصد سے آباد تھے۔ ملاکا میں جلاوطنی کے دوران مجاپہت سلطنت کے شاہی خاندان کے بیشتر لوگ ان عرب مسلمانوں کے زیر اثر مسلمان ہو گئے، انھیں میں ان کا شہزادہ پرامیشور بھی تھا جو ملاکا کی سلطنت کا بانی ہے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد شہزادہ پرامیشور نے اپنا نام بدل کر اسکندر شاہ رکھ لیا اور ملاکا پر 1396ء سے 1414ء تک اٹھارہ برس حکومت کی۔ اس کے دور حکومت میں جزیرہ نمائے ملایا کے مختلف علاقوں میں تیزی کے ساتھ اسلام کو فروغ حاصل ہوا۔ اسکندر شاہ کے جانشینوں نے 1511ء تک ملاکا پر حکومت کی۔ مسلمان ہونے کے باوجود ملاکا کے حکمران راجہ کہلاتے تھے، مظفر شاہ (1445ء تا 1458ء) پہلا حکمران ہے جس نے سلطان کا لقب اختیار کیا۔ البتہ ملاکا کے حکمرانوں میں سلطان منصور شاہ (1458ء تا 1477ء) کو سب سے زیادہ شہرت ملی، اس کا دور حکومت ملاکا سلطنت (Malacca Sultanate) کا عہد زریں کہلاتا ہے، اسی کے زمانے میں شمالی بورنیو کے علاقے میں بھی اسلام کی اشاعت ہوئی۔ منصور شاہ کی حکومت میں ملاکا خطے کا بہت بڑا تجارتی مرکز بن گیا، اس نے ریاست کے نظم و نسق کی بہتری کے لیے اسلامی قوانین کو مرتب کروایا اور ملائی زبان کے لیے عربی رسم الخط اختیار کیا۔ اس نے سلطنت میں اسلامی علوم و فنون کے فروغ پر بھی توجہ دی۔ ملاکا کا آخری فرماں روا سلطان محمود شاہ (1488ء تا 1511ء)

کمزور حکمراں تھا، اس کے زمانے میں ایک پرتگالی جہاز راں البوقرق نے 1511ء میں ملاکا پر قبضہ کر لیا اور شہر کو جلا دیا۔ سلطان محمود شاہ بھاگ کر سماترا چلا گیا جہاں 1528ء میں اس کی وفات ہوئی۔

10.3.3 جوہور کی سلطنت

جزیرہ نمائے ملایا میں ملاکا کی سلطنت پر قبضے کے بعد اس شہر پر تو ولندیزیوں کا قبضہ برقرار رہا البتہ اندرون ملایا کے حصوں میں مقامی مسلمانوں نے اپنی خود مختار حکومتیں قائم کر لیں اور وہ ان کے اثر سے آزاد رہے۔ ان میں سب سے اہم جوہور کی سلطنت ہے جس کا بانی ملاکا کے آخری فرواں روا سلطان محمود شاہ کا بیٹا سلطان علاء الدین رایت شاہ ہے۔ 1528 میں سماترا میں والد کی وفات کے بعد وہ جزیرہ نمائے ملایا واپس لوٹا اور اپنے حمایتیوں کی مدد سے جوہور کے علاقے میں ایک آزاد حکومت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ یہاں وہ 1564ء تک حکومت کرتا رہا۔ اٹھارہویں صدی عیسوی میں جوہور کی سلطنت پر سلاویسی جزیرے کی ایک قوم بوگی، جو مسلمان تھی، نے قبضہ کر لیا اور ایک مضبوط و طاقت ور حکومت قائم کی۔ البتہ بعد میں جوہور کی سلطنت کمزور ہوتی چلی گئی اور ایک ایک کر کے اس کے علاقے ولندیزیوں اور انگریزوں کے قبضے یا اثر میں چلے گئے۔ یہاں تک کہ بیسویں صدی کے آغاز تک پورا جزیرہ نمائے ملایا عملاً برطانیہ کے قبضے میں چلا گیا البتہ برطانیہ نے ملایا کے صرف تین علاقوں، پنانگ، ملاکا اور سنگاپور، پر براہ راست حکومت کی۔ جزیرہ نما کی بقیہ ریاستوں کو اس نے بڑی حد تک اندرونی خود مختاری دے کر برقرار رکھا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جوہور کی سلطنت میں ملائی زبان میں اسلامی علوم و فنون کو فروغ حاصل ہوا، بڑے پیمانے پر عربی و فارسی زبانوں سے ملائی زبان میں ترجمے کا کام ہوا۔ سولہویں صدی عیسوی میں مولانا روم کی مثنوی، مولانا جامی کی تحفۃ الاحرار اور نظامی کی سکندر نامہ کا ملائی زبان میں ترجمہ ہوا۔ جوہور کے ہی ایک سلطان عبد الجلیل شاہ کے وزیر اعظم تان محمد نے سجارو ملایو کے نام سے سماترا اور ملایا کے مسلمان سلاطین کی تاریخ لکھی۔

10.3.4 برونئی میں اسلام کی اشاعت اور مسلم حکومت کا قیام

جنوب مشرقی ایشیا کے دیگر ملکوں کی طرح برونئی کے بارے میں بھی حتمی طور پر یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ کب اور کیسے یہاں اسلام کی اشاعت ہوئی۔ مقامی روایات کے مطابق اس علاقے میں دسویں صدی عیسوی میں مسلمان موجود تھے۔ البتہ اسلام کی عمومی اشاعت اس خطے میں پندرہویں صدی عیسوی میں ملاکا کے مشہور سلطان منصور شاہ کے زمانہ حکومت میں ہوئی اور یہ علاقہ ملاکا کہ سلطنت کا حصہ بنا۔ مسلمانوں سے پہلے برونئی کے علاقے میں بودھ مت کے پیروکاروں کی حکومت تھی۔ سولہویں صدی عیسوی تک برونئی کے علاقے میں ایک مضبوط اور طاقت ور مسلم حکومت قائم ہو چکی تھی، اس کا علاقہ جزیرہ بورنیو کے علاوہ فلپائن اور آس پاس کے ممالک تک پھیلا ہوا تھا۔ خاص طور پر سولہویں صدی میں ملاکا کی سلطنت کے زوال کے بعد بہت سے مسلمان امیروں اور تاجروں نے برونئی میں پناہ حاصل کی اور اس کی ترقی و خوش حالی میں اہم رول ادا کیا۔ البتہ اس عروج کے بہت جلد بعد ہی برونئی کی سلطنت کو زوال بھی ہونے لگا اور بہت سارے علاقے یکے بعد دیگرے اس کے اقتدار سے باہر ہوتے چلے گئے یہاں تک کہ انیسویں صدی عیسوی میں یہ اپنے موجودہ محدود علاقے میں سمٹ کر رہ گئی۔ یہاں زیادہ تر مسلمان سنی کی شاخ شافعی سے تعلق رکھتے ہیں۔

ایک طرف برونئی کی عظیم سلطنت کو زوال ہو رہا تھا تو دوسری طرف جنوب مشرقی ایشیا کے خطے میں یورپی ملکوں کی قبضے اور بالادستی کی سرگرمیاں روز بروز تیز ہوتی جارہی تھیں۔ سلطان نے پہلے ہی (1841ء) ایک بڑا علاقہ (ساراواک) ایک برطانوی فوجی افسر جیمس برووک کو، جس نے اس کے خلاف بغاوت کو دبانے میں اس کی مدد کی تھی، دے دیا تھا۔ ادھر بحری قزاقی، جو عروج پر پہنچ گئی تھی اور تاجروں کے لیے تجارتی سرگرمیاں جاری رکھنا محال ہو گیا تھا، نے سلطان کو مجبور کر دیا کہ ان حالات میں خطے کی بڑی فوجی طاقت برطانیہ کے ساتھ معاہدہ کر لیا جائے تاکہ خود کو اور اپنی حکومت کو محفوظ رکھا جاسکے اور مزید علاقوں کو کھونے سے بچا جاسکے۔ چنانچہ 1847ء میں برونئی کے سلطان نے تجارت کی ترقی و فروغ اور بحری قزاقی کی روک تھام کے لیے برطانیہ کے ساتھ معاہدہ کر لیا۔ برطانیہ نے موقعے کا فائدہ اٹھایا، برونئی کی ریاست میں اپنا اثر ورسوخ بہت زیادہ بڑھا لیا، جیمس برووک اور اس کے جانشین بھی ہمیشہ سلطنت کے مزید علاقے ہتھیانے کی فراق میں رہتے جس سے مجبور ہو کر سلطان نے معاہدے کے چالیس برس بعد 1888ء میں برطانیہ کے ساتھ ایک اور معاہدہ کیا برونئی کی ریاست کو برطانیہ کے انتظام میں دے دیا۔ برطانیہ نے اسے محروسہ (Protectorate) مملکت قرار دے دیا۔ یعنی سلطان کو ریاست کے اندرونی معاملات میں تو کسی قدر خود مختاری حاصل ہو گی لیکن تجارت، دفاع اور امور خارجہ برطانیہ کے کنٹرول میں ہوں گے۔

10.4 مغربی استعمار سے آزادی اور تعمیر و ترقی

10.4.1 ملائیشیا پر استعماری قبضہ

ملائیشیا قدرتی وسائل سے بھرپور ایک خوش حال اور تیزی سے ترقی کی جانب گامزن مسلم ملک ہے۔ گھنے جنگلات، گرم مسالوں اور ربر، ٹن اور لوہے کی مصنوعات اور برآمدات کے سبب قدیم زمانے سے لے کر موجودہ دور تک تجارتی و اقتصادی سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف ادوار میں بیرونی طاقتیں ہمیشہ اس کے علاقوں پر قبضہ اور بالادستی حاصل کرنے کے لیے کوشاں رہی ہیں۔ دور جدید میں برطانیہ سمیت مختلف یورپی استعماری طاقتوں نے اس پر قبضہ کرنے کی کوشش کی البتہ جزوی طور پر پہلے پرتگال نے ملائیشیا کو اپنی کالونی بنانے کی کوشش کی، پھر ہالینڈ نے اس کے کچھ علاقوں پر قبضہ کیا بعد ازاں ہالینڈ اور برطانیہ کے درمیان بالادستی کی جنگ میں برطانیہ کو کامیابی ملی۔ برطانیہ نے 1776ء سے لے کر 1909ء تک سوا سو برس کے عرصے کے درمیان جزیرہ نمائے ملایا کے تمام علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ البتہ ہندوستان کی طرح ملائیشیا پر بھی برطانوی قبضے کی دو نوعیتیں تھیں۔ ایک براہ راست قبضہ اور دوسرا بالواسطہ قبضہ۔ برطانیہ نے جزیرہ نمائے ملایا کی تین ریاستوں پر براہ راست قبضہ کیا، ان میں سے دو، پنانگ اور ملاکا، موجودہ ملائیشیا کے وفاق کا حصہ ہیں اور سنگاپور اب ایک الگ خود مختار ملک ہے۔ جزیرہ نما کی بقیہ نو ریاستوں کو اس نے محروسہ ممالک کے طور پر اپنی نگرانی اور انتظام میں رکھا، بظاہر حکومت مقامی حکمران خاندانوں کے ہاتھ میں رہی مگر اصل فیصلے برطانوی حکام کرتے تھے۔ چونکہ ملائیشیا پر برطانوی قبضہ براہ راست بہت کم علاقے پر رہا اس لیے ملائیشیا میں ہمیں بیرونی قبضے کے خلاف انڈونیشیا کے جیسی مقامی مزاحمت دیکھنے کو نہیں ملتی۔

10.4.2 استعمار سے آزادی

ملائیشیا بنیادی طور پر ایک کثیر نسلی اور کثیر مذہبی ملک ہے۔ یہاں پر ملائی اکثریت اور چینی وہندوستانی اقلیتیں مل جل کر ایک ساتھ رہتی ہیں۔ ملائیشیا کے ملائی باشندے تقریباً سبھی مذہبی طور پر مسلمان ہیں۔ چینی نسل کے باشندوں کی اکثریت بودھ اور ایک بڑی تعداد عیسائی ہے۔ برصغیر ہندوستان کے باشندوں میں ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائی شامل ہیں۔ دوسری عالمی جنگ ایشیائی ملکوں کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت اس لیے بھی رکھتی ہے کہ بیشتر ملکوں کو اس جنگ کے بعد ہی مغربی استعمار سے آزادی ملی۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران پہلے جاپان نے ملائیشیا پر قبضہ کر لیا، جاپانی قبضے کے دوران ملائیشیا کے کمیونسٹوں نے، جو سب کے سب چینی نسل سے تھے، آزدی کے لیے گوریلا جنگ چھیڑ دی، بعد میں جب ملائیشیا پر جاپان کی شکست کے ساتھ دوبارہ برطانوی تسلط قائم ہو گیا تب بھی یہ کمیونسٹ مزاحمت جاری رہی البتہ اب اس میں مقامی ملائی باشندوں کا آزادی کا مطالبہ بھی شامل ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دوبارہ تسلط کے بعد برطانیہ نے پورے جزیرہ نما کو (سوائے سنگاپور) ایک یونین بنا دیا جو مقامی حکمرانوں اور باشندوں دونوں کے لیے ناقابل قبول تھی۔ ملک میں کئی سیاسی جماعتیں قائم ہوئیں، ان میں ملائی باشندوں کی قومی جماعت United Malays National Organization (UMNO)، دوسری یہاں کے چینی باشندوں کی جماعت Malaysian Chinese Association (MCA) اور تیسری ہندوستانی باشندوں کی جماعت Malaysian Indian Congress (MIC) اہم ہیں۔ ان سب نے مل کر ملائیشیا کی مکمل آزادی کا مطالبہ کرنا شروع کر دیا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ برطانیہ نے 1948ء میں ملایا کا وفاق قائم کیا اور 1955ء میں وفاق کے لیے انتخابات کرائے گئے۔ ان انتخابات میں مذکورہ بالا تینوں جماعتوں نے اپنا ایک اتحاد قائم کر لیا اور انھوں نے اپنے سیاسی قائد تنکو عبدالرحمان کی قیادت میں زبردست انتخابی کامیابی حاصل کی، ایک کے علاوہ وفاق کی تمام نشستوں پر اس اتحاد نے کامیابی حاصل کی۔ وفاقی انتخابات میں کامیابی کے بعد ملایا کے لوگوں نے مزید شدت کے ساتھ آزادی کا مطالبہ کرنا شروع کر دیا اور بہت جلد انھیں اس میں کامیابی بھی مل گئی۔ 31 اگست 1957ء کو ملایا کو برطانیہ سے آزادی مل گئی، اتحاد کے رہنما تنکو عبدالرحمان ملایا کے پہلے وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ آزادی کے وقت ملایا کے وفاق میں جزیرہ نمائے ملایا کی گیارہ ریاستیں شامل تھیں اور بیرونی حملوں سے دفاع کی ذمہ داری برطانیہ پر تھی۔

10.4.3 نئے وفاق (ملائیشیا) کی تشکیل

اگست 1957ء میں آزادی ملنے کے وقت جزیرہ نمائے ملایا کی ریاستوں کا وفاق فیڈریشن آف ملایا کے نام سے جانا جاتا تھا، یہ صورت حال 1963 تک باقی رہی اور اس میں جزیرہ نما کی گیارہ ریاستیں شامل تھیں۔ چھ سال کے بعد 1963ء میں اس وفاق میں تین مزید ریاستیں شامل ہوئیں، یہ ریاستیں سنگاپور، ساراواک اور صباح کی تھیں۔ نئے وفاق کا نام اب ملایا کے بجائے ملائیشیا رکھا گیا جو اب 16 ریاستوں پر مشتمل تھا اور اس میں جزیرہ نما ملایا سے باہر بورنیو جزیرے کی بھی دو ریاستیں، ساراواک اور صباح، شامل تھیں۔ 1965ء میں سنگاپور، جو چینی نژاد اکثریتی ریاست تھی ملائیشیا کے وفاق سے علیحدہ ہو گئی اس طرح اب ملائیشیا کا وفاق 13 ریاستوں پر مشتمل ہے۔

ملائیشیا کا وفاقی ڈھانچا آئینی بادشاہت اور پارلیمانی جمہوریت کا ایک بہترین امتزاج ہے۔ ملک کی تیرہ ریاستوں میں سے ہر ایک کا اپنا

آئین، اپنی مجلس قانون ساز اور اپنا پرچم ہے۔ آئینی بادشاہت ہونے کی وجہ سے بادشاہ کا انتخاب پانچ سال کے وفاق کی نو موروثی حکومت والی ریاستوں کی کونسل اپنے حکمرانوں میں سے باری باری منتخب کرتی ہے۔ بادشاہ وفاق کا آئینی سربراہ تو ہوتا ہے لیکن حقیقی اقتدار وزیر اعظم کو حاصل ہوتا ہے جو عوام کے نمائندے کے طور پر پارلیامنٹ سے چنا جاتا ہے۔ وفاقی پارلیامنٹ دو ایوانوں پر مشتمل ہوتی ہے، ایک ایوان نمائندگان جسے دیوان رعیت (Rayyat) کہا جاتا ہے اور دوسرا سینیٹ (ایوان بالا) جو دیوان نگارا (Negara) کہلاتا ہے۔

10.4.4 سیاسی استحکام اور تعمیر و ترقی

برطانوی استعمار سے آزادی کے وقت دیگر ایشیائی اور افریقی ملکوں کی طرح ملائیشیا بھی تعمیر و ترقی سے دور ایک غریب اور مفلوک الحال ملک تھا۔ البتہ آزادی کے بعد اس ملک کی سیاسی قیادت نے ملک کے استحکام اور تعمیر و ترقی پر خاص توجہ دی۔ کثیر نسلی اور کثیر مذہبی ملک ہونے کے باوجود ملک کے ملائی، چینی اور ہندوستانی نسل کے باشندوں کی سیاسی قیادتوں نے سوجھ بوجھ سے کام لیا جس کی وجہ سے نہ صرف ان کا سیاسی اتحاد باقی رہا بلکہ ملک کی تعمیر و ترقی میں بھی سب نے مل جل کر اپنا حصہ ڈالا اور پنج سالہ منصوبوں کے ذریعے ملکی ترقی کو تیز گام کیا ہے۔ سیاسی قیادت نے پڑوسیوں کے ساتھ تعلقات خوش گوار رکھنے کی کوشش کی ہے اور بیرونی سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ حالاں کہ کئی بار نسلی امتیاز اور اس کی بنیاد پر آپسی تصادم کے واقعات بھی رونما ہو جاتے ہیں البتہ سرکاری سطح پر اس طرح کے واقعات کو حسن و خوبی کے ساتھ حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جس کی وجہ سے اتحاد و یگانگت کی فضا مسموم نہیں ہونے پاتی۔

ملائیشیا کے باشندے تین بڑے نسلی گروہوں (ملائی، چینی اور ہندوستانی) میں تقسیم ہیں اور اسی تقسیم کے اعتبار سے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں سرگرم بھی ہیں۔ مثلاً ملائی نسل کے لوگوں کی اکثریت دیہی زندگی سے وابستہ ہے، یہ لوگ عام طور پر سرکاری ملازمت کرتے یا فوج میں خدمات انجام دیتے ہیں، سیاست میں بھی ملائی لوگ خاصے سرگرم ہیں۔ ملائی باشندوں کے برعکس چینی نسل کے لوگوں کی غیر سیاسی زندگی میں زیادہ سرگرم ہے، تجارت بڑی حد تک ان کے ہاتھ میں ہے، پروفیشنل تعلیم خاص طور پر طب اور انجینیرنگ میں بھی ان کا غلبہ ہے۔ ہندوستانی نسل کے لوگ تجارت اور تعلیم کے شعبوں میں آگے ہیں۔

ملائیشیا کا شمار ان ملکوں میں ہوتا ہے جن کے پاس وافر قدرتی وسائل ہیں۔ سیاسی استحکام اور بہترین منصوبہ بندی میں اس کی خوش حالی میں اضافہ کیا اور ترقی کو یقینی بنایا ہے۔ معیار زندگی کے اعتبار سے ملائیشیا جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں میں پہلے نمبر پر آتا ہے۔ ملائیشیا میں کثرت سے بارش ہوتی ہے جس کی وجہ سے اس کے بڑے حصے پر جنگلات ہیں جن سے قیمتی عمارتی لکڑیاں حاصل ہوتی ہیں، پام، اناس، چاول اور ربر کی پیداوار بہت زیادہ ہے۔ معدنیات میں لوہا، ٹین اور بکسائیٹ کے علاوہ پٹرول کے ذخائر سے مالا مال ہے۔ دنیا میں سب سے زیادہ ربر ملائیشیا میں پیدا کیا جاتا ہے اور اسے برآمد کیا جاتا ہے۔ پام آئل بھی ملائیشیا سے بڑے پیمانے پر برآمد ہوتا ہے۔ سیاحت بھی ملائیشیا کی قومی آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔ مختلف طرح کی خدمات کی فراہمی اور سافٹ ویر ٹکنالوجی میں ملائیشیا نے بہت تیز رفتار ترقی کی ہے اور ان شعبوں میں وہ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کا مقابلہ کرتا ہے۔

10.4.5 مثالی مسلم ریاست

ملائیشیا مسلم دنیا کا ایک ایسا ملک ہے جس کی تقریباً نصف آبادی غیر مسلم ہے۔ مسلم اکثریت اور تاریخی کردار کے سبب ملائیشا کا سرکاری مذہب اسلام ہے اس کے باوجود یہاں کی غیر مسلم آبادی کو اپنے مذہب اور ثقافت پر عمل کرنے کی پوری پوری آزادی ہے۔ مذہب کی بنیاد پر کسی کے ساتھ کسی بھی طرح کا تفریق و امتیاز روا نہیں رکھا جاتا۔ ہر ایک کو اپنے مذہب پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ و اشاعت کے لیے پر امن اور قانونی ذرائع اختیار کرنے کی آزادی ہے۔ ملک میں دو طرح کے متوازی قانون جاری ہیں۔ شرعی قوانین کی پابندی صرف مسلمانوں کے لیے ہے۔ ملک کے غیر مسلم شہریوں کے لیے سیکولر قانون ہے۔ ملائیشیا کے ایک سابق وزیر اعظم مآثر محمد نے ملک میں اسلام حضاری (Civilized Islam) کا تصور پیش کیا جس میں کہ اعلی اخلاقی اسلامی قدروں پر زور دیا گیا ہے۔ ملک کے سبھی باشندوں کو یکساں شہری حقوق حاصل ہیں، سبھی کو ووٹ دینے اور اپنی پسند کی حکومت منتخب کرنے کا اختیار ہے۔ ریاست کے وسائل پر کسی ایک طبقے کی اجارہ داری نہیں ہے۔ سبھی کے لیے ابتدائی بنیادی تعلیم لازمی اور مفت ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو ملائیشیا ایک ایسے مسلم اکثریتی ملک کے طور پر ابھر کر سامنے آتا ہے جس کا سماج کثیر مذہبی ہونے کے باجود تنازعات اور تصادم کے واقعات سے محفوظ ہے اور جو اپنے باشندوں کو نہ صرف مذہب پر عمل کرنے کی آئینی اجازت دیتا ہے بلکہ ایک ایسا ماحول فراہم کرتا ہے جس میں اس کے تمام شہری اپنی مذہبی، نسلی اور لسانی شناختوں کے ساتھ زندگی کی دوڑ میں شامل ہیں اور اسے تعمیر و ترقی کی نئی بلندیوں تک لے جانے کے لیے پر عزم بھی ہیں۔

10.4.6 برونئی: استعمار کے زیر انتظام

برونئی کے علاقے میں مسلم حکومت کا قیام پندرہویں صدی عیسوی کے دوران ہی عمل میں آچکا تھا اور سولہویں صدی عیسوی تک یہ ریاست خطے کی ایک بڑی، خوش حال اور طاقت ور سلطنت بن چکی تھی۔ البتہ رفتہ رفتہ اسے زوال ہونے لگا، جانشینی کے جھگڑوں، بحری قزاقی اور خطے میں بڑھتی ہوئی یورپی ممالک کی سرگرمیوں نے اسے مزید تیز کر دیا۔ برونئی کی سلطنت جو جزیرہ بورنیو سے نکل کر فلپائن اور جزائر سولو تک وسیع تھی، اس کے علاقے ایک ایک کر کے سلطان کے ہاتھ سے نکلنے لگے۔ یہاں تک کہ انیسویں صدی کے وسط میں اقتدار کے لیے جانشینی کے جھگڑے میں ساتھ دینے کے بدلے میں ایک برطانوی فوجی افسر، جیمس برووک، کو سارا واک کا علاقہ دے دیا۔ یہ جیمس برووک وہی ہے جو اس خطے کا پہلا سفید فام راجہ کہلاتا ہے۔ حالات اتنے خراب ہوئے برونئی کی سلطنت بورنیو کے جزیرے پر شمال میں ایک چھوٹے سے علاقے تک محدود ہو کر رہ گئی اور جب اس کو بھی سنبھالنا سلطان کے بس میں نہیں رہا تو 1888ء میں ایک معاہدے کے ذریعے برونئی کی ریاست کو برطانیہ کے انتظام میں دے دیا گیا۔ معاہدے کے تحت سلطان کو اندرونی خود مختاری تو حاصل تھی لیکن دفاع اور خارجہ جیسے امور کی ذمہ داری برطانیہ کی تھی۔

10.4.7 حصول آزادی اور خود مختاری

دوسری عالمی جنگ کے دوران خطے کے دوسرے ملکوں کی طرح برونئی پر بھی جاپان نے قبضہ کر لیا اور یہ قبضہ 1945ء میں جاپان کی شکست تک برقرار رہا۔ حالاں کہ جاپان نے سلطان کو اقتدار سے بالکل بے دخل نہیں کیا لیکن جاپانی قبضے کا فائدہ یہ ہوا کہ مقامی لوگوں میں

سیاسی بے داری آئی۔ یہی وجہ ہے کہ جاپانی قبضے کے خاتمے کے بعد برونئ میں سلطان کی بحالی اور خود مختاری کا مطالبہ شروع ہوا۔ اس طرح کے مطالبے سب سے پہلے بائیں بازو کی طرف رجحان رکھنے والے کچھ نوجوانوں نے شروع کیے۔ باریسن پے موداِ (Youth Front of Brunei) پہلی سیاسی پارٹی تھی جو 1946ء میں برونئ میں قائم ہوئی۔ سیاسی بے داری کے نتیجے میں برونئ نے آزادی اور خود مختاری کی طرف قدم آگے بڑھانے شروع کیے۔ 1953ء میں سلطان نے دستور سازی کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی جس کی سفارشات کی بنیاد پر 1959ء میں برونئ کا نیا آئین بنا۔ نئے آئین کے مطابق سلطان کو ریاست کا سربراہ اعلی قرار دیا گیا، اندرونی معاملات میں برونئ کو مکمل خود مختاری دی گئی، برطانیہ کی ذمہ داری صرف دفاع اور امور خارجہ تک محدود کر دی گئی اور برٹش ریزیڈنٹ کا عہدہ ختم کر کے برٹش ہائی کمشنر مقرر کیا گیا۔ اس طرح ملک کے نظم و نسق کو چلانے کے لیے پانچ کونسلیں بنائی گئیں: 1 انتظامی کونسل 2 قانون ساز کونسل 3 پریوی کونسل 4 جانشینی کونسل 5 مذہبی کونسل۔

برونئ میں ملائی نسل کے لوگوں کی بھاری اکثریت ہے، اس لیے جب جزیرہ نمائے ملایا کے علاقے میں ملائی علاقوں کا وفاق بنا کر ملائیشیا کی تحریک شروع ہوئی تو برونئ کے حریت پسندوں نے بھی برطانیہ سے آزادی اور ملائیشیا کے وفاق میں شمولیت کے لیے آواز اٹھائی۔ اس تحریک کے رہنما برونئ پیپلز پارٹی کے قائد اے ایم ازہری تھے، وہ چاہتے تھے کہ ملک میں جمہوریت کو فروغ ملے اور لوگ اظہار رائے کی آزادی سے مستفید ہوں لیکن سلطان برونئ اس کے حق میں نہیں تھے، وہ برطانیہ کی نگرانی میں اپنی حکومت برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ اے ایم ازہری کی قیادت میں سلطان کے خلاف دسمبر 1962ء میں بغاوت بھی ہوئی تا کہ برونئ کو ملائیشیا کے وفاق کا حصہ بنایا جا سکے لیکن اسے سختی سے کچل دیا گیا، ازہری کو بھاگ کر ملایا میں پناہ لینی پڑی۔ البتہ اس کے بعد برونئ کا مکمل خود مختاری کا راستہ آسان ہو گیا۔ انڈونیشیا، ملائیشیا اور فلپائن کی جانب سے برونئ کی سلامتی اور تحفظ کا یقین دلائے جانے کے بعد جون 1978ء میں لندن میں مذاکرات کے بعد 1983 میں برونئ کی مکمل آزادی کا اعلان کیا گیا، البتہ برونئ کو برطانیہ سے مکمل آزادی یکم جنوری 1984 کو حاصل ہوئی۔

10.4.8 تعمیر و ترقی کے راستے پر

برونئ ایک چھوٹا اور مختصر رقبے والا ملک ہے لیکن اس کی آبادی بھی اسی لحاظ سے کم ہے، بارش بہت ہوتی ہے اور زمین کافی زرخیز ہے۔ ملک کا تقریباً 70 فی صد علاقہ جنگل ہے، بہت ہی کم رقبے پر کاشت ہوتی ہے۔ چاول کے ساتھ ربر یہاں کی خاص پیداوار ہے، جنگلوں سے قیمتی لکڑیاں بھی حاصل کی جاتی ہیں البتہ ملک کی خوش حالی کا اصل دار مدار پٹرول اور قدرتی گیس پر ہے۔ سیاحت بھی برونئ کی آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔ برونئ دنیا کا پہلا ملک ہے جہاں قدرتی گیس کو مائع میں تبدیل کرنے کا کارخانہ قائم کیا گیا۔ ربر، تیل اور گیس سے حاصل ہونے والی آمدنی برونئ کو دنیا کے امیر ترین ملکوں کی صف شامل کرتی ہے، اس کی فی کس آمدنی کافی زیادہ ہے اور محفوظ سرمایہ بھی۔ خاص بات یہ ہے کہ بادشاہت ہونے کے باوجود برونئ نے اپنی آمدنی کے بڑے حصے کو تعمیر و ترقی کے کاموں میں صرف کیا ہے۔ منصوبہ بند طریقے سے ملک میں مختلف شعبوں کو ترقی دی جا رہی ہے۔ دارالحکومت سیری بگاون میں تمام جدید سہولیات فراہم کی گئی ہیں، خوبصورت بین الاقوامی ہوائی اڈہ، بہترین اسپتال اور پر تعیش ہوٹل اور پر امن ماحول دنیا بھر سے سیاحوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ پورے ملک میں

سڑکوں کا جال بچھا ہوا ہے اور پبلک ٹرانسپورٹ مفت ہے، عام لوگوں کے پاس بھی دولت کی ریل پیل ہے اس لیے ملک میں لگژری کاروں اور تعیش کی دیگر اشیا کی فراوانی ہے۔ ماہی گیری اور مویشی بانی کو ترقی دے کر حلال فوڈ کے کاروبار کو بڑھاوا دیا گیا ہے۔ زراعت کو بھی وسعت دی گئی ہے۔ ابتدائی تعلیم مفت اور لازمی ہے، سرکاری اور غیر سرکاری دونوں طرح کے اسکولوں میں مذہبی تعلیم کا بھی نظم

ہوتا ہے۔ غیر مسلم اقلیت بہت چھوٹی ہے اس کے باوجود ان کی مذہبی ضروریات کا حکومت خاص خیال رکھتی ہے۔ ان سب کے باوجود ملک میں سیاسی آزادی کا فقدان ہے، ملک کے وسائل اور عہدے زیادہ تر شاہی خاندان کے افراد یا ان کے قریبی لوگوں کے پاس ہیں۔ نوجوان نسل میں سیاسی آزادی کو لے کر بے چینی پائی جاتی ہے اور وہ ملک میں جمہوریت کے فروغ کے خواہاں ہیں۔

10.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- ملائیشیا اور برونئی کی قدیم تاریخ و ثقافت، اس کا جغرافیہ، باشندے اور مذہب وغیرہ
- ملائیشیا اور برونئی میں مسلمانوں کی آمد، اشاعت و تبلیغ اسلام اور مسلم حکومتوں کا قیام وغیرہ
- ملائیشیا اور برونئی میں مسلم حکومتوں کا زوال، مغربی نوآبادیاتی استعمار وغیرہ
- مغربی استعمار سے آزادی اور جدید ملائیشیا و برونئی کی تشکیل
- آزادی کے بعد کی صورت حال اور تعمیر و ترقی کے اقدامات وغیرہ

10.6 نمونہ امتحانی سوالات

10.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. جزیرہ نمائے ملایا میں مسلمانوں کی پہلی حکومت قائم ہوئی؟

(a). جوہور میں (b). ملاکا میں (c). پنانگ میں (d). کیدہ میں

2. ملائیشیا کو برطانوی استعمار سے آزادی ملی؟

(a). 1948 میں (b). 1953 میں (c). 1957 میں (d). 1959 میں

3. 1965 میں ملائیشیا کے وفاق سے علاحدگی اختیار کر لی؟

(a). سنگاپور نے (b). ساراواک نے (c). برونئی نے (d). صباح نے

4. ملائیشیا اور برونئی کے باشندوں کی اکثریت کا مذہب کون سا ہے؟

(a). مظاہر پرستی (b). اسلام (c). ہندو مت (d). بودھ مت

5. برونئی کا دارالحکومت ہے ؟

(a). دارالسلام　(b). بندر عباس　(c). جوگ جکارتا　(d). بندر سیری بگاون

6. سجاروملایو کے نام سے ساترا اور ملایا کے مسلم سلاطین کی تاریخ لکھی ؟

(a). تان محمد نے　(b). احمد دحلان نے　(c). احمد امین نے　(d). منصورالدین نے

7. جنوب مشرقی ایشیا کے پہلے سفید فام راجہ کے نام سے مشہور ہے ؟

(a). جیمس بانڈ　(b). چارلس ووڈ　(c). جیمس برووک　(d). ولیم جان

8. 1995 برونئی برطانیہ کی مملکت محروسہ قرار پایا؟

(a). 1841 میں　(b). 1857 میں　(c). 1888 میں　(d). 1909 میں

9. فیڈریشن آف ملایا کے پہلے وزیر اعظم تھے ؟

(a). سوکارنو　(b). تنکو عبد الرحمان　(c). تنکو عبد الرزاق　(d). حسین عون

10. ملائیشیا کے ایوان نمایندگان کو کہا جاتا ہے ؟

(a). دیوان عام　(b). دیوان خاص　(c). دیوان نگارا　(d). دیوان رعیت

10.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. ملائیشیا اور برونئی کی قدیم تاریخ پر مختصر نوٹ لکھیے۔
2. موجودہ برونئی کے جغرافیے کو بیان کیجیے۔
3. جوہور کی سلطنت پر مختصر نوٹ لکھیے۔
4. ملائیشیا کے وفاقی ڈھانچے کی وضاحت کیجیے۔
5. ملائیشیا ایک مثالی مسلم ریاست بن سکتا ہے۔ کمنٹ کیجیے۔

10.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. ملائیشیا اور برونئی میں اسلام کی اشاعت اور مسلم حکومتوں کے قیام پر تفصیل سے روشنی ڈالیے۔
2. ملائیشیا کی استعمار سے آزادی اور تعمیر و ترقی پر ایک مضمون لکھیے۔
3. برونئی کی تشکیل اور تعمیر جدید پر روشنی ڈالیے۔۔

10.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

.1	اسلام کی احیائی تحریکیں اور عالم اسلام	:	سید قاسم محمود
.2	دنیائے اسلام کا مختصر تعارف	:	مہر گل محمد
.3	جغرافیہ عالم اسلام	:	پروفیسر ماجد حسین
.4	ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ جلد دوم وسوم	:	ثروت صولت
.5	Contemporary Muslim World	:	ڈاکٹر افضل اقبال
.6	سہ روزہ دعوت کا مسلم دنیا نمبر		

اکائی 13: مسئلہ فلسطین (حصہ اول)

اکائی کے اجزا:

13.0 تمہید

13.1 مقاصد

13.2 فلسطین کا جغرافیہ

13.3 فلسطین سرزمین انبیا

13.4 فلسطین کی قدیم تاریخ

13.5 فلسطین مسلم دور حکومت میں

13.6 مسجد اقصیٰ

13.7 فلسطین عثمانی دور حکومت میں

13.7.1 صہیونیت

13.7.2 سلطنت عثمانیہ کا خاتمہ اور یہود

13.8 اکتسابی نتائج

13.9 نمونہ امتحانی سوالات

13.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

13.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

13.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

13.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

13.0 تمہید

مسئلہ فلسطین جو برطانوی سازشوں اور مسلمانوں کو جنگ میں دھکیلنے کے لئے پیدا کیا گیا اس کی بیج برطانیہ نے 1917ء میں بالفور ڈکلیریشن کے ذریعہ رکھی۔ فلسطین کی سرزمین کئی دہائیوں سے تنازعات کا شکار ہے۔ یہ خطہ تاریخی طور پر مختلف اقوام کا مرکز رہا ہے جن میں نمایاں یہودی، عیسائی اور مسلمان ہیں۔ حضرت ابراہیم نے شہر ہبرون سے اپنی تبلیغ کا آغاز کیا تھا۔ حضرت اسحاقؑ اور یعقوبؑ نے اسی سرزمین دعوت دین کی ابتدا کی۔ حضرت موسیٰؑ کی ارض موعود یہی سرزمین ہے۔ حضرت عیسیٰؑ نے بھی اسی سرزمین سے اپنی تبلیغ کا آغاز کیا تھا اور یہیں پر آپ کو یہودیوں کے ذریعہ سولی پر چڑھایا گیا۔ یہن وہ زمین سے جہاں سے محمد رسول اللہ ﷺ نے معراج کی تھی اور یہیں پر آپ نے تمام انبیاء کی امامت بھی فرمائی تھی۔ اس مقدس زمین کے لئے مسلمانوں اور عیسائیوں کے مابین صلیبی جنگوں کا سلسلہ چلتا رہا یہاں تک کہ صلاح الدین ایوبی نے 1187ء میں اسے فتح کرکے مسلمانوں کے حق میں ڈال دیا اس کے بعد سے لیکر 1917ء تک یہ سرزمین مسلمانوں کی مقدس مقامات میں شامل رہی ہے۔

بیسویں صدی کے اوائل میں صہیونیوں کی ابھرتی تحریک نے فلسطین میں یہودی وطن قائم کرنے کی کوشش کی۔ فلسطین میں آباد ہونے والی یہ آبادی اس وقت 5 فیصد سے بھی کم تھی لیکن جنگ عظیم اول کے بعد یہودیوں کی آبادکاری میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا اور یوں یہ تناسب 30 فیصد سے بھی بڑھ گیا، یہ کوشش خطے میں یہودیوں اور عربوں (مسلمانوں) کے درمیان تناؤ کا باعث بنی جو بالآخر تشدد اور تنازعات میں بدل گئی۔ چونکہ مسلم کمیونٹی کا سرزمین فلسطین سے گہرا تعلق ہے، مسلم کمیونٹی کا یہ تعلق بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ کی وجہ سے کافی اہمیت کا حامل ہے۔ ان مقدس مقامات کی حفاظت مسلمان اپنا اخلاقی اور مذہبی فریضہ سمجھتے ہیں۔ دوسری جانب دیگر اقوام (یہودی اور عیسائی) بھی اس مقدس سرزمین پر اپنا گہرا تعلق گردانتے ہیں اس تعلق کی وجہ مغربی دیوار، دیوار گریہ، ہیکل سلیمانی اور ٹیمپل ماؤنٹ سمیت کئی اور اہم مذہبی مقامات ہیں۔ مسیحیوں کا بھی اس خطے سے تعلق ہے، کیونکہ یہ یسوع علیہ السلام کی جائے پیدائش ہے۔ تاہم، عیسائی زیادہ تر تنازعات میں غیر جانبدار رہے ہیں۔

مسئلہ فلسطین سے متعلق دو اکائیاں ہیں جن میں اس قضیہ پر بھرپور مواد فراہم کرنا ہے لہٰذا اس کے پہلے حصہ میں فلسطین اور اس کا جغرافیہ، فلسطین کی تاریخ قدیم، بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ پر تفصیلی روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کا اس پر قبضہ اور پھر سلطنت عثمانیہ کے خاتمہ کے ساتھ برطانوی انتداب میں اس کی حالات کا جائزہ لیا جائے گا۔ دوسرے حصہ میں مسئلہ فلسطین کے بنیادی وجوہات اور یورپ سے یہودیوں کی ہجرت نیز تقسیم مملکت فلسطین اور اقوام متحدہ کا کردار، عالمی برادری کا کردار، عرب اسرائیل جنگ و معاہدے وغیرہ پر روشنی ڈالی جائے گی۔

13.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد ہے کہ طلباء کو فلسطین کی قدیم تاریخ، اس کا جغرافیہ، محل وقوع، مسلم عہد حکومت میں اس کے حالات، اور

صہیونی تحریک واس کے اثرات سے متعارف کرانا ہے۔اس کے ساتھ ہی اس بات سے بھی باخبر کرنا ہے کہ مسئلہ فلسطین کی بنیادیں یہودیوں کے ذریعہ انیسویں صدی کے آخر میں باسل کانفرنس کے ذریعہ رکھی گئیں۔ نیز طلباء کو صہیونی تحریک کے عزائم اور ان کے فرانس وبرطانیہ کے ساتھ تعلقات اور اسرائیل کے لئے فلسطین میں قیام کے اقدام کی معلومات ہوگی ساتھ ہی عثمانی سلطنت کے اختتام میں یہودیوں کی تحریک صہیونیت کا کیا کردار رہا ہے اس سے بھی آگہی ہوگی۔

13.2 فلسطین کا جغرافیہ

فلسطین جو سرزمین انبیاء ہے اور جسے عربوں کا قلب، تہذیبوں کا مرکز اور دنیا کے تین بڑے مذاہب کا گھوارہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ایشیاء کے مغربی حصہ میں واقع ہے۔ اس کا رقبہ 27 ہزار مربع کلومیٹر پر محیط ہے جس کا بیشتر حصہ اب اسرائیل کے قبضہ میں ہے۔ اس کے شمال میں شام ولبنان، جنوب میں بحر احمر، مشرق میں مملکت اردن اور مغرب میں بحیرہ روم واقع ہے۔ اس خطہ کو تین متوازی جغرافیائی خطوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، جیسے ساحلی میدانی علاقہ، سطح مرتفع کا علاقہ اور بڑی شگافدار وادی کا حصہ۔ اپنی بے مثل ہیئت کی وجہ سے سرزمین فلسطین کی آب وہوا بہت متضاد اثرات کی حامل ہے۔ ساحلی میدانی علاقوں میں چھوٹی چھوٹی ندیاں پائی جاتی ہیں جبکہ سطح مرتفع کا علاقہ پہاڑوں اور ٹیلوں پر مشتمل ہے جن میں کوہ طور اور کوہ کارمل وغیرہ شامل ہیں۔ شگافدار بڑی وادی کا خطہ دنیا کی سب سے نچلی سطح والی زمین ہے جو سطح سمندر سے 1292 فٹ نیچے ہے۔ یہاں پوٹاشیم اور برونائیڈ جیسے معدنیات کے ذخائر موجود ہیں۔ قدرتی وسائل سے مالا مال ہونے کے علاوہ فلسطین اپنے جغرافیائی محل وقوع کے باعث بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ یہ خطہ ایشیاء، افریقہ اور یورپ کے تین بڑے براعظموں کے درمیان دنیا بھر کے ذرائع حمل ونقل کے لئے ایک پل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فلسطین نہ صرف قدیم زمانہ میں تجارتی قافلوں اور سیاحوں کو اپنی طرف کھینچتا رہا بلکہ موجودہ دور میں بڑی عالمی طاقتوں کی توجہ کا مرکز ہے۔ جس کے ذریعہ ایشیاء اور یورپ کے تجارتی بندرگاہوں اور راستوں پر اثر ورسوخ رکھا جاسکتا ہے۔ نیز جنگی حکمت عملی کے لحاظ سے بھی یہ ملک کلیدی اہمیت کا حامل ہے۔

13.3 فلسطین سرزمین انبیا

سرزمین فلسطین کو بہت سے نبیوں کی جائے پیدائش اور آخری آرامگاہ ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ یہودی، عیسائی اور مسلمان اسے مقدس سرزمین مانتے ہیں اور اس کے سیاحت کے خواہاں رہتے ہیں۔ تقریباً چار یا پانچ ہزار سال قبل حضرت ابراہیمؑ نے اسی سرزمین سے انسانوں کو اللہ کا پیغام دیا تھا اور اپنی تبلیغ کا مرکز شہر ہبرون کو بنایا تھا۔ اپنے پیدائشی شہر میسوپوٹامیا کے قصبہ ار سے ہجرت کرکے آپ یہاں مقیم ہوئے تھے۔ اور اپنی زندگی کا بڑا حصہ یہی گزار کر شہر ہبرون میں الخلیلی کے مقام پر اس دار فانی سے رخصت ہوگئے۔ اسی لئے الخلیلی کو مسلمان، عیسائی اور یہودی احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

یہ زمین حضرت اسحاقؑ اور یعقوبؑ کی رہائش گاہ رہی ہے اور یہیں سے حضرت موسیٰؑ نے اللہ کا پیغام سنایا تھا نیز حضرت داؤدؑ اور سلیمانؑ کی حکومت کا مرکز بھی یہی خطہ رہا ہے۔ ایک خدا کی عبادت کے لئے حضرت سلیمانؑ نے فلسطین کے شہر بیت المقدس میں ہی ہیکل

سلیمانی تعمیر کروایا تھا۔ نیز حضرت عیسیٰؑ نے اسی سرزمین سے توحید کی دعوت دی اور محمد مصطفیٰ ﷺ کی آمد کی خوشخبری سنائی۔ یروشلم ،اسلام کے تین اہم شہروں میں سے ایک ہے اور نبی کریم ﷺ قیام مکہ کے دوران اور ہجرت مدینہ کے بعد 17 مہینوں تک اسی شہر کی مسجد بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرتے رہے۔ اور واقعہ معراج میں آپ ﷺ نے اسی بیت المقدس میں تمام انبیاء کی امامت کا فریضہ انجام دیا نیز یہیں سے سفر معراج پر روانہ ہوئے۔ اس کے علاوہ کئی جلیل القدر صحابہ اس سرزمین پر مدفون ہیں جن میں فاتح شام ابو عبیدہ بن جراحؓ کا نام سرفہرست ہے۔

اسی طرح یہ خطہ عیسائیوں کے لئے بھی اہمیت کا حامل ہے کیوں کہ اسی خطہ میں حضرت عیسیٰؑ پیدا ہوئے اور پرورش پائی نیز آپ نے عالم انسانیت کو توحید کی دعوت اسی سرزمین سے دی۔ اللہ نے آپ کو یہودیوں کے ظلم سے بچا کر آسمان پر زندہ اٹھالیا اور انشاء اللہ آپ دوبارہ اس دنیا میں امت محمدی بن کر آئیں گے۔ بیت اللحم اور نزارت میں عیسائیوں کے متعدد متبرک چرچ موجود ہیں جن میں مسیح موعود کا چرچ سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ یہ سرزمین اسی مناسبت سے یہودیوں کے لئے بھی اہمیت کی حامل ہے کیونکہ یہاں حضرت موسیٰؑ نے توحید ربانی کی دعوت کا سلسلہ شروع کیا تھا اور یہودی قوم ہی آپ کی پیروکار رہی ہے۔ اس لحاظ سے دنیا کے ان تینوں بڑے مذاہب کسی نہ کسی نہج سے فلسطین سے گویا ایک روحانی تعلق رکھتے ہیں اور اس مقدس جگہ کو متبرک مانتے ہیں۔

13.4 فلسطین کی قدیم تاریخ

فلسطین کی تہذیب و تمدن کی تاریخ نہایت قدیم ہے۔ آثار قدیمہ کی دریافتوں سے پتہ چلتا ہے کہ فلسطین کی تاریخ آٹھ ہزار سال قبل مسیح کی ہے ۔ بعض نصوص اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ فلسطین دس ہزار سال قبل عربوں کی رہائش گاہ تھی اور انہوں نے جیریکو شہر بسایا تھا۔ ان لوگوں میں اموروائی اور آرامی قبائل سب سے پہلے باشندے مانے جاتے ہیں۔ تاریخ کے ماہرین کا ماننا ہے کہ آرامی نسل کے بعد فلسطین میں 3000 ہزار سال قبل مسیح میں کنعانی قبیلہ آباد ہوا، یہ لوگ جزیرہ نمائے عرب سے ترک وطن کر کے یہاں آباد ہوئے تھے۔ کنعانی مہذب اور تمدن سے آراستہ و پیراستہ تھے انہی لوگوں نے فلسطین کے قرب وجوار میں نئے نئے شہر بسائے اور زراعت و تجارت کے لئے خطہ کو ہموار کیا۔ ان کنعانیوں نے اس ملک کا نام کنعان رکھا تھا۔ انہوں نے جو شہر بسائے ان میں ایک شہر یروشلم بھی ہے جسے 1800 قبل مسیح بسایا گیا تھا۔ کنعانی اپنے بادشاہ شاہ ملکی سالم کے نام پر اس شہر کو اروسالم کے نام سے پکارتے تھے جو آرامی زبان میں شہر کے لئے استعمال ہوتا تھا اور آگے چل کر یہی لفظ یروشلم بن گیا۔ تاریخی قرائن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی زمانہ تھا جب حضرت ابراہیمؑ 1800 قبل مسیح عراق سے ہجرت فرما کر یہاں تشریف لائے تھے۔ آپ کے انتقال کے بعد آپ کے ماننے والوں میں برائی پیدا ہوگئی جس کے نتیجہ میں انہیں مصر کی طرف شہر بدر کر دیا گیا۔

کنعان میں فلسطینوں کی آمد کی تاریخ 1250 قبل مسیح کی ہے جب لوگوں کا ایک گروہ جو جزیرۃ العرب سے کنعان میں آکر اس کے جنوبی اور مشرقی ساحلی علاقہ پر قابض ہوگئے۔ جزیرۃ العرب سے آئے ہوئے اس گروہ نے اس ملک کو فلسطیہ کا نام دیا جو بعد میں فلسطین کے

نام سے مشہور ہوا۔ فلسطینیوں اور کنعانیوں کے درمیان ازدواجی تعلقات قائم ہوئے اور ایک نئی تہذیب وتمدن وجود میں ائی۔ انجیل میں اس تاریخی حقیقت کے متعلق یہ بات موجود ہے کہ ہبریوں قبیلہ جواب اسرائیلی کہلانے لگا تھا مصر سے ملک بدر کئے جانے کے بعد چالیس سالوں تک ریگستان میں دربدر کی ٹھوکریں کھاتا رہا اور 1200 قبل مسیح میں حضرت موسیٰؑ کی وفات کے بعد اپنے سردار جوشوعا کے ہمراہ کنعانیوں اور فلسطینیوں پر چڑھائی کرکے ارض کنعان کی مشرقی علاقہ پر قبضہ کرلیا اور دھیرے دھیرے پورے ملک ان کے قبضہ میں آگیا۔ اس ہبریو نسل کے کل بارہ قبیلہ تھے اور ہر ایک کا علاحدہ سردار تھا۔ انہوں نے مل کر دوسو سالوں تک فلسطنیوں سے جنگ کی اور باالآخر متحد ہوکر بادشاہ سول کو اپنا سردار بنالیا۔ جب فلسطینیوں نے سول کو شکست دی اور وہ مارا گیا تو اس کے داماد حضرت داوٗدؑ اس کے جانشین قرار پائے۔

قرآن نے بھی اس واقعہ کا تذکرہ سورۃ البقرہ کی آیت نمبر 60 میں کیا ہے نیز 249 اور 250 میں اس کی پوری تفصیل بیان کی ہے۔ حضرت داوٗدؑ کی جانشینی کے بعد داوٗدؑ نے اسرائیلوں کو متحد کرکے کنعانیوں کے ایک قبیلہ جبوسیوں سے یروشلم کا شہر چھین لیا اور اسے ہی اپنا پایہ تخت بنایا۔ آپ کے انتقال کے بعد آپ کے صاحبزادے حضرت سلیمانؑ بادشاہ بنے اور انہوں نے اسی یروشلم میں ایک مسجد کی بنیاد رکھی جو مسجد اقصیٰ کے نام سے مشہور ہے۔ آپ نے تقریباً چالیس سال تک دنیا کے ہر خطہ پر حکومت کی۔ آپ کے بعد سلطنت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ فلسطین کے شمال میں اسرائیل اور جنوب میں جودا کی حکومت قائم ہوئی۔ یہی جودا بعد میں یہودا کہے جانے لگے۔ قرآن میں یہودیوں کے متعلق سورۃ بنی اسرائیل کی آیت نمبر 4 تا 8 میں بنی اسرائیل کی شرارت اور ان پر دوسری قوموں کے غلبہ کا دوبار تذکرہ ہے لیکن تاریخی واقعات کی روشنی میں دیکھا جائے تو انہوں نے اپنی پوری تاریخ میں کل چھ بار شرارت کی ہے یعنی اللہ کے احکامات کی خلاف ورزی کی ہے جس کے نتیجہ میں اللہ نے ان پر دیگر اقوام کو مسلط کر دیا ہے۔ ان واقعات میں سب سے اہم واقعہ بخت نصر کا ہے جو کابل کا بادشاہ تھا اور اس نے بیت المقدس پر حملہ کرکے مسجد کے تمام زیورات لوٹ لئے تھے اور 70 ہزار سے زائد یہودیوں کو قتل کر دیا تھا نیز ایک لاکھ کو قیدی بناکر بکریوں کی مانند فلسطین سے باہر ہانک دیا تھا۔ اس واقعہ کے بعد سے ہی فلسطین میں یہودیوں کی تعداد پہلے سے بہت کم ہوگئی تھی۔ ان یہودیوں کو دوبارہ فلسطین میں قیام کی اجازت شاہ ایران کے خسرو کے دور میں ملی، لیکن ان کی شرارتوں اور بداعمالیوں میں کسی طرح کی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ لہٰذا ہمیشہ ذلت ورسوائی نے ان کا دامن تھامے رکھا یہاں تک کہ انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کو جو وقت کے نبی تھے صولی پر چڑھا دیا۔ اسی دور میں فلسطین میں عیسائی آبادی میں اضافہ ہوا اور عیسیٰؑ کی یادگار میں بیت اللحم میں چرچ بنایا گیا۔

13.5 فلسطین مسلم دور حکومت میں

جب عرب میں 610ء میں نبی کریم ﷺ کے ذریعہ آخری بار اللہ کی طرف سے توحید کی دعوت کی آواز بلند ہوئی تو اس کے مصداق فلسطینی بھی ٹھہرے۔ اسی آواز کو لیکر صحابہ دنیا کے مختلف کونے تک پہنچے۔ 638ء میں حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں جب اسلامی فوج مصر وشام فتح کرتے ہوئے فلسطین کی طرف بڑھی تو فلسطین کے عیسائیوں نے مسلمانوں کے سامنے صلح نامہ کی پیش کش کی اور یروشلم کے صدر پادری سوفرونیس نے خواہش ظاہر کی کہ وہ شہر کی چابی براہ راست خلیفہ وقت کو دینا پسند کریں گے۔ فاروق اعظم نے اس کی یہ درخواست قبول کرلی اور خلیفہ وقت حضرت عمرؓ فاروق مدینہ سے چل کر بنفس نفیس فلسطین تشریف لے آئے۔ انہوں نے پادری کو یقین

دلایا کہ شہر کے کسی باشندے کو نقصان نہیں پہنچایا جائے گا، جو لوگ ترک وطن کرنا چاہیں انہیں اپنے ساتھ اپنا مال و اسباب لے جانے کی اجازت ہو گی اور جو رہنا چاہیں انہیں مکمل تحفظ دیا جائے گا نیز انہیں کامل مذہبی آزادی حاصل ہو گی۔ اس طرح آپ کے ہاتھوں صلح نامہ پر دستخط کئے گئے اور مختلف انبیاء و رسل کی امتوں کی تہذیب و تمدن کا گہوارہ رہے اس ملک پر مسلمانوں کا قبضہ خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر ہو گیا۔ حضرت عمرؓ نے پادری سے درخواست کی کہ وہ انہیں وہ مقامات دکھادے جہاں سے محمد ﷺ سفر معراج پر روانہ ہوئے تھے (یہ ایک پتھر تھا جس پر بعد میں عبد الملک بن مروان نے قبۃ الصخرہ تعمیر کروایا) پادری نے حضرت عمر کو وہ چٹان دکھادی اور ساتھ ہی انہیں اظہار خلوص کے طور پر عیسائیوں کے چرچ تک آنے دعوت بھی دے دی نیز وہاں نماز ادا کرنے کی اجازت بھی مرحمت فرمادی۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اس پیش کش کو صرف اس لئے قبول نہیں کیا کہ کہیں فاتح قوم اس کو نظیر بنا کر آئندہ اسے روایت نہ بنالیں اور عیسائیوں کے چرچ کو مسلمانوں سے نقصان نہ پہنچنے پائے لہٰذا آپ نے چرچ سے باہر نکل کر جنوبی حصہ میں نماز ادا فرمائی، اس جگہ پر بعد میں ایک مسجد کی بنیاد رکھی گئی جو آج کی تاریخ میں بھی مسجد عمر کے نام سے مشہور ہے۔ عیسائی پادری نے آپ کے سامنے ایک اور درخواست رکھی تھی جس کو آپ نے مسترد کر دیا کہ فلسطین سے یہودیوں کو نکال دیا جائے، ان کا یہاں رہنا فتنہ کی بنیاد رکھنا جیسا ہے لیکن عمرؓ نے ایسا نہیں کیا بلکہ ان یہودیوں کے ساتھ بھی نرمی کا معاملہ فرمایا۔ اس کے بعد آپ مسجد اقصیٰ تشریف لے گئے۔ یہ مسجد کوڑے کرکٹ کے ڈھیر سے پٹی ہوئی تھی۔ آپ نے اس کی فوری صفائی کرائی اور یہاں پر حضرت عمرؓ نے لکڑی کے تختوں سے مسجد اقصیٰ کے کھنڈرات پر وسیع و عریض مسجد کی تعمیرات کرائی جس میں تین ہزار لوگ بیک وقت نماز ادا کر سکتے تھے۔ اس کے بعد عہد بنو امیہ میں خلیفہ عبد الملک اور ولید نے اس میں تعمیراتی ترقی دی جس سے اس کی وسعت میں مزید اضافہ ہو گیا اور ساتھ ہی قبۃ الصخرہ کی تعمیر بھی عمل میں آئی۔ عہد عباسی سے لیکر عہد عثمانی تک یہ مسجد درس و تدریس کا مرکز رہی۔ اس کا رقبہ 4400 مربع میٹر ہے۔ اس میں سنگ مرمر کے 53 ستون اور 11 دروازے شامل ہیں۔

13.6 مسجد اقصیٰ

ایک نقطہ یہاں عرض کرنا ضروری ہے کہ مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ دو الگ الگ عمارتیں ہیں۔ عام طور پر یہودی سازشوں کی وجہ سے ہمیں جو کیلنڈرز یا فوٹوز مہیا کرائے جاتے ہیں یا مسجد اقصیٰ کی جو تصویر پیش کی جاتی ہے دراصل اس میں اکثر گنبد صخرا کی تصویر ہوتی ہے اور عام انسان کے دل و دماغ میں یہی تصویر بسی ہوئی ہے مسجد اقصیٰ کے نام پر۔ دراصل یہ ایک سازش کے تحت مستقل چلائی جارہی اسکیم ہے جس سے مسلمانوں کے دلوں سے مسجد اقصیٰ کا اصل تصور ختم کر کے گنبد صخرا کو اس کا محرک بنا کر پیش کیا جائے تاکہ اس مسجد کے آثار باقیہ کو یہودی با آسانی مٹا سکیں اور اسلام و مسلمانوں کے لئے اس کا جو تقدس ہے اس کا خاتمہ کیا جاسکے۔

مسجد اقصیٰ دراصل وہ مسجد ہے جس کی تعمیر حضرت سلیمانؑ کے ہاتھوں منسوب ہے، لیکن مسلم شریف کی ایک روایت کے مطابق حضرت ابوذر غفاریؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول ﷺ سے دریافت کیا کہ دنیا کی سب سے پہلی مسجد کون سی ہے؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا مسجد حرام، پھر میں نے دریافت کیا کہ دوسری مسجد کون سی ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا مسجد اقصیٰ۔ پھر میں نے پوچھا دونوں کے درمیان کتنی مدت کا فاصلہ ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا چالیس سال۔ واللہ اعلم بصواب۔ ہو سکتا ہے حضرت آدمؑ کے ذریعہ اس کی بنیاد رکھی

گئی ہو اور زمانہ کے دست برد نے اسے کھنڈرات میں بدل دیا ہو جس کھنڈرات پر دوبارہ سے حضرت سلیمانؑ نے مسجد کی تعمیر کی ہو۔ بہر حال اللہ نے اس مسجد کا ذکر قرآن میں دو جگہ کیا ہے ایک تو سفر معراج کے موقع سے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ "پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو رات کے وقت مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ لے گیا، جس کے ارد گرد ہم نے برکتیں رکھی ہیں، تا کہ انکو ہم اپنے کچھ عجائبات قدرت دیکھائیں" دوسری جگہ سورۃ انبیاء میں متعدد مقامات پر اس زمین کو برکت والی زمین سے تعبیر کیا گیا ہے اللہ کا ارشاد ہے۔ ترجمہ "اور ہم نے ان کو اور لوط کو وہاں سے نکال کر اس سرزمین میں پہنچا دیا جس کو ہم نے سب کے لئے بابرکت بنایا ہے" اسی طرح ایک اور جگہ اللہ ارشاد فرماتے ہیں "اور سلیمان کے لئے ہم نے ہواؤں کو مسخر کر دیا تھا، جو ان کے حکم سے آندھی کی طرح اس سرزمین تک چلتی تھی جس میں ہم نے برکت دے رکھی تھی"۔ اس طرح ہمیں یہ علم ہوتا ہے کہ یہ مسجد قدیم ہے اور مسلمانوں کی فتوحات کے وقت ویران پڑی ہوئی تھی اور 638ء میں خلیفہ ثانی حضرت عمر کے دور میں لکڑی کے تختوں کی مدد سے اسے از سر نو تعمیر کیا گیا۔ جو آخری بار ظاہر بیبرس کے ذریعہ اپنے کامل شکل میں پہنچی ہے اس کے گنبد کا رنگ ہرا ہے جبکہ قبۃ الصخرا کے گنبد کا رنگ سنہریٰ ہے۔

فلسطین اور بیت المقدس 638ء سے مسلمانوں کے قبضہ میں رہے یہاں تک کہ 1099ء میں عیسائیوں نے اس پر دوبارہ نہ صرف قبضہ کر لیا بلکہ قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا جس کی مثالیں تاریخ میں شاذونادر ہی ملتی ہیں۔ اس قبضہ کے اٹھاسی سال بعد 1187ء میں سلطان صلاح الدین ایوبی نے فلسطین کو دوبارہ اسلامی پرچم کے زیر نگیں کر لیا اور انہوں نے یہ جنگ بزور اور صلح کی رو سے جیت لی تھی عیسائیوں کی ظالمانہ حرکتوں کو نظر انداز کر دیا گیا، اور مسلمان بلا خوف و خطر بیت المقدس میں داخل ہوئے۔ اس وقت سے فلسطین کی ارض مقدس مسلمانوں کی ماتحتی میں اپنی برکات کا ظہور کرتی رہی، یہاں سے نہ جانے کتنے علماء و صلحاء اور سائنسدان پیدا ہوئے جنہوں نے انسانی تاریخ میں انسانوں کی نشو و نماء کے لئے جسمانی و روحانی اثرات مرتب کئے۔

13.7 فلسطین عثمانی دور حکومت میں

فلسطین پورے اسلامی دور میں لبنان و اردن کی طرح مضافات شام کا حصہ رہا ہے اور اس پر اموی، عباسی، فاطمی، سلجوقی، ایوبی، مملوک اور پھر عثمانیوں نے حکومت کی۔ سلطان سلیم اول نے 1517ء میں مصر پر فتح حاصل کی جس کے ساتھ ہی فلسطین پر بھی قبضہ ہو گیا اور اسی وقت سے عثمانی خلافت کا آغاز بھی ہوتا ہے جو 1917ء تک قائم رہی۔ اس پورے زمانے میں فلسطین ایک مکمل آزاد اور خود مختار ریاست رہی کبھی بھی اس کی عوام کو محکوم نہیں بنایا گیا بلکہ ارض مقدس ہونے کی صورت میں عثمانیوں کے نزدیک وہ ہمیشہ لائق عزت و احترام ہی رہے۔

13.7.1 صہیونیت

صہیونیت کا تعارف: صہیون عبرانی لفظ طزیون سے ماخوذ ہے۔ صہیونیت ایک سیاسی نسل پرست تحریک ہے جس کا اولین مقصد یہودیوں کو ارض کنعان اور فلسطین میں حکومت قائم کرنا ہے جس کے ذریعہ پوری دنیا پر حکمرانی کی جاسکے اور اقوام عالم پر تسلط و قبضہ حاصل

ہو جائے ، لفظ 'صہیونیت' جبل ''صہیون'' سے مشتق ہے جو شہر قدس اور یروشلم کے درمیان واقع ہے جہاں بین الاقوامی صہیونیت ہیکل سلیمانی قائم کرنا چاہتی ہے. یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت داوٴدؑ نے اس صہیون نامی پہاڑی پر ایک معبد خانہ، عبادت گاہ جسے آج کے یہودی 'کنیسہ' کہتے ہیں اس کی بنیاد رکھی' اسی لئے اس پہاڑی کو مقدس سمجھا جانے لگا-یہودیوں نے اس صورتحال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس پہاڑی کو اپنے ادنیٰ مقاصد کے حصول کے لئے علامت بنالیا' اسی سے لفظ ''صہیونیت'' بنا ہے. واضح رہے کہ یہ لفظ صہیون ہے نہ کے صیہون جیسا کہ عام ہو گیا ہے۔ صہیونیت یہودیوں کی مذہبی تشخص کی حمایت کرتی ہے نیز انہیں دوسرے معاشروں میں ضم ہونے کی مخالف ہے۔انیسویں صدی عیسوی کے آخر میں یورپ میں کئی یہودی گروہوں نے یہودی قومی آبادی اور عبرانی زبان کی حفاظت و نشوونما کی تائید میں یہودی ریاست کی بنیاد پر زور دیا۔ یہ گروہ اجتماعی اعتبار سے "احباء صہیون" کہلائے جنھوں نے یہودیوں میں یہ سمجھ پیدا کرنے میں اہم کردار اداء کیا ہے۔ اس لفظ کو سب سے پہلے آسٹریا کے یہودی مفکر ناتھن برنبام نے استعمال کیا، انہوں نے 1890ء میں اپنے ایک جریدے ''خود خلاصی''میں اس اصطلاح کا استعمال کیا تھا۔

اگرچہ صہیونی تحریک کا آغاز 27 اگست 1897ء کو سوئیزرلینڈ میں منعقدہ پہلی صہیونی کانگریس کے ساتھ عمل میں آیا تھا، لیکن یہودیوں کو فلسطین میں بسانے کی پلاننگ کافی عرصہ پہلے ہی رچی جا چکی تھی۔ مشرقی یورپ، فرانس اور روس میں یہودیوں کے ساتھ بربریت کا عمل جاری تھا۔ اس دور میں یہود کی باغیانہ مزاج اور تخریبی ذہن کے نتیجہ میں سارا یورپ ان سے تنگ آچکا تھا۔ نیز عیسائیت اور یہودیت کی ہزاروں سال پرانی دشمنی بھی اس میں داخل تھی، نیز یورپ میں سام النسل مخالفت بھی ایک وجہ ترک وطن تھی۔ یورپ سے انہیں ان بنیادوں پر کھدیڑ کر نکالا جا رہا تھا۔ ان کی آبادیاں چاروں طرف سے دیوار سے گھری ہوتی تھیں جسے گھیٹو(Ghetto) کہا جاتا تھا۔ عیسائیوں میں یہ نظریاپایا جاتا ہے کہ یہودی اور وفاداری ایک دوسرے کے مدمقابل ہیں، اسی وجہ سے ملک سے انکی وفاداری پر ہمیشہ خطرہ منڈراتا رہتا تھا۔ ایسے حالات میں بھی اگر ان یہودیوں کو کہیں سکون میسر آیا یا کہیں انہیں عزت دی گئی تو وہ مسلمانوں کی حکومت میں ہی ملی۔ خلیفہ بایزید ثانی نے تو ایک قانون پاس کر دیا تھا جس کے رو سے یہود کے ساتھ حسن سلوک کا حکم صادر فرمایا گیا تھا۔ اسی ضمن میں چند عیسائی یہود نواز مفکرین کے ذریعہ یورپ میں یہودیوں کے سماجی، معاشی اور تہذیبی اقتدار کو از سر نو عمل میں لانے کے لئے کوششیں کی گئیں، لیکن یہودی مذہبی تنظیموں نے اس کی مخالفت کی۔ کیونکہ ان کو فلسطین میں اپنا اقتدار قائم کرنا تھا۔ قوم پرستی کے جذبات اور حصول وطن کے خیالات کو اس وقت جاری جارحانہ وطن پرستی اور نسل پرستی کی ہوا نے مستحکم کیا، جس کے نتیجہ میں صہیونی سیاست نے جنم لیا۔

قیام ریاست کی ابتدا فرانس کے سیاسی و اقتصادی انقلاب کے بعد ہوئی ہے، جب نیپولین بوناپارٹ برسر اقتدار آیا اور یہودیوں نے اس کے سامنے دولت کے دہانے کھول دئے نیز 1791ء میں انقلاب فرانس کے بعد یہودیوں کو فرانس کے باشندوں کے برابر حقوق ملے جس کے 7 سال بعد 1798ء میں یہودی کونسل نے فرانس کی حکومت کے سامنے "یہودی مملکت کے قیام" کا مطالبہ رکھ دیا، جسے منظور کرتے ہوئے نیپولین نے 1799ء میں اپنا مشہور اعلامیہ جاری کیا جس میں عالم اسلام کے قلب میں واقع فلسطین میں ایک یہودی ریاست دلانے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ لیکن بوناپارٹ کی شکست اور ناکامی نے یہودیوں کا رخ برطانیہ کی طرف موڑ دیا جو اس دور کا چڑھتا ہوا سورج

تھا۔ برطانیہ نے استعماریت اور سرمایہ داری کا پوراجال دنیا کے مختلف ملکوں تک پھیلا رکھا تھا جس میں زیادہ تر مسلم ممالک شامل تھے۔ یہودی بھی اس زمانہ تک اقتصادی طور پر بہت مضبوط ہو چکے تھے انہوں نے متعدد بینک کھول لئے تھے، سود کا پورا نظام قائم کر لیا تھا جس کے ذریعہ بڑے بڑے سرمایہ داروں کو انہوں نے اپنی طرف راغب کر لیا تھا۔ برطانیہ کو بھی اپنے سرمایہ دارانہ نظام کو فروغ دینے کے لئے سرمائے کی ضرورت تھی جو یہودیوں کے پاس تھا اس لئے یہ دونوں ایک دوسرے کے حلیف بن گئے۔ دراصل نیپولین بوناپارٹ اور برطانیہ کا یہودیوں کو فلسطین میں ریاست بنانے میں مدد کرنا اس بات کا حصہ تھا کہ یورپ کو ان کے وجود سے جلد از جلد خالی کیا جا سکے۔ برطانوی وزیر خارجہ پاسٹین متعدد بار سفارتی طور پر نہ صرف براہ راست عثمانی سلطنت سے بات کی بلکہ مصر کے والی محمد علی پاشا سے بھی فلسطین مین یہودی بستی کے قیام کی سفارشیں کیں جو کہ منظور نہیں ہوئیں۔

یہی وہ حالات ہیں جس سے صہیونی تحریک کی ابتداء ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں پروفیسر سید حبیب الحق ندوی اپنی کتاب "فلسطین اور بین الاقوامی سیاست" میں رقم طراز ہیں:

> "فرانس میں شرق اوسط کے ساتھ روز افزوں دلچسپی اور اہل یہود کے حق میں اظہار ہمدردی برطانیہ کے لئے سیاسی اور دینی چیلنج تھا، اس کے مقابلہ کے لئے انگلینڈ میں بھی تحریکات شروع ہوئیں جو پھیل کر اسٹریلیا تک جا پہنچیں، جنوبی اسٹریلیا کے برطانوی گورنر نے 1845ء میں تجویز پیش کی کہ فلسطین میں یہودی کالونی قائم کی جائے۔ انگلستان میں ادزرائلے جو یہودی تھا، عیسائی بن گیا تھا، جارج ایلیٹ، ایڈورڈ کازرلٹ اور لارنس نے 1882ء میں سلطان ترکی سے اس سلسلہ میں مراعات حاصل کرنے کی سعی کی، لیکن ناکام ہوئے۔ فلسطین میں یہودی آبادی کا قائد اعظم ایرل آف شیفٹبری تھا۔۔۔۔ وہ مذہبی تھا اور ساری عمر فلسطین میں یہودی آبادی کی مہم پر کام کرتا رہا۔ چنانچہ سکریٹری خارجہ لارڈ پامرسٹن کو اس نے سب سے پہلے 1838ء میں اپنا پلان پیش کیا، یروشلم میں کونسل قائم کروائی، اس کا سب سے اہم کارنامہ 1876ء کا وہ مقالہ ہے جو اس نے صہیونیت کی تائید میں لکھا، مذہبی، انسانی اور اخلاقی دلائل کے بعد سیاسی دلائل کے ذریعہ اس نے برطانیہ کو یقین دلانے کی سعی کی کہ فلسطین کو جس کا مستقبل روز روشن کی طرح عیاں ہے، صرف یہود دنیا کا سب سے بڑا تجارتی مرکز بنا سکتے ہیں۔ اس نے برطانیہ کو متنبہ کیا کہ اگر اس کے حریف ورقیب فرانسیسی یا روسی فلسطین پر قابض ہو گئے تو برطانیہ کی موت ہے۔ برطانیہ عظمیٰ دو حصوں میں بٹ جائے گا مشرقی نو آبادی ہند کٹ جائے گا، سیاسی بصیرت کا تقاضہ ہے کہ برطانیہ اس علاقہ کو روس و فرانس کے ہاتھ جانے نہ دے۔ اس نے یہ بھی واضح کر دیا کہ فلسطین پر قبضہ یہودیوں کی حمایت کے بغیر ممکن نہیں، چونکہ برطانیہ دنیا کا عظیم تاجر ہے لہٰذا فلسطین میں یہودی آبادکاری کا حق ہے، یہود کی فلسطینی قومیت تین ہزار سالوں سے مسلم ہے، اس کے احیاء کے لئے صرف اتحاد کی ضرورت ہے، یہ تجربہ مصنوعی نہیں بلکہ تاریخی و فطری تجربہ ہو گا۔"

اس اقتباس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہود اور فرانس یا یہود اور برطانیہ کا یہ تعلق طرفین کے مفاد پر مبنی تھا، یہود کی کامیابی یہ تھی

کہ انہوں نے اپنے مفکرین اور مال کے بل بوتے اس عیسائی قوم کو شیشے میں اتار لیا تھا جو اس کی سب سے بڑی دشمن تھی۔اور اس طرح صہیونیت کا ایسا مغلوبہ تیار ہوا جس میں یہودیت اور صلیبیت دونوں کے اجزاء شامل تھے۔اسی ضمن میں 1861ء میں ہرش کالیشر نامی جرمن یہودی کی کتاب "صہیونیت کی تلاش" اہمیت کی حامل ہے۔ الگزنڈر سوم کی یہود مظالم جارحانہ اقدام سے دل برداشتہ ہو کر لیو پنسکر نے 1882ء میں ایک پمفلٹ جاری کیا جس میں یہودیوں کی ایک الگ مملکت پر زور دیا گیا تھا۔اسی کڑی میں ایک اور اضافہ موزس ہیس نامی شخص کی کتاب "روم اور یروشلم" نے کیا جس کے ذریعہ اس تصور کو مزید تقویت حاصل ہوئی۔ان نظریات کے نتیجہ میں یہودی سرمایہ داروں نے جن میں بیرن ماسٹر ہرش اور انڈمنڈ روتھ شیلڈ مشہور ہیں نے اپنے سرمائے کو فلسطین میں زمین خریدنے اور وہاں یہودیوں کو آباد کرنے پر خرچ کرنا شروع کر دیا تھا۔

اس نظریات کو سب سے زیادہ تقویت دینے والی کتاب اور ذات آسٹریائی صحافی تھیوڈر ہرزل کی ہے جس نے 1896ء میں "یہودی ریاست" کے نام سے ایک معروف کتابچہ شائع کیا جس میں یہودیوں کی آزاد ریاست کے تصور کو پر زور انداز میں بیان کیا گیا تھا۔ تھیوڈر ہرزل نے اپنے انتقال 1905ء سے پہلے یہودیوں کی متعدد تنظیم بنائی جس کے ذریعہ یہودی ریاست کا خواب شرمندہ تعبیر کیا جا سکے ان میں "یہودی قومی فنڈ"، اور "فلسطینی نو آبادی ٹرسٹ" قابل ذکر ہیں۔ ہرزل نے 1897ء میں باسل کانفرنس میں اپنا منصوبہ پیش کیا تھا جبکہ وہ اس سے پہلے سلطان عبد الحمید سے ملاقات کر چکا تھا اور اسے اس ملاقات سے کوئی فائدہ نہیں دکھائی پڑتا تھا لیکن اس کے مضبوط عزام نے کمزور نہیں ہونے دیا بلکہ زیادہ مضبوطی اور منصوبی بند طریقہ پر انہوں نے اپنا لائحہ عمل تیار کیا۔باسل کانفرنس کے تین نکاتی پروگرام یہ تھے

- فلسطین کی طرف یہودیوں کی ہجرت کو بڑھاوا دینا۔
- عالمی برادری سے یہودیوں کے لئے فلسطین میں اپنا وطن بنانے کا قانونی جواز حاصل کیا جائے۔
- پوری دنیا کے یہودیوں کو صہیونی فکر پر متحد کیا جائے۔

باسل کانفرنس کے اختتام پر ہرزل نے کہا تھا کہ اگر کانفرنس کے مقصد کو ایک لفظ میں بیان کروں تو میں کہوں گا کہ باسل میں صہیونی حکومت کی بنیاد رکھ دی گئی ہے، اور پچاس سالوں بعد اس یہودی مملکت کو پوری دنیا اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گی۔

13.7.2 سلطنت عثمانیہ کا خاتمہ اور یہود

یہودیوں کی متعدد ٹیم نے فلسطین میں یہود بستی کے قیام کی خاطر سلطان عبد الحمید خلیفہ وقت سے ملاقاتیں کی تھیں، لیکن انہیں خواطر خواہ کامیابی نہیں ملی۔اس لئے یہودیوں نے سلطنت عثمانیہ کے خاتمہ اور خلیفہ کی معزولی کی اسکیم بنائی اور خفیہ طریقے سے اسے انجام دیا۔ مولانا علی میاں ندوی اس بارے میں اپنی مشہور کتاب "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر" کے ایک اقتباس میں خلیفہ کی معزولی اور ادارئے خلافت کے خاتمہ میں ترکوں کی دلچسپی کے بارے لکھتے ہیں کہ:

"ترکوں کی بد قسمتی سے زیادہ مسلمانوں کی بد قسمتی ہے کہ عین ترقی و عروج کے زمانہ میں ترکوں میں تنزل و انحطاط شروع ہو گیا اور قوموں کے پرانے امراض ان میں پیدا ہو گئے۔۔۔ سب سے بڑا مرض جو ترکوں میں پیدا ہوا تھا وہ جمود تھا، اور جمود بھی دونوں طرح کا، علم و تعلیم میں بھی جمود اور فنون جنگ اور عسکری تنظیم و ترقی میں بھی۔۔۔ افسوس ہے کہ ترک مطمئن ہو کر بیٹھ گئے اور مغربی قومیں کہیں سے کہیں پہنچ گئیں۔"

ترکی کے اس جمود نے ان ترک نوجوانوں کو جو مغرب کی یونیورسٹیوں سے تعلیم یافتہ ہو کر آئے تھے اور جن کی نظر میں موجودہ نظام سیاست فرسودہ ہو چکا تھا۔ ان کا ماننا تھا کہ ملک میں مغربی طرز کی دستوری حکومت قائم کریں اور انتظامی شعبہ جدید اصولوں پر منظم کئے جائیں۔ چنانچہ ان نوجوان ترکوں کی تنظیم "انجمن اتحاد و ترقی" کے سخت دباؤ کی وجہ سے 1908ء کو سلطان عبد الحمید کو پارلیمانی دستور کی بحالی کا اعلان کرنا پڑا۔ انجمن کے ممبران کو خوف تھا کہ کہیں سلطان اس بار بھی اسے منسوخ نہ کر دیں، اس لئے ان کو معزول کر کے ان کے چھوٹے بھائی محمد ارشاد کو برائے نام سلطان بنا دیا گیا اور سارے اختیارات انجمن اتحاد و ترقی کو منتقل ہو گئے۔ اس طرح سلطان کو معزول کر کے یہودی اپنے مقصد سے ایک قدم اور قریب ہو گئے۔ نیز جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد اتحادیوں کے ذریعہ ترکی کی بندر بانٹ اور پھر تحریک آزادی نے خلافت کے خاتمہ کا راستہ ہموار کر دیا اور اس طرح 1923ء میں خلافت کے احکامات کو ختم کیا گیا اور 1924ء میں خلافت کو نام و نشان بھی مٹا دیا گیا۔ یہودیوں نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ انہوں نے اپنے مقصد کو پورا کرنے کے لئے جنگ عظیم اول برپا کی۔ جنگ عظیم کے دوران برطانیہ، فرانس، روس، جرمنی اور اتحادی ممالک کے حالات کے مد نظر ایک بات جو سب سے زیادہ نظر انداز کی گئی وہ 20ویں صدی کے آغاز میں یہودیوں کا کردار ہے۔ 1897ء کی باسل کانفرنس کے بعد سے ہر سال صہیونی کانفرنس منعقد ہوتی رہی ہیں۔ انہیں کانفرنسوں میں وہ خفیہ تجاویز منظور ہوئیں جنہیں ہم خفیہ دستاویزات کے طور پر دیکھتے ہیں۔ ان دستاویزات میں سے پروٹوکول نمبر 7 کا جائزہ لیا جائے تو سارے خدشات کافور ہو جاتے ہیں اور تاریخی حقائق سامنے آتے ہیں۔ اس میں لکھا ہے کہ:

"ہمیں یورپ میں اور دیگر براعظموں میں بھی فساد، انتشار اور جنگ و جدل بھڑکانی ہے۔ اس سے ہمیں دوہرا فائدہ ہو گا۔ اول یہ کہ تمام ملکوں اور قوموں کو اپنے قابوں میں رکھ سکیں گے، دوم، ہم ان تمام ڈوروں کو جو سیاسی نظاموں، معاشی معاہدوں اور قرضہ جات کے وسیلوں سے مختلف ملکوں کی وزارتوں میں پھیلی ہوئی ہیں، الجھا کر رکھ دیں گے۔ اس مقصد کے لئے ہمیں مذاکرات کے دوران پوری ہوشیاری اور فراست سے کام لینا ہو گا۔ لیکن جہاں تک سرکاری زبان کا تعلق ہے ہمیں اس پالیسی کے برعکس حکمت عملی اختیار کرنی ہو گی۔ اس سلسلہ میں ہمیں دیانتداری اور خلوص کا اظہار کرنا ہو گا، تاکہ غیر یہود عوام اور حکومتیں، ہمیں نسل انسانی کی محسن، نجات دہندہ اور مہر و محبت کے پیکر سمجھتی رہیں" (یہودی پروٹوکولز، ص130۔)

یہ اقتباس اس بات پر دلالت ہے کہ یہودیوں نے نہ صرف جنگ عظیم اول برپا کی بلکہ یورپ سے لیکر وسط ایشیاء میں جو کچھ ہو رہا تھا وہ ان سبھی کے پیچھے کارفرماں تھے۔

13.8 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:۔

- مسئلہ فلسطین دنیا کی نظر میں ایک سیاسی مسئلہ ہو گا لیکن مسلمانوں کے لئے وہ سیاست سے زیادہ مذہبی مسئلہ ہے۔ اور یہ بات یہود بھی اچھی طرح جانتے ہیں لیکن وہ خود بھی مذہبی نقطہ نظر کی وجہ سے ہی اس خطہ میں اپنی قیام گاہ بنائی اور اسے وسعت دیکر پورے فلسطین پر قابض ہونا چاہتے ہیں، تاکہ حضرت مہدی کے آنے تک پوری دنیا پر انکی بادشاہت قائم ہو جائے۔ مگر یہودیوں نے دنیا کے سامنے جو منظر نامہ پیش کیا ہے وہ بلکل سیاسی نظریہ کا حامل ہے جس میں صرف فلسطین جیسے مادنیات سے بھرے ہوئے ملک جس میں اللہ نے برکت رکھی ہے اور یہ تین براعظموں کی تجارتی شاہراہوں کا نگہبان بھی ہے پر اقتصادی نقطۂ نظر سے قبضہ کیا گیا ہے اور دوسرا جواز یہ ہے کہ چونکہ اسرائیل کی سب سے پہلی سرزمین یہی تھی اور اللہ نے انہیں اس زمین پر بسانے کا وعدہ کیا ہوا ہے اس لئے وہ اس پر اپنا دائمی حق سمجھتے ہیں۔
- لیکن تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ارض مقدس دنیا کے تین بڑے مذاہب کے ساتھ وابستہ ہے اور ان میں تقدس واحترام کا جذبہ پایا جاتا ہے۔اس سرزمین پر سب سے پہلی قوم عرب تھی جو آرامی کہلاتی ہیں اور بعد میں فلسطینی وہاں مقیم ہوئے ،اس کے بعد حضرت موسیٰؑ اور پھر داوٗدؑ اور سلیمانؑ کا تذکرہ ہے اسرائیلی جن کے ماننے والے ہیں۔اس لحاظ سے اس ارض مقدس کے اصل حقدار فلسطینی ہی ہیں جو پورے عرصہ میں یہاں مقیم رہے جبکہ اسرائیلیوں کو متعدد بار اس ملک سے ملک بدر کیا گیا ہے۔
- مسئلہ فلسطین کے اس حصہ میں، فلسطین کی تاریخ، آثار قدیمہ، مسجد اقصیٰ اور ملک کی تاریخ پیش کی گئی ہے، نیز فلسطین کا یہ مسئلہ کب اور کیسے شروع ہوا اس پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ صہیونیت اور اس کے کارناموں کا تذکرہ ہے ساتھ ہی ترکی اور سلطان عبد الحمید کی پالیسی فلسطین کے متعلق معلومات فراہم کی گئیں ہیں۔

13.9 نمونہ امتحانی سوالات

13.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. فلسطین کے شمال میں کون سا ملک واقع ہے ؟

(a). شام ولبنان　(b). سیریا وعراق　(c). ایران ویمن　(d). مصر وجارڈن

2. بیت اللحم کا تعلق کس مذہب سے ؟

(a). اسلام　(b). یہودیت　(c). عیسائیت　(d). ان میں سے کوئی نہیں

3. صلاح الدین ایوبی نے کس سن عیسوی میں فلسطین کو دوبارہ فتح کیا؟

(a).1178ء (b).1187ء (c).1099ء (d).1087ء

4. قبۃالصخرہ کی تعمیر کس خلیفہ کے دور میں مکمل ہوئی ؟

(a).حضرت عمرؓ (b).مروان بن حکم (c).عبد الملک بن مروان (d).ولید بن عبد الملک

5. تھیوڈر ہرزل کی کتاب کانام بتایئے ؟

(a).یہودی ریاست (b).صہیونیت کی تلاش (c).روم اوریروشلم (d).صلیبیت کیاہے

6. پہلی صہیونی کانگریس کہاں منعقد ہوئی تھی ؟

(a).سوئزرلینڈ (b).باسل (c).جنیوا (d).سب غلط

7. صہیونی تحریک کے بانی کانام بتایئے ؟

(a).ایڈورڈلارنس (b).تھیوڈرہرزل (c).بالفور (d).سب غلط

8. مسلمانوں نے کس سن عیسوی میں فلسطین کو فتح کیا؟

(a).638ء (b).640ء (c).1187ء (d).1099ء

9. فلسطین پر عثمانیوں کاقبضہ کب سے کب تک رہا؟

(a).1517-1924 (b).1517-1920 (c).1517-1919 (d).1517-1917

10. صہیونیت کی تلاش کے مصنف کاکان بتایئے ؟

(a).ہرش کالیشر (b).ہرزل (c).جارج ایلیٹ (d).ایڈمنڈروتھ شیلد

13.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. فلسطین کاجغرافیہ بیان کیجیے۔
2. فلسطین سرزمین انبیاءوضاحت کیجیے۔
3. سلطنت عثمانیہ کے خاتمہ میں یہودی سازشوں پر نوٹ تحریر کیجیے۔
4. اسلامی دور حکومت میں فلسطین کی تاریخ کاجائزہ لیجیے۔
5. فلسطین میں اسرائیلی بستی قائم کرنے میں برطانیہ کاکردار کیاتھا؟ بیان کیجیے۔

13.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. فلسطین کی تاریخ قدیم کاجائزہ لیجیے۔
2. ضہیونیت کیاہے اس کے اغراض ومقاصد پر مضمون لکھیے۔

3. مسجد اقصیٰ کی تاریخ درج کیجیے۔

13.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر : مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، مکتبہ اسلامیہ، لکھنؤ، 1973
2. م فلسین اور بین الاقوامی سیاست : پروفیسر سید حبیب الحق ندوی، کراچی، 1976
3. فلسطین اور مسئلہ یہود : محمود بریلوی، مطبع انوار احمدی، الہ آباد۔
4. نئی عرب دنیا : محمد یونس نگرامی ندوی، لکھنؤ، 1985
5. مسئلہ فلسطین : ایڈورڈ سعید، ایفأبراؤ پبلیشرز، لاہور، 1991
6. بلاد فلسطین وشام : جی لی اسٹرنج، جامعہ عثمانیہ، سرکار عالی حیدرآباد، 1932
7. المیہ فلسطین : خواجہ محمود جاوید، کتب خنہ جمہوریہ کراچی، 1983

اکائی 14: مسئلہ فلسطین (حصہ دوم)

اکائی کے اجزا:

14.0 تمہید
14.1 مقاصد
14.2 انتداب
14.3 اعلان بالفور
14.4 یہودیوں کی یورپ سے فلسطین کی طرف ہجرت
14.4.1 فلسطینی عربوں کی جدوجہد
14.4.2 تقسیم فلسطین
14.4.3 قیام اسرائیل میں امریکہ اور اقوام متحدہ کا کردار
14.5 قیام اسرائیل
14.6 1948ء کی جنگ
14.6.1 اقوام متحدہ میں اسرائیل کی شمولیت
14.7 فلسطینی مزاحمت اور تنظیمیں
14.7.1 مفتی امین الحسینی
14.7.2 یاسر عرفات
14.7.3 شیخ احمد یاسین
14.8 کیمپ ڈیوڈ معاہدہ
14.9 اوسلو معاہدہ
14.10 انسانی حقوق اور فلسطین

14.10.1 عالمی فوجداری عدالت اور مسئلہ فلسطین

14.11 اکتسابی نتائج

14.12 نمونہ امتحانی سوالات

14.12.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

14.12.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

14.12.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

14.13 تجویز کردہ اکتسابی مواد

14.0 تمہید

اس یونٹ میں فلسطین اور اسرائیل کے مسئلے کی تاریخی، سیاسی اور انسانی پیچیدگیوں کا جامع جائزہ پیش کیا جائے گا ساتھ ہی اس میں برطانیہ کے کے کردار اور اعلان بالفور سے لیکر انتداب، قیام اسرائیل، 1948ء کی جنگ، کیمپ ڈیوڈ معاہدہ، اوسلو معاہدہ اور ملک کی آزادی کے لئے فلسطینی مزاحمت وغیرہ پر گفتگو کریں گے۔

اس تنازع کا آغاز 1917 میں برطانوی اعلامیہ بالفور سے ہوا، جس نے فلسطین میں ایک یہودی ریاست کے قیام کی بنیاد رکھی۔ اس اعلامیے نے فلسطینی عوام کی زمین، حقوق اور شناخت کو خطرے میں ڈال دیا اور 1948 میں اسرائیل کے قیام نے اسے مزید پیچیدہ بنا دیا۔ اسرائیلی حکومت کے قیام نے فلسطینی عوام کو بڑے پیمانے پر بے گھر کر دیا، اور "نکبہ" کے نام سے ان کی جلاوطنی کا ایک مستقل باب شروع ہوا۔ جس کے لئے فلسطینی مزاحمت اس مسئلے کا ایک اہم پہلو ہے، جو مختلف ادوار میں گوریلا جنگ، سیاسی احتجاج، اور سفارتی کوششوں کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ فلسطینی عوام نے اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے مسلسل جدوجہد کی، جس میں ان کی آزادی کی خواہش اور شناخت کی بقا کا عزم جھلکتا ہے۔ اس اکائی میں فلسطینی مزاحمت کی مختلف شکلوں کا تجزیہ کیا جائے گا، جو ان کی جدوجہد آزادی کا نمایاں پہلو ہیں۔ نیز انسانی حقوق کی پامالی اور فلسطین کے حالات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ فلسطینی عوام کو جبری نقل مکانی، پابندیوں، اور بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کا سامنا ہے۔ یہ باب فلسطین میں انسانی حقوق کی پامالیوں کا بین الاقوامی اصولوں کی روشنی میں جائزہ پیش کرتا ہے، جس سے اس مسئلے کے انسانی پہلو واضح ہوتے ہیں۔

اوسلو معاہدہ بھی اس باب میں زیر بحث ہے، جو ایک امن معاہدے کے طور پر پیش ہوا، مگر زمینی حقائق میں یہ توقعات پوری نہ ہو سکیں۔ یہ باب اوسلو معاہدے کے مقاصد اور اس کی ناکامی کے اسباب کا عالمانہ تجزیہ پیش کرتا ہے۔ اس طرح یہ باب فلسطین اور اسرائیل

کے مسئلے کو ایک جامع تناظر میں سمجھنے کا موقع فراہم کرتا ہے تا کہ طلبہ اس پیچیدہ مسئلے کو علمی طور پر سمجھ سکیں۔

14.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد ہے کہ طلباء کو فلسطین میں قیام اسرائیل کی تاریخ اور اس میں برطانیہ وامریکہ کے کردار کو متعارف کرانا۔ فلسطینی مزاحمت اور کیمپ ڈیوڈ معاہدے واوسلو معاہدوں کی معلومات فراہم کرانا۔ نیز فلسطینی مزاحمت کی تنظیموں سے آگہی اور اس میں یاسر عرفات و شیخ احمد یٰسین کی خدمات کا تذکرہ بھی شامل ہے۔ کیمپ ڈیوڈ، اور اوسلو معاہدہ میں کن اصولوں پر مذاکرات ہوئے جن پر عمل درامد ہوا اور کون سی شق ایسی تھیں جو بروکار نہیں لائی گئیں۔ اور کیوں اوسلو معاہدہ امن کے قیام میں کامیاب نہیں ہو سکا۔

14.2 انتداب

انتداب کے معنٰی نگرانی، تسلط یا زیر اقتدار لانا وغیرہ ہیں۔ اصطلاح میں اس کا مطلب ہوتا کہ سیاسی نقطۂ نظر سے کسی ملک کا کسی دوسرے ملک پر تسلط۔ جو کہ قبضہ کی شکل میں نہ ہو بلکہ صرف دیکھ بھال کی صورت میں ہو۔ یہ منظر نامہ چونکہ مسئلہ فلسطین سے جڑا ہوا ہے اس لئے اس میں برطانیہ اور دیگر اتحادی ممالک بھی شامل ہیں جیسے کہ فرانس، روس وغیرہ۔ برطانوی انتداب کی شروعات پہلی جنگ عظیم کے اختتام کے بعد سے ہوتی ہے، جب برطانیہ نے جنگ عظیم میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد عربوں سے کئے گئے وعدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے فلسطین کو آزاد مملکت بنانے کے بجائے 1920ء اسے اپنی تحویل میں لے لیا۔ انگریزوں کی فطرت میں مکاری اور چالبازی ہمیشہ سے رہی ہے، اس قوم نے تاریخ کے ہر دور میں مکر و فریب کے ایسے کارنامے انجام دئے ہیں جسکا مقابلہ دوسری اقوام سے ممکن نہیں۔ فلسطین کے حوالے سے بھی انگریزوں نے وہی ہتھکنڈہ اپنایا۔ باسل کی کامیاب کانفرنس کے بعد جب ہرزل نے برطانوی حکمرانوں کا رخ کیا اور ان سے اسرائیلی قوم کے لئے ایک مملکت بنانے کی درخواست کی تو برطانیہ نے فوراً اس سے اتفاق کرتے ہوئے 1903ء میں مشرقی افریقہ کے کینیاء میں ایک بڑا علاقہ اس مقصد کے لئے مخصوص کر دیا، لیکن یہودیوں کی اکثریت جو فلسطین کو اپنا مستقر بنانا چاہتی تھی اس پیش کش کو مسترد کر دیا۔ اس کے بعد جب پہلی جنگ عظیم سے پہلے برطانیہ، فرانس اور روس نے یورپ کے اس مرد بیمار یعنی ترکی کی تمام اراضی کے حصہ بخرے کرنے کا لائحہ عمل تیار کیا اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جنگ عظیم کی مصیبت سر ڈال دی، جو کہ یہودیوں کا ہی منصوبہ تھا۔ چنانچہ سلطنت عثمانیہ کو کمزور کرنے کے لئے برطانیہ نے پہلے عربوں سے آزاد عرب مملکت قائم کرنے کا وعدہ کیا اور عرب قومیت کی بیج ڈالی گئی نیز پہلی جنگ عظیم کے دوران برطانیہ نے متعدد حربوں اور رسوائے زمانہ جاسوس کرنل ٹی، ای لارنس کی مدد سے عربوں کو عثمانیوں کے خلاف بغاوت پر آمادہ کر لیا۔ 1915 اور 1916ء کے درمیان شریف حسین اور مصر میں برطانوی ہائی کمشنر مکموہن کے درمیان دس خطوط کا تبادلہ عمل میں آیا۔ شریف مکہ نے عثمانیوں کے خلاف بغاوت کرنے اور اتحادیوں کی مدد کا وعدہ کیا نیز انہوں نے عرب ممالک کی آزادی کا دوٹوک مطالبہ کرتے ہوئے عرب علاقوں کی سرحدوں کی واضح نشاندہی کر دی جس میں فلسطین بھی شامل تھا۔ لیکن برطانیہ کا یہ وعدہ کہ عربوں کی آزاد حکومت قائم کرنے میں وہ ان کی مدد کرے گی صرف ایک سیاسی مصلحت تھی کیونکہ 1916ء میں برطانیہ اور فرانس نے ترکی

کے عرب علاقے آپس میں تقسیم کر لینے کا ایک خفیہ معائدہ کر لیا تھا جو سائیکس پیکو معاہدہ کہلاتا ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے اختتام سے پہلے ہی ترکی میں نوجوان ترکوں کی حکومت میں شمولیت اور اقتدار پر قبضہ اور جدید اقتصادی نظریات کے حاملین کی نااہلی سے ترکی کی جنگ میں شمولیت، خلافت کے خاتمہ اور سیکولر نظریات کی تشہیر یہ وہ عناصر تھے جنہوں نے سلطنت عثمانیہ کے حصہ بکھرے کرنے میں اہم کردار اداء کیا۔ جنگ عظیم میں ترکی اور اس کے اتحادیوں کی شکست سے عرب علاقوں پر برطانیہ کا قبضہ ہو گیا جن میں، عراق، اردن اور فلسطین قابل ذکر ہیں، اسی طرح لبنان اور مغربی شام پر فرانس نے قبضہ کیا۔ صرف جزیرۃ العرب اور یمن کے علاقے عربوں کے حوالے کر دئے گئے اور انہیں ایک آزاد ریاست کے طور پر قبول کر لیا گیا۔

14.3 اعلان بالفور

جنگ عظیم اول کے درمیان ہی برطانیہ نے یہودی سرمایہ داروں کا تعاون حاصل کرنے کے لئے وزیر خارجہ لارڈ آرتھر بالفور نے یہودیوں کی عالمی تحریک کے رہنما اور برطانیہ کے سب سے امیر شخص لارڈ روتھ شیلڈ کو ایک سرکاری خط لکھا جس میں کہا گیا تھا کہ:

> "مجھے ملک معظم کی حکومت کی طرف سے صہیونی تحریک کے لئے ہمدردی اور حمایت کا اعلان کرتے ہوئے خوشی محسوس ہو رہی ہے، آپ یہ جان کر خوش ہوں گے کہ ملک معظم کی حکومت فلسطین میں یہودی لوگوں کے لئے ایک قومی گھر بنانے کی تجویز کا خیر مقدم کرتی ہے اور یقین دلاتی ہے کہ وہ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کرے گی"۔

اس معاہدے کو عام طور سے اعلان بالفور کہا جاتا ہے۔ حلاں کہ عربوں کو ان معاہدوں کی بھنک 1920ء تک نہیں لگی جب تک کہ انہیں شائع نہیں کیا گیا۔ مسئلہ فلسطین کا آغاز اسی اعلان سے ہوتا ہے نیز فلسطین میں عربوں کے المیہ کی ابتداء بھی اسی سے ہوتی ہے۔ یہیں سے فلسطین پر برطانیہ اور اسرائیل کی مکاری، اور شاطرانہ چالوں کی شروعات ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں پنڈت جواہر لال نہرو نے 1937ء کے ماڈرن ریویو میں ایک جگہ لکھا تھا کہ "بالفور اعلان عربوں کے ساتھ برطانیہ کی غداری کی سب سے بڑی مثال ہے"۔ فلسطین پر برطانوی قبضہ کی حیثیت انتداب یعنی امانت کی تھی، لیگ آف نیشن نے برطانیہ کو اس وقت تک کے لئے یہ خاص حق دیا تھا کہ جب تک مقامی آبادی خود حکومت کرنے کے قابل نہ ہو جائے یہ خطہ برطانیہ کے انتداب میں رہے گا، اس کے بعد مقامی عربوں کی ایک حکومت قائم کر دی جائے گی۔ لیکن برطانیہ نے 1922ء میں لیگ آف نیشنس میں ایک قرارداد کا مسودہ پیش کیا جس کی رو سے فلسطین میں ایسا نظام قائم کرنا تھا جو یہودی قومی حکومت کے قیام میں مددگار ثابت ہو۔ اس مقصد کے تحت برطانیہ نے یہودی لیڈروں کو اہم خدمات پر معمور کیا۔ جن میں ہائی کمشنر سر رابرٹ سیموئیل، اٹارنی جنرل نارمن بینٹوچ، ناظم باز آبادکاری البرٹ ہیمسن، سینئر نائب معتمد میکس نروک وغیرہ سر فہرست ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ایسے قوانین بنائے گئے جس سے یہودیوں کی نقل مکانی کو کسی طرح کی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے اور فلسطین سے عربوں کی اکثریت ختم ہو جائے۔ ساتھ ہی ایسی پالیسیں بنائی گئیں جس سے فلسطینیوں کا آگے بڑھنا، ترقی کرنا اور حفاظت خود اختیاری کے

طریقے اپنانا ناممکن ہو گیا۔

14.4 یہودیوں کی یورپ سے فلسطین کی طرف ہجرت

انیسویں صدی کے آغاز سے ہی یورپ کے یہودیوں نے فلسطین میں سکونت اختیار کرنا شروع کر دیا تھا اور اس کے پیچھے یورپ اور برطانوی سامراجیت کا ہاتھ تھا، کیوں کہ دونوں کو اس سے فائدہ تھا ایک طرف برطانیہ اپنے سامراج کی حفاظت کرنے کے لئے یہ ضروری سمجھتا تھا کہ عرب دنیاء پر برطانوی تسلط قائم کیا جائے تا کہ اس کے ذریعہ ہندوستان کی حفاظت بھی کی جا سکے اور نہر سوئز کے ذریعہ کو اپنے تجارت کو اور وسعت دے سکے، دوسری طرف یہودیوں کی نقل مکانی سے یورپ کو ان شاطر یہودیوں سے نجات مل رہی تھی اس لئے بھیوہ اس امر خیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے، جس کی وجہ سے پہلی جنگ عظیم کے ابتدائی زمانہ میں آسٹریا، پولینڈ اور روس سے مسلسل نقل مکانی کے نتیجہ میں 1914ء تک اسّی ہزار یہودی فلسطین میں آباد ہو چکے تھے، جو کل آبادی کا دو فیصد تھا۔ 1918ء تک فلسطین میں ایک یہودی ریاست بنانے کا خواب دیکھنے والوں کی تعداد دو یا تین فیصد سے زیادہ نہیں تھی، لیکن پہلی جنگ عظیم نے سامراجی اس خواب کو پورا کرنے کا بھرپور موقع فراہم کر دیا۔ جنگ عظیم میں ترکی کی شکست کے بعد عرب علاقوں کو برطانیہ اور فرانس کے درمیان بانٹ دیا گیا اور اس سلسلہ میں فلسطین برطانیہ کے زیر تسلط آ گیا جس پر برطانیہ کا انتداب قائم ہو گیا جس کے بعد یہودیوں کو فلسطین میں آباد ہونے کی عام اجازت مل گئی تھی۔ اس سلسلہ میں یہودیوں نے بڑی بڑی رقمیں دے کر عرب کسانوں سے ان کی زمینیں خریدنا شروع کر دیں تھی۔ چنانچہ 1929ء تک 29 فیصد عرب اپنی زمینوں سے محروم ہو گئے تھے اور 1936ء تک یہودیوں کی تعداد ساڑھے چار لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ پہلے یہود صرف 55 ہزار دونم زمین کے مالک تھے جو 1936ء تک 9 لاکھ دونم زمین کے مالک ہو گئے۔ 1947ء تک برطانیہ نے ایسے ایسے قوانین پاس کئے جس کی رو سے عربوں پر ظلم وستم کا بازار گرم رہا اور یہودیوں پر نوازشیں ہوتی رہیں، عرب کاشتکاروں پر مالیہ کی شرح بڑھا دی گئی جب کہ یہودیوں کو زمینیں مفت میں ہدیہ کی گئیں۔ 1934ء تک عرب املاک پر ٹیکس کی شرح 1918ء کے مقابلہ میں 4 گناہ زیادہ ہو گئی تھی۔ عربوں کو ہتھیار رکھنے کی اجازت نہیں تھی لیکن یہودیوں کو سرکار کی طرف سے ہتھیار مہیا کئے جاتے تھے۔ ان پالیسیوں کا اثر یہ ہوا کہ 1947ء تک یہودی آبادی کا تناسب کل آبادی کے مقابلہ میں 32 فیصد تک بڑھ گیا تھا۔

14.4.1 فلسطینی عربوں کی جدوجہد

جنگ عظیم کے بعد عربوں کو آزادی دلانے کے وعدہ سے برطانیہ کا انحراف اور صہیونیت نواز پالیسیوں کے تحت یہودی قومی حکومت کے قیام کے لئے کئے جانے والے اس اقدامات سے دلبرداشتہ ہو کر فلسطینی باشندوں نے پر امن اپیلوں کا سلسلہ شروع کیا، اور 1919ء میں فلسطینی قومی کانفرنس منعقد کر کے برطانیہ کے ساتھ اپنے معاہدے کو مسترد کر دیا، اور قومی حکومت کے قیام کا مطالبہ کیا۔ اس کے بعد 1920ء سے پر تشدد مظاہرے شروع ہو گئے، جس کے لئے یہودی خود ذمہ دار تھے، کیونکہ انہوں نے فلسطینی باشندوں کو ایک مذہبی تقریب منانے سے روک دیا تھا جو اس تاریخ کو ہر سال منائی جاتی تھی۔ اس ہنگامے میں 9 یہودی اور 4 فلسطینی مارے گئے جبکہ 1921ء میں

ہونے والے تشدد کے واقعات میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد میں مزید اضافہ ہوگیا تھا۔ جس کے لئے تحقیقاتی کمیشن بیٹھایا گیا اور اس نے یہ رپورٹ دی کہ آزادی کے لئے دئے گئے تیقنات پر عدم عمل آوری کے باعث عربوں میں مایوسی اور ناراضگی کے جذبات پیدا ہوگئے ہیں۔ اس دوران برطانیہ یہودی قومی حکومت کے قیام کو عملی شکل دینے میں لگی ہوئی تھی جس کے تحت 1922ء میں مجلس اقوام نے برطانیہ کی خواہش پر اور امریکہ کی تائید سے یہودی ریاست کے قیام کی تجویز کو منظوری دے دی۔

دوسری طرف فلسطینی باشندے برطانیہ کی مجلس قانون ساز کا بائیکاٹ کرتے ہوئے 1929ء میں احتجاجی مظاہرہ کرنے کے لئے بڑے پیانے پر یروشلم میں جمع ہوئے، اس مظاہرے کا اثر دیگر شہروں میں بھی ہوا اور ملک کے مختلف حصوں میں پر تشدد ٹکراؤ ہونے لگا جس کے نتیجہ میں 200 سے زائد لوگوں کی جانیں گئیں اور 500 سے زائد لوگ زخمی ہوئے۔ کمیشن کی رپورٹ میں کہا گیا کہ فلسطینی عربوں میں حق خود اختیاری نہ ملنے کے باعث مایوسی کے جذبات ابھر رہے ہیں۔ موجودہ کشیدگی اسی کے نتیجہ میں وجود میں آئی ہے۔

14.4.2 تقسیم فلسطین

اسی دوران برطانیہ نے رائل کمیشن قائم کیا جس کے ذریعہ فلسطین کی تقسیم کی سفارشات پیش کی گئی۔ اس کمیشن کا سربراہ لارڈ رابرٹ پیل تھا۔ کمیشن نے تسلیم کیا کہ فلسطینی عوام کی آزادی کا جائز مطالبہ قبول کیا جائے اور یہ بات بھی کہی کہ مسلسل جاری رہنے تشدد کے باعث برطانیہ دونوں فریقوں کی کواہشات کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اس لئے اس کمیشن نے یہ سفارش کی کہ فلسطین کی تقسیم عمل میں لائی جائے کیونکہ عرب فلسطین میں یہودی حکومت کے قیام کو قطعی برداشت نہیں کریں گے، نیز عربوں کی تحریک صرف صیہونی نظریات کے خلاف نہیں ہے بلکہ یہ برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت ہے اس لئے فلسطین کی تقسیم ہی امن کی ضمانت دے سکتی ہے۔ جولائی 1937ء میں حکومت برطانیہ نے کمیشن کی رہورٹ کو قرطاس ابیض جاری کرکے قبول کرلیا۔ لیکن فلسطینیوں نے اسے رد کرتے ہوئے مکمل آزادی کا مطالبہ جاری رکھا۔ بلکہ ان کی جدجہد آزادی میں شدت پیدا ہوگئی۔ جو 1939ء تک جاری رہی، اس کے بعد عرب پر امتناع عائد کرتے ہوئے ایک ٹیکنیکل کمیٹی قائم کی گئی تاکہ فلسطین کی تقسیم پر عمل آوری کے امکانات کا جائزہ لیا جاسکے۔

اس مسئلہ کے حل کے لئے برطانیہ نے 1939ء میں لندن میں گول میز کانفرنس منعقد کی جس میں فلسطین، یہودی اور عرب حکومتوں کے نمائندوں کو مدعو کیا گیا۔ تقسیم فلسطین اور یہودی حکومت کے قیام پر مزاکرات بھرپور انداز میں ہوئے لیکن فلسطینی وفد نے برطانیہ کی پالیسی کی مذمت کرتے ہوئے اعلامیہ کی تنخیس اور یہودی آبادکاری پر پابندی کے ساتھ فلسطین کی مکمل آزادی کا پرزور مطالبہ کیا تھا۔ عربوں کے اس جارحانہ انداز نے برطانیہ کو یہ باور کرادیا تھا کہ فلسطین کی تقسیم اور اسرائیل کا قیام تاریخ انسانی کا سب سے المناک واقعہ ہوگا۔ چنانچہ مئی 1939ء میں برطانیہ کی طرف سے ایک قرطاس جاری کیا گیا جو میکڈونالڈ قرطاس کہلایا۔ اس میں برطانیہ نے ایک طرفہ پالیسی کا اعلان کرتے ہوئے یہودی حکومت کے قیام اور اور فلسطین کو ایک عرم ملک کی حیثیت سے آزادی دینے دونوں سے انکار کرتے ہوئے 1949ء تک اس وقت کی طرز حکومت کو جاری رکھنے کی بات کہی۔ نیز اس اعلان میں یہ بھی شامل تھا کہ برطانیہ دوٹوک انداز میں یہ اعلان کرتی ہے کہ فلسطین کو یہودی ریاست بنانا اسکی پالیسی نہیں ہے۔ حکومت برطانیہ کا مطمح نظر آئندہ دس سالوں میں ایک آزاد فلسطینی

ریاست قائم کرنا ہے، جس میں عرب اور یہودی اس طرح سے شریک ہوں گے کہ دونوں کے ضروری مفاد محفوظ ہوں گے۔ برطانیہ کا یہ بدلہ ہوا رویہ دراصل جنگ عظیم دوم کی ابتداء اور اس میں اس کے کردار کو بہتر بنانے کی وجہ سے پیدا ہوا تھا، جو یہودیوں کو پسند نہ آیا اور اب یہودیوں نے برطانیہ کی جگہ امریکہ کو اپنا سرپرست بنانا شروع کر دیا تھا کیونکہ امریکہ ایک مضبوط طاقت کے طور پر ابھر رہا تھا اور اسے بھی اپنی سرمایہ دارانہ پالیسی کو بہتر بنانے اور مشرق وسطیٰ میں اپنا دبدبا قائم رکھنے کے لئے ایک فریق کی ضرورت تھی جو اسرائیل کی شکل میں اسے دیکھائی دے رہا تھا لہٰذا دونوں اپنے اپنے مفاد کی وجہ سے ایک دوسرے کے قریبی بن گئے تھے۔ اسی مناسبت سے امریکی صدر ہیری ٹرومن نے برطانوی وزیر اعظم کو لکھے گئے ایک خط میں اس بات پر زور دیا کہ فلسطین میں مزید ایک لاکھ یہودیوں کے داخلہ کی راہ ہموار کی جائے اور اس مسئلہ کے حل کے لئے برطانوی-امریکہ مشترکہ کمیٹی تشکیل دی جائے۔ چنانچہ برطانیہ نے ایک کمیٹی تشکیل دی جس نے 1939ء کے قرطاس کو کلعدم قرار دے کر یہ سفارش کی کہ فلسطین میں یہودیوں کو فری زمینیں دی جائیں نیز ان کے دخول کے عمل کو جاری رکھا جائے، امریکہ کی طرف سے فوراً اس سفارش کو قبول کر لیا گیا۔

برطانیہ پر دوسری جنگ عظیم چھڑ جانے کی وجہ سے دباؤ تھا اس لئے اس نے دوبارہ لندن کانفرنس منعقد کی جس میں عرب نمائندے، فلسطینی اور یہودی لیڈران کو مدعو کیا گیا تھا کیوں کہ فلسطینیوں کے خلاف دہشت انگیز کاروائیوں میں اضافہ ہو گیا تھا، نیز یہودیوں نے برطانوی افواج سے لڑنے کی بھی جرائت پیدا کر لی تھی۔ برطانیہ کو اس بات سے اندازہ ہو گیا تھا کہ فلسطین میں امن کا قیام مشکل ہے اس صورت میں تقسیم ہی کوئی جواز فراہم کر سکتی تھی لیکن دونوں لندن کانفرنس میں اس کا کوئی انجام نہیں نکلا۔ اس لئے یہ لازمی ہو گیا یہ مسئلہ اب اقوام متحدہ کے سپرد کر دیا جائے جہاں تمام ممالک کی رائے سے اس کا کوئی حل نکالا جائے۔ اقوام متحدہ امریکہ اور یہودیوں کے ذریعہ وجود میں لائی گئی ایک مجلس تھی، جس کے پہلے اجلاس اپریل 1947ء میں فلسطین کے مسئلہ کا حل پیش کرنے کے لئے ایک علٰحدہ کمیٹی تشکیل دی گئی جس کے ذریعہ فلسطین سے متعلق تمام پہلوؤں کا جائزہ لیا جائے پھر ایسی تجویز پیش کی جائے جو اس مسئلہ کے حل میں مددگار ثابت ہوں۔ اس خصوصی کمیٹی نے 86 نشستیں اور 16 اجلاس منعقد کئے، فلسطین کا دورہ کیا اور عرب کے اعلیٰ کمان اور صہیونی ایجنسیوں سے ملاقاتیں کیں اور اگست 1947ء تک اپنی مکمل تفصیلی رپورٹ پیش کی۔ جس میں برطانیہ کو دئے گئے اختیارات سلب کرنے کی سفارش کے ساتھ ساتھ فلسطین کے متعلق دو طرح کا پلان پیش کیا۔

1. پہلا پلان اکثریتی پلان تھا جس کے مطابق، فلسطین کو دو ریاستوں میں تقسیم کرنے کی تجویز تھی، جس میں مالی معاملات کو چھوڑ کر دیگر تمام امور میں دونوں قومیں ایک دوسرے سے آزاد رہیں گی، جس کی تائید کنیڈا، زیکوسلوواکیہ، ہالینڈ، گواٹیمالا، سویڈن، پیرو اور یوراگوے نے کی تھی۔
2. دوسرا اقلیتی پلان تھا، اس میں آزاد متحدہ فلسطینی ریاست کے قیام کی سفارش تھی، جس کا صدر مقام یروشلم ہوتا، اس پلان کی حمایت ایران، ہندوستان اور یوگوسلاویہ نے کی تھی۔

25 نومبر 1947ء کو اقوام متحدہ کے اجلاس میں خصوصی کمیٹی کی پچھلی رپورٹ کو منظور کر لیا گیا، جس کی تائید میں 25 اور مخالفت

میں 13 ممبران ملک نے ووٹ دئے جبکہ 17 غیر حاضر رہے۔ بحث کے دوران اقوام متحدہ کے کردار کو بھی چیلنج کیا گیا اور بلآخر 29 نومبر 1847ء کو جنرل اسمبلی نے قراداد نمبر 11/ 18 کے تحت فلسطین کی تقسیم کے پلان کو منظور کرلیا۔ اس قرارداد کی 30 ممبران ملک نے تائید کی، 17 نے مخالفت جبکہ 9 ملک غیر حاضر رہے۔ اس قرارداد کے تحت فلسطین کو آٹھ حصوں میں تقسیم کرکے تین تین حصے دونوں فریقین کو دئے گئے عربوں کی تحویل میں ایک حصہ مزید دیا گیا اور یروشلم کو جو کہ آٹھواں حصہ تھا اسے دس سال تک بین الاقوامی کنٹرول میں رکھنے کے بعد اقوام متحدہ کے ذریعہ وہاں کے باشندوں سے بات چیت کرکے اس کا فیصلہ کرنا طے ہوا تھا۔ اقوام متحدہ کے منصوبے کے مطابق یہودی ریاست کو کل رقبہ کا 56 فیصد ملنا طے ہوا۔ عربوں کو 43 فیصد زمین ملنی طے ہوئی۔ اس طرح یہودیوں کو 14100 مربع کلومیٹر اور عربوں کو 11000 مربع کلومیٹر زمین دی گئی تھی۔ آبادی کے لحٰذ سے تجویز کی گئی یہودی ریاست میں 509780 عرب باشندے اور 499020 یہودی آباد تھے، جبکہ عرب ریاست میں 749000 عرب اور 90 ہزار یہودی آباد تھے۔ یروشلم شہر میں 105540 عرب اور 99000 ہزار یہودی سکونت پذیر تھے۔

14.4.3 قیام اسرائیل میں امریکہ اور اقوام متحدہ کا کردار

جس طرح برطانیہ نے یہودیت وصہیونیت کی سرپرستی لیگ آف نیشنز کے قیام کے ذریعہ کی تھی، اسی طرح امریکہ نے اقوام متحدہ کے ذریعہ قیام اسرائیل کا فرض نبھایا، دراصل اقوام متحدہ کے قیام کے پیچھے بھی صہیونی فکر کارفرما تھی، جس طرح جنگ عظیم دوم سے پہلے لیگ آف نیشنز کے بارے میں یہ بات کہی گئی تھی کہ یہ تنظیم جنگوں کو روکنے کے لئے قائم کی گئی ہے لیکن جنگ عظیم دوم نے اس حقیقت سے پردہ اٹھادیا۔ اسی طرح دوسری جنگ عظیم کے بعد برطانیہ اور امریکہ کے ذریعہ صہیونیت نے اقوام متحدہ کو قائم کیا۔ تاکہ لیگ آف نیشنز کے ادھورے کام کو پورا کیا جاسکے، یعنی فلسطین میں قیام اسرائیل۔ لیگ آف نیشنز نے فلسطین کے خطہ کو برطانوی انتداب میں دیا تھا، جس کے مطابق ایک مقررہ مدت گذر جانے کے بعد، برطانیہ کو یہ علاقہ اہل فلسطین کو واپس کرنا تھا۔ لیکن برطانیہ امریکہ کے ساتھ مل کر تقسیم فلسطین کے منصوبوں پر غور کرنے لگا، عربوں، یہودیوں اور کے ساتھ بات چیت کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا، منصوبہ تقسیم پر عمل پیرا ہونے میں تاخیر کے سبب یہودیوں نے برطانوی فوج کو ہی نشانہ بنانا شروع کردیا۔ مصر کے برطانوہ وزیر ریاست لارڈ مونی کا قتل تک کردیا گیا، برطانوی دفاتر پر حملے کئے گئے اہم تریک عسکری محکموں کے کاغذات بموں سے اڑا دئے گئے۔ چنانچہ برطانیہ صہیونیت کی ان تشدد آمیز کاروائیوں سے مجبور ہو کر اور امریکہ کے دباؤ میں آکر مسئلہ فلسطین کو اقوام متحدہ کے سپرد کردیا جو صہیونیت اور امریکہ کے مشترکہ مفادات کی محافظ تھی۔ لہٰذا اقوام متحدہ نے فوری طور پر نومبر 1947ء میں فلسطین کو دو ریاستوں میں رقسیم کرنے کی قرارداد 181 منظور کردی، اعلان بیلفور کے وقت فلسطین میں یہودی آبادی صرف 55 ہزار تھی جو کہ فلسطینی آبادی کا 8 فیصد تھی جبکہ برطانوی انتداب کے تحت یہودی آباد کاری کے نتیجہ میں 1948ء تک یہ تعداد چھ لاکھ سے تجاوز کرگئی تھی جو کہ عربوں کے مقابلہ میں 31 فیصد تھی۔ اقتصادی، سیاسی، تعلیمی اور عسکری اداروں کو انہوں نے خوب مضبوط کرلیا تھا 70 ہزار نفوس پر مشتمل بہترین فوج منظم کرچکے تھے۔

14.5 قیام اسرائیل

اقوام متحدہ کے ذریعہ لئے گئے اس فیصلہ کا عرب اعلیٰ کمان نے ماننے سے انکار کر دیا اور متحدہ آزاد فلسطین کا مطالبہ کرتے رہے۔ اس صورت میں یہودیوں نے صہیونیت کے زیر اثر تنظیموں کے استعمال سے ملک کے مختلف حصوں میں قاتلانہ حملہ کروائے نیز اقوام متحدہ کی طرف سے دی گئی زمینوں کے علاوہ عربوں کی زمین پر بھی قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ اس نازک حالات میں برطانیہ اپنی ذمہ داریوں سے پہلو تہی کرنے لگا نیز اقوام متحدہ بھی کوئی موثر کردار ادا کرنے سے قاصر رہا۔ یہودیوں نے پر امن عربوں کے خلاف جنگ چھیڑ دی، اور غاصبانہ طور پر انکی جائدادوں پر قبضہ کر کے انہیں ہجرت پر مجبور کر دیا۔ یہودی قاتلانہ حملوں کی ابتداء دسمبر 1947ء میں قزازانامی گاؤں سے ہوئی، پھر سلامہ، بیار عدس اور قستل وغیرہ زد میں آئے۔ 1948ء میں برطانیہ نے فلسطین کی زمین سے اپنی فوجیں ہٹالیں تاکہ یہود کو اپنی من مانی کرنے میں کسی طرح کی روکاوٹ کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ انہوں نے قتل و غارت گری کے سلسلہ کو آگے بڑھاتے ہوئے جافا اور ایکرے پر قبضہ کیا پھر، اپریل 1948ء کو دیر یٰسین پر شب خوں مارا اور 154 باشندوں کو قتل کر دیا۔ پھر یروشلم اور مغربی الخلیلی کے ساتھ ساتھ تل ابیب کے درمیانی علاقوں پر کنٹرول حاصل کر لیا۔ ان قاتلانہ حملوں کی وجہ سے 4لاکھ فلسطینی ہجرت پر مجبور ہوئے۔ دوسری طرف امریکی صدر ٹرومین نے صہیونی لیڈر وازمین سے ملاقات کی جس میں ریاست اسرائیل کے قیام کے اعلان پر سمجھوتہ ہو گیا اور مئی 1948ء کو برطانیہ نے بھی اپنی رضامندی کا اعلان کر دیا اس طرح اسرائیلی ریاست وجود میں آگئی۔

دراصل ریاست اسرائیل کے قیام کے لئے ہی یہودیوں نے یہ قاتلانہ حملے کئے تھے تاکہ عرب باشندے ملک سے ہجرت کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ مئی 1948ء تک ملک سے 50 فیصد تک فلسطینی باشندے ملک چھوڑ کر جا چکے تھے۔ اسرائیل کے پہلے وزیر اعظم ڈاوڈ بین گورین نے اس بات کا اقرار کیا ہے کہ، صہیونی تنظیموں نے طبریس، جافا اور صفاد کو عربوں سے چھین لیا تھا تاکہ ریاست اسرائیل کے قیام کے اعلان کے وقت وہاں عرب موجود نہ رہیں۔ لہٰذا بین گورین نے 15 مئی 1948ء کو برطانوی فوج کے ملک سے نکلتے ہی ریاست اسرائیل کے قیام کا علان کر دیا۔ اس طرح یہودی دنیاء کو برطانیہ اور امریکہ کی سرپرستی کے باعث فلسطین کی ارض مقدس میں اپنی ریاست قائم کرنے کا موقع فراہم ہو گیا اور وہ اس بڑے رقبہ پر قابض ہو گئے۔

اسرائیلی ریاست کے قیام کے بعد سے، عالمی صہیونی تنظیم نے زیادہ تر یہود کی نقل مکانی میں امداد اور حوصلہ افزائی کرتی تنظیم کے طور پر کام کیا۔ اس نے اسرائیلی ریاست کے لیے دیگر ممالک میں سیاسی حمایت مہیا کی لیکن اسرائیلی داخلی سیاست میں کم کردار ادا کیا۔ 1948ء کے بعد سے اس تحریک کی بڑی کامیابی نقل مکانی کرتے یہود کے لیے رسدی اعانت مہیا کرنا تھی اور اس بھی زیادہ اہم، روسی یہود کی ریاستہائے متحدہ سوویت کو چھوڑنے کے حق میں حکام سے جدوجہد، اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی اور 8,50,000 بیدخل عربی یہود کی عرب سے اسرائیل نقل مکانی میں تعاون تھا۔ 45-1944ء میں ڈیوڈ بن گوریان نے غیر ملکی حکام کے سامنے منصوبہ ایک ملین کا پلان کو صہیونی تحریک کا اولین ہدف اور اعلی ترین ترجیح قرار دیا۔ 1948 کی برطانوی تحقیقاتی رپورٹ کی پابندیوں کا مطلب یہ تھا کہ ایسے کسی منصوبہ پر بڑے پیمانے پر عمل در آمد نہیں ہو سکتا جب تک مئی 1948 کے اسرائیلی خود مختاری کا اعلان نہ

کر دیا جائے۔ نئے ملک کی نقل مکانی کی پالیسی کو خود اپنی حکومت ہی میں مخالفت کا سامنا بھی تھا، جیسے کچھ کا خیال تھا کہ ایسے یہود جن کی زندگیوں کو کوئی خطرہ نہیں ان کے لیے اس قدر بڑے پیمانے پر نقل مکانی کا انتظام کرنے کا کوئی معقول جواز نہیں، خاص کر جب انھیں خود اس کی طلب اور رغبت نہیں ہے، ساتھ ہی ساتھ یہ کہ ان کے لیے غیر ضروری مشکلات کا حامل ہے۔ بہر کیف داوید بن گوریون کے اثر و رسوخ اور اصرار نے نقل مکانی کی پالیسی کو عملی جامہ پہنانا یقینی بنایا۔

14.6 1948ء کی جنگ

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ برطانیہ، امریکہ اور اقوام متحدہ کے ذریعہ اسرائیل کا قیام عمل میں آ ہی گیا، تو سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ جب اقوام متحدہ نے اسرائیل کے لئے صرف 55 فیصد علاقہ منظور کیا تھا تو پھر یہود بڑھتے بڑھتے 90 فیصد فلسطین پر کیسے قابض ہو گئے۔ اور فلسطینیوں کو جو حصہ ملا تھا اس پر قبضہ کیوں نہیں کیا گیا۔ اور آگے یہ بات بھی ہے کہ کیونکر عربوں نے اقوام متحدہ کے اس فیصلہ کو قبول کر لیا؟۔

بہر حال 1947ء سے ہی یہودیوں کی طرف سے فلسطینی باشندوں پر بدترین مظالم کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ امریکہ، برطانیہ اور روس نے اسرائیل کو اسلحہ فراہم کیا تھا، لیکن عرب لیگ نے فلسطینی عوام کی خواہش کے باوجود بھی اسلحہ فراہم نہیں کیا اور خود اسرائیل سے جنگ کرنے کے لئے 1948ء میں قیام اسرائیل کے بعد کود پڑے۔ ان کا ماننا تھا کہ ایسا کرنے سے وہ اسرائیل کو شکست دے کر فلسطین پر قبضہ کر لیں گے اور عرب مملکت میں اسے شامل کر لیا جائے گا۔ لیکن مستقبل کے حالات نے یہ ثابت کر دیا کہ عرب لیگ کی فلسطینی سرزمین پر مداخلت صرف اور صرف اقوام متحدہ کی قرارداد کو قانونی جواز فراہم کرنے اور بقیہ ماندہ فلسطین پر برطانیہ کے بجائے عرب حکومت قائم کرنے کی تھی۔ عرب لیگ میں شامل پانچوں ملکوں جن میں شام، لبنان، عراق، اردن اور مصر وغیرہ شامل ہیں نے ایک ساتھ اسرائیل پر حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا، مگر ان حملوں سے خواطر خواہ فائدہ نہیں مل سکتا تھا جس کہ ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ اس لیگ میں شامل تمام ممالک کے برطانیہ سے چھے تعلقات تھے اور کسی نہ کسی طرح وہ برطانیہ کے زیر اثر تھے۔ خاص کر اردن کا فوجی کمانڈر ایک برطانوی شہری تھا، نیز اردن اور برطانیہ کے درمیان کئی معاہدات ہوئے۔ ان سب کے بعد جب عرب لیگ کی فوجیں فلسطینی مجاہدین اور اخوان المسلمون کے جانبازوں کے ساتھ فلسطین میں ڈاخل ہوئیں تو ابتداء میں اسرائیل کی فوج کو منھ کی کھانی پڑی لیکن اور قریب تھا کہ اسرائیل کو شکست سے دوچار ہونا پڑتا، لیکن عین موقع پر اقوام متحدہ کی امن کونسل نے اپنے عام معمول کے مطابق اسرائیل کی جان بچانے کے لئے جنگ بندی کی پیش کش کر دی۔ جسے عرب لیگ نے فلسطینی مجاہدین اور اخوان المسلمون کی مرضی کے خلاف جا کر پیش کش قبول کر لی۔ جس بعد چار ہفتوں کے لئے جنگ بند ہو گئی۔ یہ عرب لیگ کی سب سے بڑی غلطی تھی کہ انہوں نے اسرائیل کو اپنی تیاری کو بہتر کرنے اور از سر نو جنگی حکمت عملی کو اختیار کرنے کا موقع فراہم کر دیا۔ اسرائیل نے اس درمیان اسلحوں اور فوجہ مدد سے اپنی پوزیشن بہتر بنالی اور جب دوبارہ جنگ شروع ہوئی تو عربوں کو ہر جگہ ہزیمت اٹھانی پڑی اور نتیجتا انہیں جنگ بندی اور صلح کے لئے راضی ہونا پڑا۔ اس شکل میں انہوں نے یہودیوں کو فلسطین کی 55 فیصد کے بجائے 75 فیصد اراضی اسرائیلی ریاست کو سونپ دی۔

14.6.1 اقوام متحدہ میں اسرائیل کی شمولیت

اقوام متحدہ کی جنگ بندی کی مصالحانہ کوششوں کے بعد دسمبر 1948ء میں حکومت اسرائیل نے مجلس اقوام متحدہ کی رکنیت کی درخواست داخل کی لیکن اس کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا گیا تھا کہ وہ مجلس کے منشور کی شرائط پر پورا نہیں اترتی، لیکن مئی 1949ء کو جب اسرائیل نے دوسری بار درخواست پیش کی اور اس مرتبہ جنرل اسمبلی نے اسے قبول کر لیا۔

14.7 فلسطینی مزاحمت اور تنظیمیں

تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ بات وضح ہو جاتی ہے کہ ارض فلسطین ہمیشہ سے قوموں کی ہوس اور ملک گیری کا شکار رہی ہے۔ یہاں کے باشندے ہزاروں سال سے ظلم و ستم جھیلتے آرہے ہیں۔اس ارض مقدس کا محل وقوع ہی اس کی ذات کے لئے باعث عذاب رہا ہے۔ بیرونی حکمرانوں نے اس ملک پر تاریخ کے ہر دور میں ناجائز حملے کئے اور قبضہ جمائے ہیں اس کے باوجود فلسطینیوں نے اپنی جداگانہ عرب قومیت اور مخصوص تشخص کو برقرار رکھا۔انیسویں صدی میں جب یورپ میں یہودیوں کے لئے زمین تنگ پڑنے لگی اور سارے یورپ سے انہیں مار بھگایا جارہا تھا اس وقت صرف مسلمان ہی وہ قوم تھی جنہون نے ان یہودیوں کو اپنے ملک میں پناہ دی اور خاص کر فلسطینیوں نے اپنی اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انسانی مساوات، بقائے باہم اور مذہبی رواداری کی اعلیٰ مثالیں قائم کیں۔ انہیں اس وقت ایک وقفہ کے لئے بھی یہ خیال نہیں آیا کہ یہودیوں کو پناہ دینے کے بدلے میں انہیں خود ملک بدر ہونا پڑیگا۔جب برطا فلسطین میں یہودی مملکت کے قیام کی تیاری کر رہا تھا اس وقت بھی فلسطینی اپنی آزادی کا مطالبہ کر رہے تھے۔انہوں نے کبھی نہ یہودی مخالفت کی بات کی نہ ہی صہیونیت کی، بلکہ 1948ء کے قیام حکومت کے بعد بھی یہودی دشمنی کا اظہار نہیں کیا۔ لیکن صلح و آشتی کی یہ راہ کب تک دسرے کے ہاتھ بڑھنے کا انتظار کرتی لہٰذا اپنی وجود کو برقرار رکھنے اور اپنی حفاظت کرنے کے لئے یہودیوں سے جنگ کرنے پر مجبور کئے گئے، جس کے نتیجہ میں ملک میں متعدد تنظیمیں قائم ہوئیں اور جدوجہد آزادی کی تحریک شروع ہوئی۔

اس میں سب سے پہلی تحریک "تحریک جہاد" (الحرکۃ الجہاد) ہے جو 1929ء میں شیخ عزیز الدین القسام کی رہنمائی میں منظر عام پر آئی۔ عزیز الدین القسام 1883ء میں لاذقیہ میں پیدا ہوئے اور 1906ء میں جامعہ الازہر سے فراغت حاصل کی اور پھر تعلیم و تربیت، امامت وخطابت اور اصلاح و دعوت کے فریضہ سے منسلک رہے، ملک شام میں فرانسیسی استعمار کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والوں میں سرفہرست تھے۔ فرانس نے اس انقلاب کو ختم کرنے اور اس کے رہنماؤں کو گرفتار کرنے کی مہم شروع کی جس سے بچ کر آپ نے فلسطین کے شہر حیفا میں سکونت اختیار کی اور ساتھ ہی عسکری ٹریننگ کی بنیاد رکھی، چونکہ یہاں بھی برطانوی استعماریت حاوی تھی اس لئے ان کے خلاف بھی علم بغاوت بلند کئے رکھا۔ آپ نے اپنی جماعت کو بہتر اور منظم انداز سے چلانے کے لئے متعدد شعبہ جات میں تقسیم کر رکھا تھا جن میں شعبہ شراء الاسلحہ، التدریب العسکری، شعبہ الدعوۃ، شعبہ الاستخبارات، شعبہ الع؛اقات الخارجیۃ، الاتصالات السیاسیہ وغیرہ اہم ہیں۔ شیخ کی شہادت 1935ء کی عظیم بغاوت میں ہوئی جس کے بعد شیخ فرحان سعدی نے قیادت سنبھال لی۔ اور 1936ء میں تاریخ فلسطین کا سب سے بڑا

انقلاب رونما کر دیا۔

اسی سلسلہ کی اگلی کڑی "تنظیم مقدس جہاد"(منظمۃ الجہاد المقدسہ) تھی جو عبد القادر الحسینی کی سربراہی میں وجود میں آئی، عبد القادر نے 1931ء میں عسکری تنظیم کا خاکہ بنا کر نوجوانوں کو مسلح کرنے کی کوشش کا آغاز کیا، ساتھ آپ کی بڑی کامیابی یہ بھی رہی کہ اس دوران فلسطین میں جتنی بھی چھوٹی چھوٹی آزادی کی تنظیمیں قائم ہوئیں ان سب کو ایک متحدہ پلیٹ فارم پر جمع کر کے "منظمۃ جیش الجہاد المقدس" کے نام سے 1937ء میں عظیم انقلاب کے بعد 1939ء تک آزادی ملک کی کاروائیاں چلتی رہیں، یہاں تک کہ 1948ء میں معرکہ قسطل میں عبد القادر الحسینی کی شہادت کا واقعہ پیش آیا اور یہ تنظیم دیگر اداروں میں تقسیم ہو کر ضم ہو گئی۔

فلسطینی مزاحمت اور اس میں جدت کی تاریخ مزید وسعت اس وقت اختیار کر لیتی ہے جب 1948ء میں ارض مقدس کے ایک حصہ پر اسرائیلی حکومت کا قیام عمل میں آجاتا ہے، جس کی وجہ سے پورا فلسطین غم و غصہ کی آماجگاہ بن جاتا ہے اور مزاحمت و مقاومت کا باضابطہ منظم و مسلح انداز میں آغاز ہوتا ہے جس میں عرب کے متعدد ممالک مصر، شام، لبنان، اردن اور عراق وغیرہ شامل تھے۔ یہ مزاحمت عرب اسرائیل جنگ سے تعبیر کی جاتی ہے، اس طرح کی کئی جنگیں عرب اسرائیل کے نام سے لڑی گئی جس کہ ایک علٰحیدہ اکائی میں لکھی جائے گی اس لئے یہاں اس کی تفصیل سے گریز کرتے ہوئے بس یہ اشارے کر دئے جا رہے ہیں کہ 1948ء، 1956ء، 1967ء، اور 1973ء میں عرب اسرائیل کے مابین جنگیں لڑی گئیں جو مزاحمت فلسطین اور آزادی فلسطین کا جز قرار دی جاتی ہیں، لیکن حقیقت حال اس کے برعکس ہے۔ شیخ مصطفی الطحان اپنی کتاب القدس والتحدی الحضاری میں لکھتے ہیں:

"اکثر عربی حکومتیں جن کے قائدین نے جنگ کی تجویز منظور کی تھی کسی نہ کسی صورت میں برطانیہ کے تابع تھیں، اردن کے لشکر کا قائد جنرل غلوب تھا، دیگر فوجی افسران بھی برطانوی تھے اور اردن کے تمام فوجی اڈے بھی برطانیہ کے زیر تسلط ہی تھے، یہاں فوج پر قابض تمام طاقتیں برطانیہ کے منصوبوں کے ساتھ ہم آہنگ تھیں جس کا اصل مقصد فلسطین کی تقسیم تھا۔ ایسے حالات میں بھلا کہاں فلسطین کے لئے کامیابی ممکن تھی"۔

لیکن فلسطینی اپنی مزاحمت کے لئے خود بھی کمربستہ تھے انہوں نے اپنے ہمسایہ ملکوں سے زیادہ امیدیں وابسطہ نہیں تھیں کیوں کہ وہ شروع سے ہی اس قضیہ کو اور اس سے متعلق عوامل کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ چنانچہ 1956ء کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد فلسطین میں نوجوانوں کی ایک تنظیم (تنظیم آزادی فلسطین) "حرکۃ التحریک الفلسطینی"، یعنی "الفتح" قائم ہوئی جسے انگریزی میں PLO بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے بانیان میں سلیم زعنون، ابو جاد خلیل الوزیر، یاسر عرفات، اور صلاح خلف جیسے غیور نوجوان شامل تھے۔ یہ تحریک 1959ء میں قائم ہوئی تھی جب آزادانہ طور پر برطانیہ اور اقوام متحدہ کی فوجوں کی موجودگی میں کام کرنا آسان نہیں تھا، اس لئے نوجوانوں کو اس تحریک سے جوڑنا اور ان کی مناسب تربیت کرنا الفتح کی اولین ترجیحات تھیں۔ فلسطینیوں کی ذہنی تربیت اور انہیں مسلح جد وجہد کی تیاری کو بامقصد بنانے کے لئے پندرہ روزہ رسالہ فلسطنیونہ شائع کیا جانے لگا۔ اس تحریک کو عوام میں دو دو جوہاج سے بہت مقبولیت حاصل ہوئی ایک تو یہ کہ 1960ء میں مصر اور متحدہ عرب جنہوریہ کا وفاق ٹوٹ گیا، دوسرا الجیریا نے اپنی قربانیوں کے بدلے فارنس سے آزادی حاصل

کرلی۔ اس نسبت سے الفتح کا مسلح جی وجہد کا نصب العین مقبول ہو گیا اور فلسطینی اس میں جوق در جوق شامل ہوتے گئے۔

الفتح کی مثبت سوچ کو مضبوط کرنے میں اقوام متحدہ کی مسئلہ فلسطین حل کرنے میں ناکامی اور اقوام عالم کی سرد مہری کا فی مؤثر ثابت ہوئی۔ نیز 1969ء میں اس کی قیادت یاسر عرفات کے سپرد کی گئی جو سنگ میل ثابت ہوئی، یاسر عرفات نے اس کے انداز فکر میں خاص تبدیلیاں پیدا کردیں، ساتھ ہی سیاسی اور فوجی میدان میں بھی ان تبدیلیوں کا خاصہ اثر پڑا۔ ان تنظیم میں طبقاتی نمائندگی میں کافی وسعت آئی مدافعتی گروپ اور ٹریڈ کے نمائندوں کو بھی شامل کیا گیا جس سے اس تنظیم کی اہمیت ایک ادارہ کی ہوگئی اور اس نے جمہوری طرز حکومت، اور سیکولرزم کو اساس مملکت کے طور پر پیش کیا جبکہ فلسطینیوں کو متحد کرنے اور آزادی کے حصول کو اپنا نصب العین قرار دیا۔ اور اس کو متعدد اکائیوں میں منقسم کردیا گیا جیسے: فلسطینی قومی مجلس، مرکزی مجلس، مجلس عامہ، قومی خزانہ، اور فلسطینی لبریشن آرمی وغیرہ اہم ادارے تھے۔ اسی طرح اس تنظیم کے مختلف محکمہ جات تھے جن میں، سیاسی محکمہ، محکمہ تنظیم عوام، محکمہ صحت، محکمہ تعلیمات اور محکمہ اطلاعات و تمدن شامل ہیں۔ اس تنظیم میں بہت سے نشیب و فراز آئے اور بالآخر یہ تحریک رفتہ رفتہ سیاست کی بھینٹ چڑھ گئی اور جمہوری موقف اپنا کر گویا اپنے مقصد سے دست بردار ہوگئی۔

مزاحمت فلسطین اور فلسطین کی آزادی کے نام پر تو بہت سی تنظیمیں اور جماعتیں قائم ہوئیں جن میں احمد الشقری کی "منظمۃ التحریر الفلسطینیہ"، صلاح خلف کی "جبہۃ الکفاح المسلح الثوریۃ"، عادل عبد الکریم کی "العاصفہ"، ہایل عبد الحمید کی "عرب فلسطین"، ہانی الحسن کی "شباب الاقصیٰ"، زکریا عبد الرحیم کی "المنظمۃ الفلسطینۃ الثوریۃ" اور محمود عباس کی "ابناء فلسطین" وغیرہ مشہور اور اہمیت کی حامل ہیں، لیکن ان سب میں سب سے زیادہ مشہور اور جس نے اپنے قیام سے لیکر موجودہ دور تک فلسطین کی آزادی کا علم اٹھار کھا ہے وہ "حرکۃ المقاومۃ الاسلامیہ" ہے جس کی بنیاد مجاہد آزادی فلسطین شیخ احمد یٰسین کی سرکردگی میں 1987ء میں ڈالی گئی تھی، اور آج جس تحریک کو ہم حماس کے نام سے جانتے ہیں۔ حماس نے اپنی ناقابل شکست مزاحمت کے ذریعہ مسئلہ فلسطین کو صرف فلسطینیوں کا نہیں بلکہ پوری امت مسلمہ کا مسئلہ بنایا اور اس کی آبیاری بھی کی۔ حماس کے ایک ایک مجاہد اسلامی شعور، دینی مزاج، عربی حمیت و غیرت، دوررس نگاہ و بصیرت کے حامل ہیں۔ حماس کا مقصد قدس کی آزادی، اسرائیلی مقبوضات کی مکمل بازیابی، غلبہ حق اور باطل کی شکست، وغیرہ ہے۔ تحریک حماس کو تقریباً 37 سال ہو چکے ہیں اور یہ تحریک آج بھی اپنے آب و تاب کے ساتھ فلسطین کی آزادی کے لئے انتہائی حکمت عملی اور روح جہاد و روح اجتہاد کے ساتھ اپنی سرگرمیوں کو انجام دے رہی ہے۔

آزادی فلسطین اور مزاحمت فلسطین کی بات اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس دور کی تین اہم شخصیات کا تذکرہ نہ کیا جائے، یہ شخصیات مفتی امین حسینی، یاسر عرفات اور شیخ احمد یاسین کی ہیں۔

14.7.1 مفتی امین الحسینی

مفتی امین الحسینی 1897ء میں بیت المقدس میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اسی شہر میں حاصل کی پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے مصر کا رخ کیا اور جامع الازہر سے فارغ ہونے کے ساتھ ساتھ مصر کی فوجی میں تربیت بھی لی اور جنگ اول میں ترک فوج کے ساتھ حصہ لیا۔ یہ وہ زمانہ تھا

جب فلسطین پر صہیونی خطرات دستک دے رہے تھے۔ ترکی کی خافت ختم ہونے کے بعد فلسطین برطانیہ کے انتداب میں تھا اور یہودی صہیونی تحریک فلسطین میں اپنا مستقر بنانے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھی۔ ایسے حالات میں مسلم ممالک کو اس خطرے سے آگاہ کرنے کے لئے آپ نے 1931ء میں بیت المقدس میں مسلمانوں کی پہلی بین الاقوامی مؤتمر بلائی جس میں ہندوستان کی طرف سے علامہ اقبال اور مولانا شوکت علی نے شرکت کی۔ اسی طرح مفتی امین الحسینی نے 1936ء میں برطانوی اور اسرائیلی تشدد کے خلاف ہونے والی مزاحمت کی سربراہی بھی کی، جس کے بدلے برطانیہ نے ان پر فلسطین میں قیام پر پابندی عائد کر دی تھی۔ جنگ عظیم دوم میں انہوں نے جرمنی کا ساتھ دیا، شکست کے عوض فرانس کے ہاتھوں گرفتار کئے گئے لیکن قسمت نے ساتھ دیا اور جیل سے فرار ہو کر مصر پہنچنے میں کامیاب رہے۔ مصر میں "جیش الجہاد" نامی تحریک آزادی کی بنیاد رکھی۔ قیام اسرائیل کے بعد امین الحسینی کا موقف یہ رہا کہ اسرائیل کے خلاف عرب فوجیں جنگ میں حصہ نہ لیں بلکہ وہ فلسطینیوں کو اسلحوں سے مدد پہنچائیں اور ان کی فوجی تربیت کریں تاکہ فلسطینی خود کو آزاد کرانے کے لئے جدجہد کریں آپ کا یہ ماننا تھا کہ مسئلہ فلسطین کو ہمیشہ زندہ رکھا جائے اور اس کے لئے آپ نے قاہرہ میں 1959 /60 تک اسلامی ممالک کی متعدد کانفرنسز منعقد کیں۔ پھر جمال عبد الناصر کی سیاسی پالیسی سے دل برداشتہ ہو کر بیروت منتقل ہو گئے جہاں 1974ء میں آپ کا انتقال ہو گیا۔

14.7.2 یاسر عرفات

جب بھی دنیاء میں فلسطین، ان کی تحریک آزادی کی بات ہو گی یاسر عرفات کا نام ہمیشہ سرفہرست نظر آئے گا۔ آپ کی پیدائش بیت المقدس کے مشہور حسینی خاندان میں 1929ء میں ہوئی۔ آپ کا پورا نام محمد یاسر عبد الرؤوف قدوا الحسینی، کنیت عمار تھی۔ ابتدائی تعلیم و تربیت غزہ میں ہوئی، اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے مصر کا سفر طے کیا جہاں انجنیئرنگ کی تعلیم کے ساتھ فوجی تربیت بھی حاصل کی۔ فراغت کے بعد مصری فوج میں بطور ملازم کام کیا۔ دوران تعلیم ہی فلسطین کی آزادی کے لئے مصر میں اور عالم اسلام میں پائے جانے والے فلسطینی طلباء کی ایک جماعت "فلسطینی گریجویٹ اسوسی ایشن" کی بنیاد رکھی، جس کے ارکان نے 1956ء کی عرب اسرائیل جنگ میں مصری و عرب فوج کے ساتھ رضاکارانہ طور پر اپنی خدمات انجام دیں تھی۔

یاسر عرفات انجنیئرنگ کے بعد ملازمت کرنا چاہتے تھے لیکن فلسطین کی آزادی کی خواہش ان کے اس سفر میں مانع رہی اور دنیاء کی فلسطین کی طرف بے توجہی انکی توجہ فلسطین کی باعث بنی۔ یاسر عرفات اور ان کے ساتھی صلاح خلف الوزیر نیز دیگر دوستوں نے گوریلا فوجی گروپ تشکیل دے کر اسرائیل کے ٹھکانوں پر حملہ شروع کر دیا۔ جس میں کامیابی نے ان کی شہرت کا ڈنکا مصر، شام، اردن کے ساتھ ساتھ عرب کے دیگر ممالک تک پہنچا دیا۔ جس کے نتیجہ میں نوجوانوں کا گروپ یاسر عرفات اور ان کی ٹیم کے ارد گرد جمع ہونے لگا۔ جنہوں نے بعد میں "الفتح" کی بنیاد رکھی۔ ساتھ ہی یاسر عرفات نے "Our Palestine" کے نام سے ایک رسالہ نکالا۔

یاسر عرفات فلسطین اسرائیل مسئلہ کی اصل حقیقت دنیاء کے سامنا لانا چاہتے تھے اس لئے انہوں نے مثالیت پسندی کو چھوڑ کر عملیت پسندی اختیار کرلی۔ جس کے بعد انہوں نے اسرائیل کو ایک ملک کی حیثیت سے تسلیم کر لیا۔ اور الفتح کے منشور سے اسرائیل کے وجود کو تباہ کرنے کی دفع کو نکال دیا گیا، نیز قدیم تاریخ فلسطین سے اپنا دعویٰ ساقط کر کے صرف 1967ء کے ماقبل کے علاقہ تک اپنا مطالبہ منظور

کرلیا۔ جس کے ضمن میں 1993ء میں اسرائیل فلسطین "اوسلو" معاہدہ عمل میں آیا۔ یاسر عرفات کو اپنے نظریات سے ہٹنے اور فلسطینی سیاست میں کمزور کرنے کے لئے اقوام متحدہ، امریکہ اور سوویت یونئن نے بہت کوششیں کیں۔

14.7.3 شیخ احمد یاسیٰن

شیخ احمد یاسیٰن 1938ء میں غزہ کے جنوب میں پیدا ہوئے۔ مخیم الشاطی سے تعلیم کا آغاز کیا، جہاں اخوان المسلمون کے طلبہ کے پروگراموں میں شمولیت کی۔ اسی دوران ورزش کرتے ہوئے آپ کو چوٹ آئی جس سے جسم پر فالج کا اثر ہوا اور آپ مزید تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ شیخ احمد پاس کے ایک گاؤں میں اسکول ٹیچر ہوگئے۔ جس کے ذریعہ نوجوان لڑکوں میں جہاد کی روح پھونک دی۔ آپ کی ہی قیادت میں فلسطین میں پہلا اور دوسرا انتفاضہ عمل میں آیا۔ نیز تحریک حماس بھی عمل میں آئی۔ آپ 2004 میں اسرائیل کی طرف سے داغے گئے میزائیل کے ذریعہ شہید کر دئے گئے۔

14.8 کیمپ ڈیوڈ معاہدہ

اسرائیل اور عرب ممالک کے درمیان ہونے والی جنگوں 1948، 1956 اور 1967 کے نتیجہ میں اسرائیل فلسطین کے زیادہ تر علاقوں پر قابض ہو گیا تھا، نیز اس نے فلسطین کے پڑوسی ممالک پر بھی اپنا قبضہ قائم کر لیا تھا جس میں خاص کر مصر کا علاقہ سینائی شامل تھا۔ اسرائیل نے 1967ء کی جنگ کے بعد مصر کے اس وسیع و عریض خطہ پر اپنا قبضہ جمالیا تھا۔ چہ جائے کہ 1973ء کی جنگ میں مصر نے اسرائیل پر حملے کئے اور اپنا وقار بچائے رکھنے کی کوشش کی لیکن وہ پھر بھی اسرائیل کے قبضہ میں شامل علاقے کو دوبارہ آزاد نہیں کرا سکا۔ اس شکل میں مصر پر اقوام متحدہ کی طرف سے دباؤ ڈالا جانے لگا تھا کہ وہ اسرائیل کو تسلیم کرلے نیز اس کے ساتھ سفارتی تعلقات بھی قائم کرلے تو اس کے بدلے میں سینائی کا علاقہ اسے واپس کر دیا جائے گا۔ مصر نے چونکہ دو جنگوں میں اپنی ناکامی دیکھ لی تھی اور اسے اپنی طاقت کا بھی اندازہ ہو گیا تھا اس لئے مصر نے اس تجویز کو قبول کر لیا لہٰذا 1979ء کو امریکہ کی سرپرستی میں مصر اور اسرائیل کے مابین "کیمپ ڈیوڈ" کے مقام پر ایک معاہدہ پر دستخط ہوئے جس کی نسبت سے اسے کیمپ ڈیوڈ معاہدہ کہا جاتا ہے۔ اس معاہدے کی رو سے مصر کو سینائی کا پورا علاقہ واپس تو مل گیا لیکن اس کا کھویا ہوا وقار واپس نہیں ملا۔ کیمپ ڈیوڈ معاہدہ دراصل اسرائیل کی بڑی سیاسی کامیابی تھی جس کے ذریعہ مسلم دنیاء کے ایک بڑے ملک نے اسرائیل کے وجود کو تسلیم کر لیا تھا جس سے نہ صرف اسرائیل کے وقار کو تقویت ملی بلکہ اس نے اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے عربوں کے اتحاد کو کالعدم کر دیا۔ اور پھر مصر کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اردن نے بھی اسرائیل کے وجود کو قبول کر لیا، جس کے بعد اسرائیل نے یروشلم کو اپنا مستقل پایہ تخت بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ جس کے ذریعہ اسرائیل نے پھر دوبارہ اقوام متحدہ کی کھلم کھلا خلاف ورزی کی لیکن پھر بھی اس مجلس کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ آج بھی ایسی ہی خلاف ورزیاں کر رہا ہے۔

14.9 اوسلو معاہدہ

اوسلو امن معاہدے کو اسرائیل فلسطین کے پینتالیس سالہ پرانے تنازعے کا تاریخی موڑ قرار دیا جاتا ہے۔ اوسلو دستاویز یاسر

عرفات کی قیادت میں فلسطین کی جلاوطن قومی کونسل اور اسرائیل کے درمیان ناروے کی مدد سے 1988 میں شروع ہونے والے مذاکرات کا نتیجہ تھی جو چھ برس جاری رہے۔ اوسلو معاہدے کے لیے مذاکرات شروع ہونے سے قبل الفتح کے بانی یاسر عرفات کی جلاوطن حکومت نے سنہ 1988 میں پر تشدد مزاحمت ترک کرکے اقوام متحدہ کی قرارداد نمبر 181 دیے گئے دوریاستی حل کو تسلیم اور اس تنازعے کے سیاسی حل پر آمادگی ظاہر کردی تھی اور بالآخر ناروے نے دونوں فریقین کے درمیان خفیہ مذاکرات کی پیشکش کی جس کے بعد جنوری 1993ء میں ناروے کے شہر اوسلو میں مذاکرات کا باقاعدہ آغاز ہوا یہ سلسلہ کئی ماہ تک جاری رہا جسے "اوسلو اکارڈ" کہا گیا۔ اس دوران بے شمار نشیب و فراز آئے لیکن تیرہ ستمبر 1993ء کو یاسر عرفات اور اسرائیلی وزیراعظم اسحاق (یہتزاک) رابن کے مابین ایک معاہدہ طے پایا۔ فلسطین، اسرائیل، امریکہ اور روس نے اس معاہدے پر دستخط کیے جسے "اوسلو ون" کہا گیا۔ متحارب فریقین کو قریب لانے میں امریکی صدر بل کلنٹن نے اہم کردار نبھایا۔ اقوام عالم نے اس معاہدے کا خیر مقدم کیا کیونکہ اس سے یہ امید پیدا ہوئی کہ اسرائیل مقبوضہ علاقے خالی کردے گا، فلسطینی باشندوں کو حق خودارادیت فراہم کرے گا اور خطے میں پچاس سال سے جاری جنگ و جدل پر لگام لگے گی اور پائیدار امن قائم ہو گا۔

اس معاہدے کے تحت یاسر عرفات نے اسرائیل کو بطور ریاست تسلیم کیا جبکہ اسرائیل نے پی ایل او کو فلسطینیوں کی نمائندہ جماعت تسلیم کرلیا۔ اوسلو معاہدے میں فلسطینی ریاست کے غیر واضح خدوخال طے کیے گئے جس کے پہلے مرحلے میں فلسطینیوں کی جانب سے تشدد ترک کیے جانے کی شرط پر 1967 کی جنگ میں قبضہ کیے جانے والے علاقوں سے اسرائیلی فوج کا انخلاء، ان علاقوں کا نظم و نسق چلانے کے لیے فلسطینی انتظامیہ کا قیام اور مقبوضہ فلسطینی علاقوں میں یہودی بستیوں کی تعمیر پر پابندی پر اتفاق ہوا۔ پانچ برس کی اعتماد سازی کے بعد دوسرے مرحلے میں فلسطینی ریاست کے ان انتظامات کے پانچ برس بعد فلسطینی ریاست کے حتمی سیاسی مستقبل پر مذاکرات اور فلسطینی ریاست کی حتمی سرحدوں کا تعین اور تیسرے مرحلے پر یروشلم کی حیثیت اور جلاوطن کیے جانے والے فلسطینیوں کی گھروں کو واپسی کے حق پر گفت و شنید ہونا طے پایا۔

اس معاہدے کے دو سال بعد ہی ستمبر 1995ء کو دونوں فریقین کے مابین مذاکرات ہوئے اور دوسرے معاہدے پر دستخط کیے گئے جسے "اوسلو ٹو" کہا گیا۔ اس معاہدے کے تحت اسرائیلی فورسز نے چھ بڑے شہروں اور چار سو سے زائد قصبوں سے انخلاء کا کہا، ساتھ ہی یہ بھی طے پایا کہ مغربی کنارے کو تین حصوں میں تقسیم کیا جائے گا۔

1. ایک حصہ پر فلسطین کا مکمل اختیار ہو گا۔
2. دوسرے علاقوں پر اسرائیل کی حکومت ہو گی۔
3. شہری علاقوں کا نظام فلسطین کے پاس ہو گا اور دیہی علاقوں کی سیکورٹی اسرائیلی فورسز سنبھالے گی۔

اوسلو معاہدے نے امن کی ایک امید قائم کی کہ دہائیوں پر محیط یہ تنازع ختم ہو جائے گا۔ لیکن دونوں جانب سے شدت پسند نظریات کے حامل افراد نے اس معاہدے کی مخالفت شروع کردی۔ اسرائیل میں دائیں بازو کے شدت پسند یہودیوں نے اوسلو معاہدہ کی سخت مخالفت کی۔ نومبر 1995ء کو ایک تقریب کے دوران اسرائیلی وزیراعظم اسحاق رابن نے اوسلو اکارڈ کے حق میں کھل کر بات کی تو

دائیں بازو کے انتہا پسند صیہونی ایگال عامر نے انھیں قتل کر دیا۔ انور سادات کے قتل کے بعد یہ دوسرا واقعہ تھا جس نے پوری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ دوسری جانب فلسطینی عوام نے بھی اس معاہدے کی مخالفت شروع کر دی۔ جس میں حماس اور چند دوسری جہادی تنظیموں نے حصہ لیا۔ یوں معاملات کشیدہ ہوتے گئے۔ نومبر 2004ء کو خبر نشر ہوئی کہ یاسر عرفات کو قتل کر دیا گیا ہے۔ انھوں نے پیرس کے ایک ہسپتال میں وفات پائی ان کی اہلیہ نے دعویٰ کیا تھا کہ یاسر عرفات کو زہر دے کر قتل کیا گیا تھا۔

سوال یہ ہے کہ اوسلو معاہدہ امن کی ضمانت کیوں نہیں بن پایا۔ اس معاہدے میں اسرائیل نے اپنی سلامتی کو فلسطینی ریاست کے قیام سے مشروط کر دیا جبکہ دراصل امن کا راستہ فلسطینی ریاست سے شروع ہوتا کہ فلسطینیوں کے لیے ریاست کا قیام سلامتی کی ضمانت بن سکتا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ متاثرہ فریق یعنی فلسطینیوں کو اس بظاہر امن دستاویز میں نہ تو اپنی منزل واضح دکھائی دے رہی تھی کہ مستقبل میں بننے والی فلسطینی ریاست کے خدو خال کیا ہوں گے اور نہ اس تک پہنچنے کا راستہ چنانچہ اعتدال پسند فلسطینیوں، خود کش حملہ آوروں اور مزاحمتی عناصر کو اوسلو معاہدے پر آمادہ کرنے کے لیے کوئی ٹھوس بنیاد نہیں تھی۔ اوسلو معاہدے کے پورے دس برس بعد سنہ 2003 میں امریکہ، یورپی یونین اور روس کا حمایت یافتہ ایک اور امن منصوبہ روڈمیپ یعنی نقشہ راہ کی صورت میں سامنے لایا گیا۔ نقشہ راہ میں ایک بار پھر اوسلو معاہدے والی ناکام حکمت عملی دہرائی گئی۔ بظاہر امن کی دستاویز میں اسرائیل فلسطینیوں کے کچھ مقبوضہ علاقوں سے نہ تو فلسطینی ریاست کا واضح نقشہ سامنے رکھا گیا نہ اس کی سرحدوں کا تعین۔ نہ یروشلم کی مستقبل میں سیاسی حیثیت کا ذکر اور نہ ہی بے گھر فلسطینیوں کی واپسی کا کوئی تذکرہ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ امن منصوبے کی تکمیل یعنی فلسطینی ریاست کی تکمیل کے لیے کسی اوقات کار کا تعین نہیں کیا گیا۔ نقشہ راہ فلسطینیوں کے لیے ایک کاغذ کے ٹکڑے سے زیادہ ثابت نہ ہو سکا۔ یہاں تک کہ سنہ 2004 میں چالیس برسوں سے آزاد فلسطینی ریاست کا خواب دیکھنے والی یاسر عرفات کی آنکھیں ہمشہ کے لیے بند ہو گیں۔ الفتح میں قیادت کے فقدان کے باعث اعتدال پسندوں کا کنٹرول رفتہ رفتہ کم اور مغربی طاقتوں کی کوششوں کے باوجود حماس کا کنٹرول مستحکم ہوتا رہا۔

14.10 انسانی حقوق اور فلسطین

انٹرنیشنل ہیومن رائٹ ڈکلیریشن 1948ء کے مطابق حق زندگی، حق آزادی، حق امن وامان، حق مالکیت وغیرہ تسلیم شدہ حقوق ہیں۔ اسی طرح 1949ء کے جنیوا کنونشن کے مطابق جنگ کے دوران نہتے اور غیر مسلح افراد کی حفاظت اور ان کے حقوق کی پاسداری قابض حکومت کی اولین ذمہ داری ہے۔ جینوا کنونشن کے معاہدے کے آرٹیکل 27 کے تحت ہر قسم کی شرایط میں نہتے اور غیر مسلح افراد اپنی شخصیت، حرمت، مذہب اور رسم و رواج کے عنوان سے آزاد ہوں گے، اسی معاہدے کے آرٹیکل 49، 33، 32 اور 53 بالترتیب بے گناہوں کو سزا دینے، دہشتگردی، غارتگری، دست جمعی سزا دینے، نقل مکانی پر مجبور کرنے، منقول یا غیر منقول جائیداد کو منہدم کرنے سے روکتے ہیں۔

ان سب قوانین کے باوجود 1948ء سے لے کر آج تک اسرائیل کی غاصب حکومت نے بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی کو اپنا

وطیرہ بنائے رکھا ہے، جس سے دو باتیں سامنے آتی ہیں، ایک یہ کہ اسرائیل کو ایک ایسی لابی چلا رہی ہے، جس کی سرشت میں قوانین و اصولوں کی خلاف ورزی شامل ہے، دوسرا یہ کہ عالمی قوانین بنانے والے ادارے اتنے کمزور اور ناتوان ہیں کہ اپنے بنائے ہوئے قوانین پر عمل درآمد کروانے سے قاصر ہیں۔ اگر ہم یہ کہیں کہ بین الاقوامی قانون بنانے اور ان پر ناظر ادارے اپنے بنائے ہوئے قوانین پر عمل درآمد کی طاقت نہیں رکھتے تو یہ پہلو بھی ذہن میں رکھنا پڑے گا کہ یہی ادارے دنیا میں بہت سارے مقامات پر ہونے والی انسانی حقوق کی پائمالی پر فوراً نوٹس بھی لیتے ہیں، قانون بھی بناتے ہیں اور پھر ان پر عمل بھی کراتے ہیں۔

ٹوکیو اور نورمبرگ کی عدالتوں کے بنانے اور سزائیں دینے سے لے کر یوگوسلاویہ، روانڈا، مشرقی تیمور، دارفور (سوڈان) اور دوسرے بہت سارے مسائل میں فوراً عدالتیں اور ٹربیونل تشکیل پاتے ہیں اور کام بھی شروع کر دیتے ہیں۔ 14 فروری 2005ء کو لبنان کے سابق وزیر اعظم رفیق حریری کے قتل پر اقوام متحدہ کی قرارداد نمبر 1759 کے ذریعے فوراً بین الاقوامی عدالت تشکیل دے دی جاتی ہے مگر 1948ء کے فلسطین پر ناجائز قبضے، 1967ء کی ہمسایہ ممالک پر فوجی چڑھائی، 1982ء کی نسل کشی، 2007ء کے محاصرہ، اور 2012ء کے یکطرفہ حملے، اور اب طوفان الاقصیٰ پر کوئی عالمی ادارہ حرکت میں نہیں آتا۔ ایسے میں یہ کہنے پر بڑا افسوس ہوتا ہے کہ عالمی ادارے جن کے نرغے میں ہیں، ان کے مفادات دنیا میں امن و آتشی و صلح کی بجائے قتل و غارت گری اور تباہی و بربادی میں پوشیدہ ہیں۔

اقوام متحدہ کی قراردادوں اور عالمی انسانی حقوق کی پابندی ہر رکن ملک کا اولین فریضہ ہے، مگر اس کے ساتھ ہر رکن ملک پابند ہے کہ وہ عالمی قوانین کی خلاف ورزی پر اپنی طرف سے اقدام کرے، جن ممالک نے اسرائیل کے ان خلاف قانون اور ظالمانہ اقدام پر سکوت اختیار کیا ہے، دراصل ان کا یہ سکوت جینوا کنونشن کی قراردادوں اور اقوام متحدہ کے منشور کی خلاف ورزی کے مترادف ہے۔ اگر کوئی ایک ملک بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی کرتا ہے تو دوسرے ممالک کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ عالمی برادری کو ساتھ ملا کر ان قوانین کی خلاف ورزی کا راستہ روکیں۔

اب اگر ذرا غور کریں تو معلوم ہو گا کہ مسلمان ممالک نے خصوصاً عرب ممالک نے، جو سب عالمی قوانین اور معاہدوں کا حصہ بھی ہیں اور مسلمان ہونے کے ناطے فلسطین کے مظلوم عوام کے قرابت دار بھی ہیں، اس سلسلے میں کیا کیا ہے؟ مصر ہی کو دیکھ لیں 2007ء میں اسرائیل کی طرف سے غزہ کے محاصرے کے دوران غزہ جانے والی تنہا گذرگاہ رفح کو بند کر دیتے ہیں اور فلسطینیوں کی بھوک و اشیا خورد و نوش کی قلت سے اجتماعی نسل کشی میں غاصب حکومت کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔

اسلامی سربراہی کانفرنس کہ صرف اور صرف فلسطین کے ایشو پر وجود میں آئی تھی، دنیا کے 57 ملکوں کی نمائندگی کے باوجود اس سلسلے میں کسی قسم کا موثر قدم اٹھانے سے قاصر ہے۔ ان سب قوانین و مقررات کے ساتھ ساتھ اسرائیل اقوام متحدہ اور عالمی برادری کا رکن ہونے کی وجہ سے نسل کشی اور جنگی جرائم کے اپنے فوجی اور سیاسی مجرموں کو اپنی داخلی عدالتوں میں سزا دینے کا پابند ہے، مگر قاتل سے انصاف کی توقع ایک عبث خیال کے علاوہ کچھ نہیں، کیونکہ بحث عالمی قوانین کے عنوان سے تھی، لہذا اس کا ذکر بھی کر دیا، لیکن تعجب ہے اسرائیلی حکومت کے عالمی قوانین کی دھجیاں اڑانے پر کہ جس کی عدالتیں ایک جھوٹے افسانے ہولوکاسٹ کے انکار پر تو مقدمہ درج بھی

کرتی ہیں، سماعت بھی ہوتی ہے اور اس افسانے کا منکر سزا بھی پاتا ہے، مگر فلسطین کے مہاجر کیمپوں میں بچوں اور خواتین کے قتل پر ان کے کسی فوجی یا سیاست دان کو کٹھرے میں نہیں لایا جاتا۔

14.10.1 عالمی فوجداری عدالت اور مسئلۂ فلسطین

عالمی فوجداری عدالت بھی اپنے 1997ء میں پاس ہونے والے منشور کے خلاف کہ جس کے تحت صرف جنگی جرائم، نسل کشی اور انسانیت کے خلاف جرائم ہی اس عدالت کے دائرہ کار میں شامل ہیں، فلسطین میں ہونے والے ان جرائم پر مناسب اقدام کرنے سے قاصر ہے، عالمی فوجداری عدالت کے منشور کے آرٹیکل 12 اور 13 کے مطابق اس عدالت میں تین طریقوں سے سماعت شروع ہو سکتی ہے۔

پہلی صورت یہ کہ نسل کشی، جنگی جرائم یا انسانیت کے خلاف جرائم میں سے کوئی ایک جرم اس عدالت کے رکن ممالک کی سرزمین پر یا اس اس عدالت کے رکن ممالک کے شہریوں کی طرف سے انجام پائے، اس وقت 121 ممالک اس فوجداری عدالت کے رکن ہیں۔ دوسری صورت یہ کہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل دنیا میں کسی جگہ ہونے والے مذکورہ تین میں سے کسی جرم کی شکایت کرے تو عالمی فوجداری عدالت اس مسئلے کی سماعت کر سکتی ہے، اس میں اس سرزمین یا ملک کا اس عدالت کا باقاعدہ رکن ہونا ضروری نہیں۔

اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے اب تک فلسطین میں ہونے والے جنگی جرائم، فلسطینیوں کی نسل کشی اور انسانیت کے خلاف جرائم میں سے کسی جرم کی بھی عالمی فوجداری عدالت میں شکایت نہیں کی، جبکہ اسی سلامتی کونسل نے اپنی قرارداد نمبر 1593 کے ذریعے دارفور (سوڈان) کی صورت حال اور اس ملک میں ہونے والے جنگی جرائم کی عالمی فوجداری عدالت میں شکایت کی، جس پر اس عدالت نے فوراً نوٹس لیا اور ان جرائم میں ملوث افراد کو سزا بھی دی۔

تیسری صورت کسی بھی ملک کی طرف سے اپنی سرزمین پر مذکورہ بالا تین جرائم میں سے کسی بھی جرم کے ارتکاب کی شکایت ہے کہ عالمی فوجداری عدالت اس شکایت پر سماعت شروع کر سکتی ہے۔ اس صورت میں بھی عالمی فوجداری عدالت کا باقاعدہ رکن ہونا ضروری نہیں ہے۔ 21 جنوری 2009ء کو عالمی فوجداری عدالت کے منشور کے آرٹیکل 12 کی بنیاد پر فلسطین کے اس وقت کے وزیر قانون کی طرف سے اس عدالت میں غزہ میں ہونے والے اسرائیلی جنگی جرائم اور فلسطینیوں کی نسل کشی کی باقاعدہ شکایت دائر کی گئی، جسے اس عالمی عدالت نے یہ کہہ کر رد کر دیا کہ فلسطین عالمی فوجداری عدالت کا باقاعدہ رکن نہیں ہے، لہٰذا یہ عدالت اس سرزمین میں ہونے والے جرائم کی سماعت کا حق نہیں رکھتی، جبکہ اس عدالت کے منشور کے آرٹیکل 12 اور 13 اسے غیر رکن ممالک کی شکایت پر بھی سماعت کا پابند بناتے ہیں۔ یوں اس عالمی ادارہ نے بھی ایک کمزور قانونی عذر پیش کر کے اس خطے میں ہونے والے عظیم انسانی سانحہ سے چشم پوشی کر لی۔

14.11 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- قیام اسرائیل میں برطانیہ کا کیا کردار رہا۔ اور اسرائیل نے فلسطین میں اپنی حکومت کے قیام کے بعد پر تشدد حالات پیدا کئے جس

کے نتیجہ میں مزاحمت کا دور شروع ہوا۔

- یورپ سے یہودیوں کی فلسطین کی طرف ہجرت میں فرانس اور برطانیہ نے مل کر پلان بنایا، کیوں کہ وہ یورپ سے یہودیوں کا انخلا چاہتے تھے۔
- فلسطین کی آزادی کے لئے 1948ء سے لیکر 1993ء تک متعدد تحریکیں شروع ہوئیں جن میں پی ایل او، اور حماس سر فہرست ہیں۔
- اسرائیل کا قیام 20ویں صدی کے سیاسی، مذہبی، اور معاشرتی حالات نیز صیہونی تحریک کا نتیجہ تھا۔ یہ قیام فلسطینیوں اور عرب دنیا کے لیے ایک بڑا سانحہ ثابت ہوا اور اس کے بعد سے مشرق وسطیٰ میں امن کی کوششیں جاری ہیں۔

14.12 نمونہ امتحانی سوالات

14.12.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. وہ کون سا معاہدہ ہے جس میں برطانیہ نے یہودیوں کو فلسطین میں سکونت اختیار کرانے کا وعدہ کیا؟

(a). سائکس پیکوٹ (b). اوسلو اکارڈ (c). کیمپ ڈیوڈ (d). بالفور ڈکلیریشن

2. میکڈونالڈ قرطاس کس سن عیسوی میں جاری کیا گیا؟

(a). 1919ء (b). 1917ء (c). 1939ء (d). 1941ء

3. یاسر عرفات کس تنظیم کے سربراہ تھے؟

(a). پی ایل او (b). حماس (c). حزب اللہ (d). تحریک قدس

4. کیمپ ڈیوڈ معاہدہ کن ممالک کے درمیان طے ہوا تھا؟

(a). اردن اور فلسطین (b). مصر اور اسرائیل (c). مصر اور اردن (d). مصر اور شام

5. اوسلو معاہدہ کب طے ہوا؟

(a). 1991ء (b). 1993ء (c). 1996ء (d). 1988ء

6. سرزمین فلسطین پر اسرائیل کا قیام کس سن عیسوی میں عمل میں آیا؟

(a). 1947ء (b). 11949ء (c). 1939ء (d). 1948ء

7. تقسیم فلسطین میں فلسطین کو کل رقبہ کا کتنا فیصد حصہ ملا؟

(a).43فیصد (b).56فیصد (b).41فیصد (d).سب غلط

8. اسرائیل کی اقوام متحدہ میں شمولیت کب ہوئی؟

(a).1947ء (b).1948ء (c).1949ء (d).1993ء

9. حرکتہ المقاومۃ الاسلامیہ کی بنیاد کس سن عیسوی میں ڈالی گئی؟

(a).1956ء (b).1987ء (c).1993ء (d).1973ء

10. انتداب کے معنیٰ ہیں؟

(a).تسلط قائم کرنا (b).قبضہ کرنا (c).دونوں (d).دونوں غلط

14.12.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. بالفور معاہدے پر تبصرہ کیجیے۔
2. فلسطین مین اسرائیلی حکومت کے قیام پر روشنی ڈالیے۔
3. کیمپ ڈیوڈ معاہدے پر مضمون تحریر کیجیے۔
4. اوسلو معاہدہ فلسطینیوں کے نظر میں، جائزہ لیجیے۔
5. قیام اسرائیل مین برطانیہ اور امریکہ کا کیا کردار رہا؟ بیان کیجیے۔

14.12.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. فلسطین اور انسانی حقوق پر مضمون قلم بند کیجیے۔
2. فلسطینی مزاحمت اور تنظیمات پر مضمون لکھیے۔
3. تقسیم فلسطین پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔

14.13 تجویز کردہ اکتسابی مواد

.1	انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر	:	مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، مکتبہ اسلامیہ، لکھنؤ، 1973ء
.2	فلسطین اور بین الاقوامی سیاست	:	پروفیسر سید حبیب الحق ندوی، کراچی، 1976ء
.3	فلسطین اور مسئلہ یہود	:	محمود بریلوی، مطبع انوار احمدی، الہ آباد۔
.4	نئی عرب دنیا	:	محمد یونس نگرامی ندوی، لکھنؤ، 1985ء
.5	مسئلہ فلسطین	:	ایڈورڈ سعید، ایفابراؤ پبلیشرز، لاہور، 1991ء
.6	بلاد فلسطین وشام	:	جی لی اسٹرنج، جامعہ عثمانیہ، سرکار عالی حیدرآباد، 1932ء